چند قدم گھر سے......

(سفر نامۂ پاکستان)

(نظرِ ثانی شدہ)

انجینئر محمد سمیع الدین (علیگ)

تعارف

☆ نام : محمد سمیع الدین

☆ سنہ پیدائش : ۱۹۴۰ء

☆ وطنِ مالوف : موضع حبیب والا (بجنور)

☆ تعلیم : B.Sc. Engg. (Civil)

☆ مشغلہ : سرکاری اعلیٰ عہدہ سے سبکدوش ہو جانے کے بعد سے تصوف، اسلامیات، نیز اردو ادب پر تحقیقاتی کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ کئی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔

☆ پتہ : بلقیس ولا، حبیب باغ، بھولہ اسٹریٹ، علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

☆ موبائل : 9759318584

چند قدم گھر سے..........!

[سفر نامۂ پاکستان]

[نظرِ ثانی شدہ]

"سمجھوتہ ایکسپریس" جو ۱۹ر فروری ۲۰۰۷ء کی علی الصبح پانی پت [ہندوستان] کے قریب واقع دیوانہ ریلوے اسٹیشن پر ایک انسانیت کی دشمن اور شیطانیت کی علمبردار تنظیم کی بربریت جس میں ۶۸ بے گناہ مسافر اور حفاظتی عملے کے افراد شہید اور سینکڑوں زخمی ہوئے، کا شکار ہوئی۔

انجینیر محمد سمیع الدین
(علیگ)

[جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں۔]

☆ نام کتاب : "چند قدم گھر سے......!" (نظرِ ثانی شدہ)

☆ نام مصنف : انجینیر محمد سمیع الدین (علیگ)
موبائل نمبر۔ 9759318584-91+
9808179281-91+

☆ سنہ اشاعت :
(اوّل بار) ۲۰۰۱ء
(نظرِ ثانی شدہ) ۲۰۰۹ء

☆ تعداد اشاعت :
(اوّل بار) ۱۰۰۰
(نظرِ ثانی شدہ) ۲۰۰

☆ ناشر (باراوّل) : عاکف بک ڈپو
۳۲۴۳۔ کوچہ تاراچند، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۲

(نظرِ ثانی شدہ) : "مرکزِ حبیب برائے تحقیق وتصنیف"
بلقیس وِلا، حبیب باغ، بھمولہ اسٹریٹ،
علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

☆ کمپیوٹر کتابت : طیّب حسین،
(نظرِ ثانی شدہ) پنڈت جی کا احاطہ، بھمولہ، علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

☆ طابع : بھارت آفسیٹ پریس
۲۰۳۵، قاسم جان اسٹریٹ، بلی ماران، دہلی

☆ قیمت : تین سو پچاس روپیہ

☆ ملنے کا پتہ : انجینیر محمد سمیع الدین
۴/۱۰۔ حبیب باغ، بھمولہ اسٹریٹ
علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصنف (محمد سمیع الدین)

ماضی کے جھرونکوں سے ، حال کے ائینہ تک

اے عشق ! مل سکیں گے نہ ہم جیسے سر پھرے
برسوں چراغ لے کے زمانہ اگر پھرے
(کلیم عاجز)

۱۹۵۸ء

۱۹۸۴ء
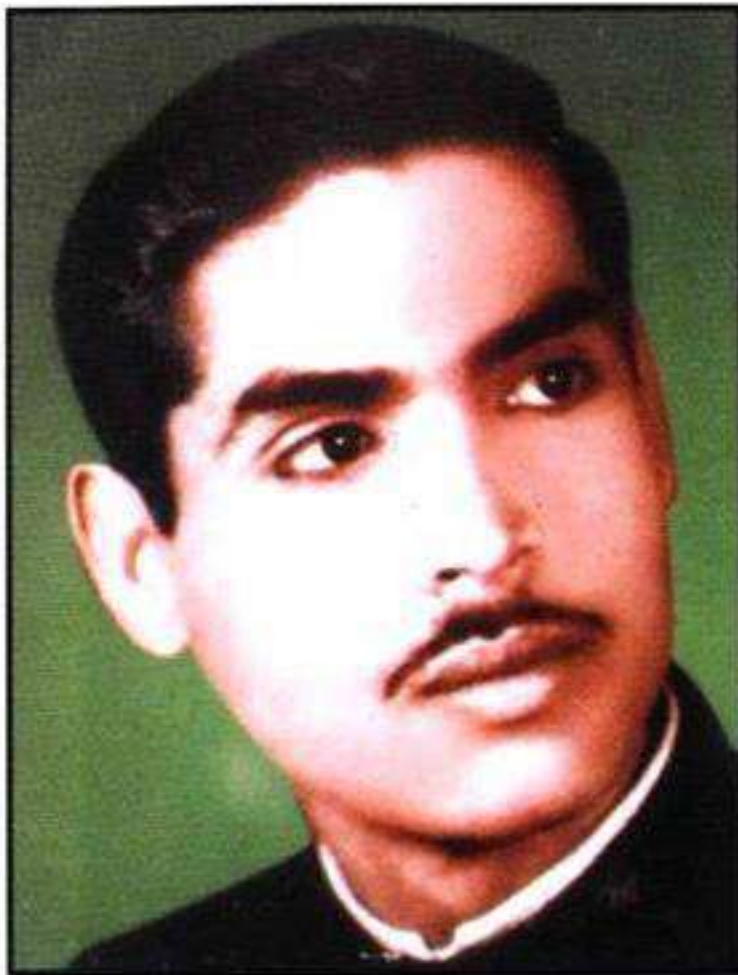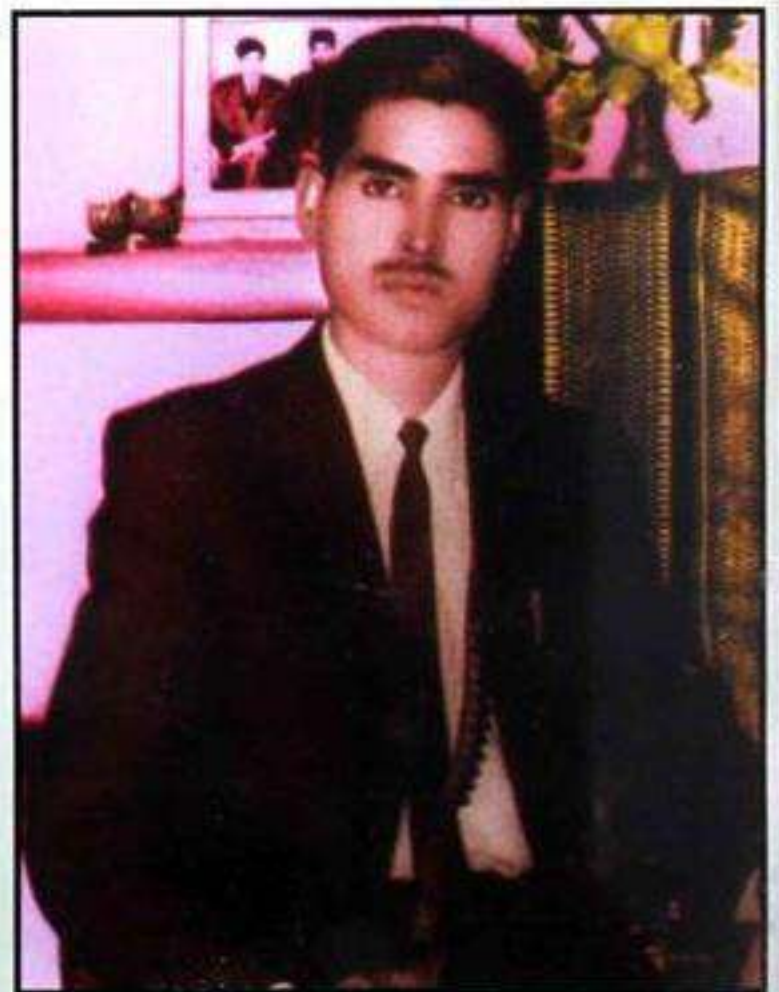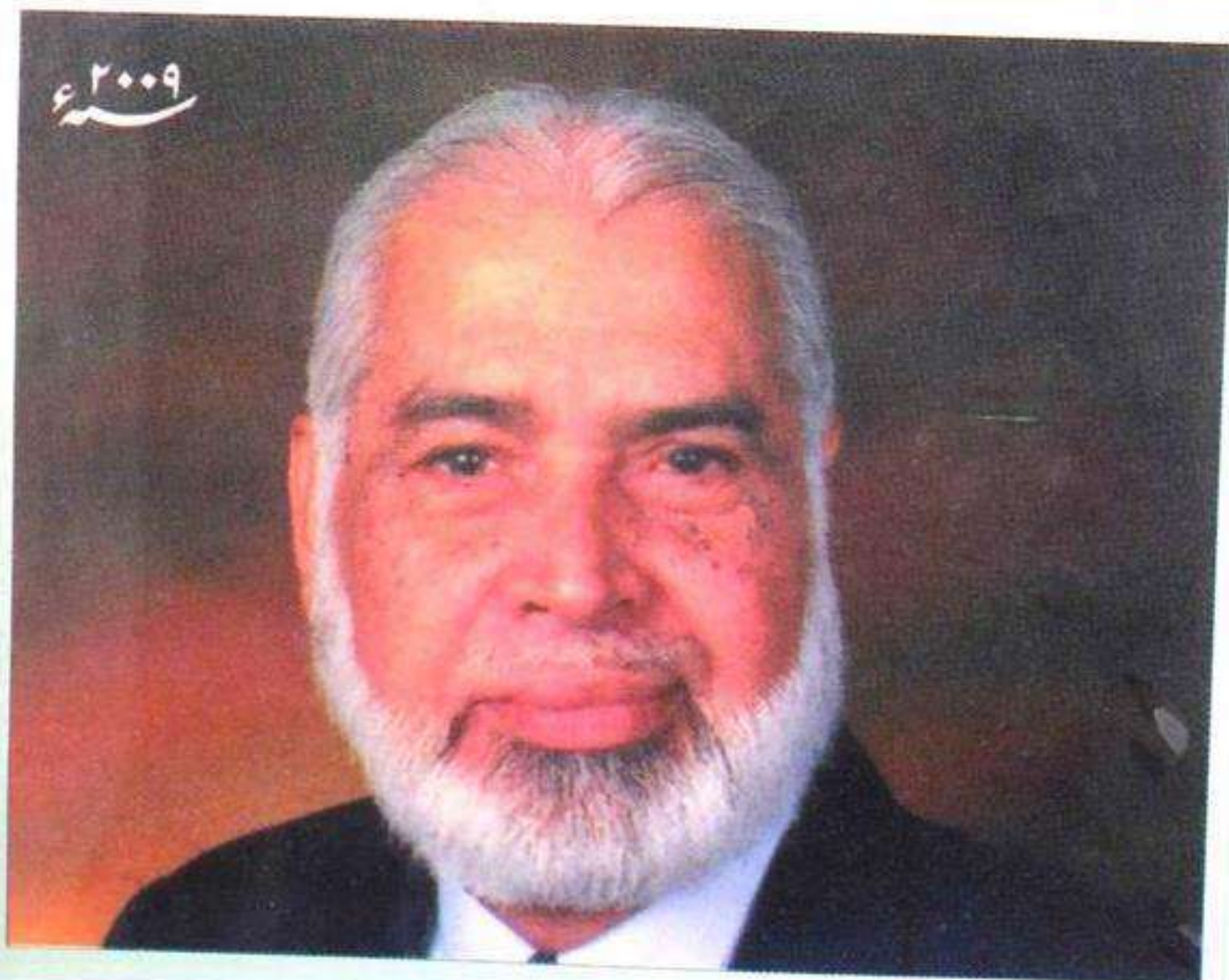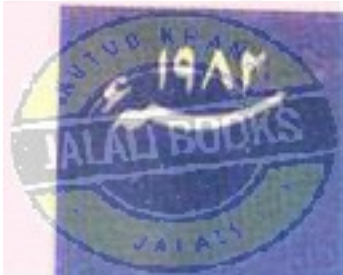
سرحدوں کے دونوں جانب آباد

اُس نوجوان نسل کے نام

جو جذبۂ خیر سگالی سے سرشار ہے۔

فہرست

باب اوّل

"خیال اپنا اپنا......!!"

[۱] انھوں نے فرمایا......!

''پاکستان کی نئی مملکت اب ایک حقیقت ہے۔ لہٰذا اب یہ ہندوستان اور پاکستان، دونوں کے حق میں ہے کہ وہ باہم دوستانہ تعلقات قائم اور آپس میں تعاون کریں، نہیں تو اور زیادہ پریشانیاں، الجھنیں اور مصیبتیں ہوں گی۔''

فیروز بخت عرف محی الدین احمدؒ

المعروف بہ **مولانا ابوالکلام آزاد**

[''انڈیا وِنس فریڈم'' صفحہ ۲۴۸]

کسی نے ایک دن مجلس میں شیخ الاسلام حضرت **مولانا حسین احمد مدنیؒ** سے پوچھا ''حضرت! پاکستان کے لئے اب آپ کا کیا خیال ہے؟'' تو انھوں نے حسب معمول سنجیدگی اور بشاشت سے فرمایا ''مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے۔''

[روزنامہ ''الجمعیۃ'' (شیخ الاسلام نمبر) فروری ۱۹۵۸ء، صفحہ ۱۳۶]

''ہم آخیر تک تقسیمِ وطن کے خلاف رہے لیکن جب کہ پاکستان ایک ملک بن گیا ہے تو ہم بھی کہتے ہیں کہ پاکستان والے اپنے ملک میں خوش رہیں۔''

مجاہدِ ملّت حضرت **مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ**

[روزنامہ ''الجمعیۃ'' (مجاہدِ ملّت نمبر) ۱۹۶۲ء، صفحہ ۲۴۱]

[۲] وہ فرماتے ہیں.......!!

[تعارف مصنّف]

حضرت ابوایوب انصاریؓ جن کو رسولِ مقبول ﷺ کی میزبانی کا شرف حاصل ہے، ایک بلند مرتبہ صحابیؓ تھے۔ ان کے صاحبزادے، حضرت ابو منصور تابعیؒ عہدِ عثمانی میں بسلسلۂ جہاد خراسان تشریف لائے اور ہرات میں مقیم ہوگئے۔ حضرت ابو منصورؒ کی آٹھویں پشت سے شیخ الاسلام حضرت عبداللہ انصاری ہرویؒ ۳۹۶ھ (۱۰۰۵ء) میں ہرات میں پیدا ہوئے۔ آپ زہد وتقویٰ اور علم وفضل میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ نے پچاسی سال کی عمر میں ۴۸۱ھ (۱۰۸۸ء) میں وفات پائی۔ آپ کا مزارِ مبارک آج بھی بلادِ ہرات میں مرجعِ خلائق ہے۔ شیخ الاسلام حضرت عبداللہ انصاری ہروی کے پڑپوتے، خواجہ جلال الدینؒ، سلطان شہاب الدین محمد غوری کے عہدِ حکومت [۱۲۰۲ء تا ۱۲۰۶ء] میں بسلسلۂ تبلیغ دینِ متین ہند میں وارد ہو کر علاقہ نیمسار۔ مسرکھ (ضلع سیتاپور) میں قیام پذیر ہوئے۔

خواجہ جلال الدینؒ کی دسویں پشت سے ایک نہایت ہی برگزیدہ شخصیت، شیخ خان علیہ الرحمۃ ہوئے۔ آپ شب و روز دریائے معرفت میں اس قدر مستغرق رہتے تھے کہ ہفتہ بھر میں کبھی ایسی حالت بھی پیش آتی کہ آپ کو اپنی مطلق بھی خبر نہ رہتی۔ "منقبتِ سلطانی" سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت ایک بیمار بچے کو لے کر آپ کے حضور حاضر ہوئی۔ آپ کلام پاک کی تلاوت میں مشغول تھے۔ بعد فراغت آپ نے اس عورت سے وجہ آمد معلوم کر کے بچے کے چہرے سے چادر ہٹانے کو کہا۔ پردہ ہٹایا تو دیکھا کہ بچہ مردہ تھا۔ وہ عورت بین کر کے زار و قطار رونے لگی اور شیخ کے سر ہوگئی کہ وہ تو بچہ زندہ لائی

تھی اب مردہ کیسے لے کر جائے؟۔آپ نے ہر چند عورت کو سمجھایا لیکن جب وہ نہ مانی تو حکم دیا کہ بچے کا منہ دوبارہ کپڑے سے ڈھانپ دو۔اس کے بعد آپ نے کچھ پڑھ کر بچے پر دم کیا۔بچہ حکمِ ربّی سے دوبارہ زندہ ہوگیا۔

اپنے وصال سے آٹھ روز قبل آپ نے اپنے پوتے، شیخ عبدالحمیدؒ کو چند نصیحتیں فرماتے ہوئے اپنے مزار شریف کی جگہ دکھائی اور اپنی تاریخ وفات سے بھی آگاہ فرمایا۔ اس کے بعد ایک ہفتے صاحبِ فراش رہ کر ہردم یادِ خدا میں مصروف رہے۔ بروز چہارشنبہ اپنی بہو (اہلیہ شیخ حبیب اللہؒ) سے دریافت فرمایا کہ آج کون دن ہے؟۔انہوں نے بتایا کہ چہارشنبہ۔منہ پھیر کر آپ کسی قدر ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ کب تک انتظار کروں، جمعہ کے روز شربتِ وصال پینے کا وعدہ ہے۔ چنانچہ بروز جمعہ، قبل نماز، نہم شہر ربیع الاوّل ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) حضرت ذوالجلال سے وصالِ لایزال حاصل کیا۔آپ کی وصیّت کے مطابق قصبہ چاندپور (ضلع بجنور) کے پاس موضع سیاؤ میں آپ کو دفن کیا گیا۔

حضرت شیخ خانؒ کے صاحبزادے، حضرت شیخ حبیب اللہؒ بھی ایک صاحبِ کرامات، ولی صفت اور برگزیدہ شخصیت تھے۔آپ کا بچپن ہی سے ریاضت کا یہ عالم تھا کہ سخت سردیوں میں بھی رات کو بیس بیس بار وضو فرماتے اور ہر بار تحیۃ الوضو ادا کرتے۔ گرمیوں میں کئی کئی ہفتے لگاتار نفل روزے رکھتے۔آپ کو حالتِ نماز میں بھی جب ولولۂ الٰہی کا غلبہ ہوتا تو رقص کرنے لگتے۔مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے نورتنوں میں سے شیخ فیضی اور شیخ ابوالفضل آپ کے بہت معتقد تھے۔"منقبتِ سلطانی" سے نقل ہے کہ ایک بار ابوالفضل کے صاحبزادے، شیخ عبدالرحمٰن، شیخ حبیب اللہ علیہ الرحمۃ کو اپنے گھر لاہور لے گئے۔شیخ عبدالرحمٰن کے کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔شیخ عبدالرحمٰن نے شیخ حبیب اللہؒ کی خدمت میں دو آم نذر کیے۔شیخ نے اُن میں سے ایک آم عبدالرحمٰن کی زوجہ جو خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ کی نسل سے تھیں، کو دیا اور دوسرے آم میں سے آدھا خود کھا کر باقی عبدالرحمٰن کو دے

دیا اور اپنی زبانِ معجز بیان سے فرمایا کہ اس کو کھاؤ تمھارے اولادِ نرینہ پیدا ہوگی۔ چنانچہ حضرت کی دُعاؤں کے طفیل اور خدا کی رحمت سے ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) (۳/ذیقعدہ بروز جمعہ) میں عبدالرحمن کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام اکبر نے پشوتن رکھا۔ بیاسی سال کی عمر میں بروز نواز دہم جمادی الآخر ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) کو شیخ حبیب اللہ نے وصال فرمایا۔

آپ کے وصال کے فوراً بعد غیب سے ''شیخ حبیب اللہ ولی'' کی صدا آئی۔ اس حساب سے بھی آپ کی وفات سن ہجری ۱۰۴۴ھ نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے صاحبزادے، شیخ عبدالحمیدؒ جو خود بھی ایک جید عالم اور کامل بزرگ تھے، نے عربی میں آپ کی تاریخِ وفات قلم بند کی جو اس طرح سے ہے:۔

''قدرحل الشیخ محبوب القلوب	ھو حبیب اللّٰہ محی السنّۃ
کان تاریخ الوصال الربہ	ھو حبیبی و ابشر و ابالجنّۃ''

۱۰۴۴ھ

آپ اپنے والد، شیخ خان علیہ الرحمۃ کے پہلو میں مدفون ہیں۔ آپ ہی کے نام پر یہ علاقہ ''سرائے شیخ حبیب'' کہلاتا ہے۔ آپ کا مقبرہ ایک بلند مقام پر لکھوری اینٹوں اور بلاک کنکر کا بنا ہوا اور مرجعِ خلائق ہے۔

بجنور کے قصبہ دھامپور سے تقریباً پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر، شمال۔ مغرب کی جانب ایک گھنا جنگل تھا جس میں کافی تعداد میں شیر اور دیگر متعدد جنگلی جانور رہا کرتے تھے۔ اس جنگل سے انسان کا گزرنا ممکن تھا۔ شیخ حبیب اللہ علیہ الرحمۃ نے یہاں قیام فرما کر ریاضت فرمائی۔ وضو کے واسطے جب شیخ کو پانی کی حاجت ہوئی تو حکمِ ربّی سے فوراً ایک چشمہ جاری ہوا جس نے بعد میں ایک ندی کی شکل اختیار کر لی اور یہ ندی، پاؤں دھوئی کہلائی۔ یہیں شیخ نے ایک بلند مقام پر ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں ایک بستی کی بنیاد

رکھی جس کا نام حبیب والا رکھا۔ حروف تہجی کے اعتبار سے بھی ''موضع حبیب والا (ولی)''
سے سنِ بنیاد نکلتی ہے۔ یہاں شیخ کی اولاد آباد ہوئی۔ ۱۰۲۲ھ

حضورِ مقبول ﷺ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے لیے علم کی دُعا کی تھی اس لیے ان کی اولاد میں علمی خصوصیات ہمیشہ سے پائی جاتی رہی ہیں۔ چنانچہ قصبہ حبیب والا میں بھی علماء، فضلاء، ادیبوں، دانشوروں، شعراء اور فقراء کی کسی دور میں کمی نہیں رہی لیکن یہ لوگ نام ونمود سے بے نیاز، گوشہ نشینی کی فقیرانہ زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔ اسی لیے دنیا اِن کے کارناموں سے واقف نہ ہوسکی۔ قصبہ حبیب والا قدیم ہی سے ایک مردم خیز بستی رہی ہے۔ اس بستی کی تاریخ سے واقفیت رکھنے والے اہلِ نظر اس کو بجنور کا خطۂ یونان کہتے ہیں۔ یہاں قدیم ہی سے صد فی صد آبادی تعلیم یافتہ رہی ہے۔ یہاں مغربی اور مشرقی دونوں تہذیبوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے جس کی وجہ یہاں کے عوام کی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند سے قریبی وابستگی رہی ہے۔ ملک کے دو ٹکڑے ہوجانے اور نئی مملکتِ پاکستان کے بن جانے سے یوپی کا شاید ہی کوئی ایسا مسلم خاندان یا آبادی رہی ہوگی جو اس سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ اس بستی اور اس کے ساکنان پر بھی اس کا اثر ہوا۔ آج بھی بستی کے کھنڈرات اس کے گواہ ہیں۔

اس درویش خاندان اور مردم خیز بستی میں غالباً ۷ ارستمبر ۱۹۴۰ء کو جناب محمد سمیع الدین کا جنم ہوا۔ آپ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی بتیسویں پشت سے ہیں۔ کمسنی میں ہی آپ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے تھے۔ آپ کی پرورش آپ کے بڑے بھائیوں نے نہایت شفقتِ پدرانہ کے ساتھ کی اور اس طرح دولتِ پدری سے محروم ہونے پر بھی آپ شفقتِ پدری سے مالا مال رہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ صوم وصلوٰۃ کی پابند ایک ولی صفت خاتون تھیں جنھوں نے اپنی تمام اولاد کو اس خوبصورتی سے پرورش کیا اور تربیت دی کہ دینی اور دنیاوی، دونوں اعتبار سے وہ باصلاحیت بنی۔ شاید ان ہی کی اعلیٰ صلاحیتوں

اور دُعاؤں کا طفیل ہے کہ آج جناب سمیع الدین کے بارے میں یہ سب کچھ لکھا جا رہا ہے۔

جناب سمیع الدین نے ابتدائی تعلیم حبیب والا اور پھر قصبہ دھامپور (بجنور) میں حاصل کی۔ اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے علی گڑھ تشریف لے گئے جہاں ۱۹۶۷ء میں نمایاں کامیابی کے ساتھ سول انجینیر نگ میں گریجویشن کیا۔ کئی محکموں میں کام کرنے کے بعد آپ یو پی کے محکمۂ آبپاشی سے ۳۰ رستمبر ۱۹۹۸ء کو سبکدوش ہوئے۔ پہلے آپ نے دلّی میونسپل کارپوریشن کے تحت "Water Supply & Sewage Disposal Undertaking" میں؛ اس کے بعد ''مرکزی وزارتِ ورکس اینڈ ہاؤسنگ'' کے تحت "National Buildings Construction Corporation" (N.B.C.C) میں اور بعد ازاں اتر پردیش کے محکمۂ آبپاشی میں اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ کام کیا اور ٹیکنیکل مہارت کا لوہا منوایا۔

چونکہ آپ کا تعلق ایک درویش خاندان سے ہے لہٰذا مغربی علوم سے آراستہ ہونے کے باوجود بھی وراثت میں ملی فقیرانہ صفات آپ میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ جب آپ کی عمر محض دس سال تھی تو خواب میں آپ کو حضورِ مقبول ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔

جناب رامیشور دیال گپتا جو دہلی کے رہنے والے ہیں [اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔] اور محکمۂ آبپاشی میں بھی ٹھیکیداری کر چکے ہیں، نے جناب محمد سمیع الدین کے بارے میں عجیب وغریب واقعات کا انکشاف کیا۔ بقول اُن کے قصبہ ٹپّل (علی گڑھ) کے پاس، جمنا ندی کے بائیں کنارے پر سرکاری کام سے جناب سمیع الدین خیمہ زن تھے۔ جون کا مہینہ تھا۔ سخت ترین گرمی اور خوفناک جھلسا دینے والی لوئیں چل رہی تھیں کہ عین دوپہر کے وقت ایک شخص تکلیف سے بدحال آپ کے خیمے میں داخل ہوا۔ سمیع الدین صاحب اُس وقت ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے تھے۔ پوری بات معلوم کرنے کے بعد سمیع الدین صاحب نے اُس پر کچھ پڑھ کر دم کیا جس سے وہ شخص خدا کے فضل وکرم سے بالکل ٹھیک

ہو کر ہنسی خوشی فوراً گھر چلا گیا۔ اس کے علاوہ اور چند واقعات جناب گپتا نے بیان کیے جن سے جناب سمیع الدین کی درویشانہ صفات اور بزرگی کی نمایاں عکاسی ہوتی ہے۔

مرادآباد کے جناب شاہد حسین [اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔] نے بتایا کہ جب جناب سمیع الدین صاحب مرادآباد میں تعینات تھے تو ۲۶/جنوری ۱۹۹۶ء کو یوم جمہوریہ کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے آپ کچھ دیر کے لئے اچانک خاموش ہوئے اور پھر اعلان کیا کہ اگلے ماہ فروری کے آخری ہفتے میں اُن کا یہاں سے تبادلہ ہو جائے گا۔ ہر چند کے انجینیر س کا مالی سال کے آخیر میں تبادلہ نہیں ہوتا لیکن پھر بھی آپ کا وہاں سے ۲۸/فروری کو تبادلہ ہو گیا۔

ڈاکٹر عابد جو ضلع دہرہ دون میں ڈاک پتھر کے پاس موضع جیون گڑھ کے رہنے والے ہیں، نے سمیع الدین صاحب کی بزرگی سے متعلق کئی واقعات بیان فرمائے۔ ان کا کہنا ہے کہ سمیع الدین صاحب ڈاک پتھر میں تعینات تھے، میرا لڑکا گھوڑا کھال سینک اسکول میں داخلے کے لئے امتحان میں بیٹھا لیکن وہ بظاہر فیل ہو گیا۔ میں نے سمیع الدین صاحب سے دعا کے لئے کہا۔ بمشکل تمام آپ نے ایک دن فرمایا کہ جاؤ تمہارے بچے کا داخلہ ہو گیا ہے۔ میں بھاگا بھاگا اسکول گیا۔ واقعیٔ غیبی طور سے کچھ ایسی مدد اللہ تعالیٰ نے فرمائی کہ میرے بچے کا داخلہ ہو گیا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ انھوں نے اپنی لڑکی نسرین بانو کا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلے کے سلسلے میں بھی بیان کیا۔

آپ ایک بلند ہمت، بہادر اور باحوصلہ مردِ مومن ہیں۔ آپ کی زندگی دلیرانہ اقدامات سے بھری پڑی ہے۔ خطرات سے ٹکرانے میں آپ کو بے حد لُطف آتا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں احمدآباد میں جو زبردست مسلم کش فساد ہوا جس کے سلسلے میں خان عبدالغفار خان صاحب کو بھی احمدآباد جانا پڑا، آپ بے خوف و خطر عین فساد کے دوران، جس وقت فساد شباب پر تھا، اپنے محکمہ جاتی کام سے وہاں گئے۔

۱۲؍دسمبر ۱۹۷۰ء کو آپ کو سرکاری کام سے ضلع جھانسی میں ایک ایسے مقام پر جانا پڑا جہاں بتیوا ندی کی گھاٹیوں میں خونخوار ڈاکوؤں کا مسکن تھا لیکن آپ بے خوف وخطر وہاں گئے اور تمام رات ڈاکوؤں کے مہمان رہے۔ ان کی اس جرأت اور پامردی پر ڈاکو بھی انگشت بدنداں رہ گئے اور بہت اخلاق سے پیش آئے۔ اس سے سمیع الدین صاحب کی فرض شناسی کا بھی عندیہ ملتا ہے۔

۱۹۷۸ء میں آپ کی زیرِ نگرانی ایک مٹی کا باندھ تیار ہوا۔ یہ باندھ جمنا ندی کے بائیں کنارے پر، دہلی کے بالکل سامنے، دہلی۔ سہارنپور شاہراہ کے متوازی اور قصبہ باغپت اور قصبہ لونی (ضلع غازی آباد) کے بیچ واقع ہے۔ ابھی یہ باندھ بن کر تیار ہوا ہی تھا کہ برسات کی وجہ سے جمنا میں سیلابوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ۴؍ستمبر ۱۹۷۸ء کو اس دریا میں اپنی تاریخ کا شدید ترین خوفناک سیلاب آیا جس کے پیشِ نظر ضلع حکام نے قرب و جوار کی آبادی کو محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا اور اس باندھ سے بھی تمام عملہ چلا گیا کیوں کہ یہ یقینی تھا کہ یا تو یہ باندھ ٹوٹ جائے گا یا پھر اس کے اوپر سے سیلاب کا پانی اتر جائے گا۔ سمیع الدین صاحب سے بھی باندھ چھوڑنے کو کہا گیا لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور یک وتنہا تقریباً ایک ہفتہ تک اس طغیانی کا مقابلہ کرتے رہے اور اپنی اعلیٰ ٹیکنیکل مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے متعدد ایسے کام کیے جس سے یہ سیلاب اس باندھ کے لئے ایک نعمت ہی ثابت ہوا۔ عین سیلاب کے شباب کے دن عید الفطر (۵؍ستمبر) تھی جو سمیع الدین صاحب نے وہیں اپنے بیوی بچوں اور خاندان کے دیگر افراد سے دور رہ کر منائی اور اپنی دنیاوی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ شب و روز یادِ خدا میں بھی مشغول رہے۔ سیلاب کا زور کم ہو جانے پر محکمہ آبپاشی کے چیف انجینیر نے باندھ کا دورہ کیا اور باندھ کو مکمل محفوظ اور سمیع الدین صاحب کو زندہ وسلامت دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور تعجب اور فرطِ خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ انھیں سینے سے لگا لیا اور تمغۂ صدر جمہوریہ دلانے کا وعدہ فرمایا۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ اس سیلاب کی شدت اس قدر تھی کہ ہریانہ اور دہلی کی جانب کے کئی باندھ ٹوٹ گئے تھے اور اگر یہ باندھ بھی ٹوٹ جاتا تو غازی آباد کے پاس واقع فرخ نگر کے زمیں دوز فوجی ہوائی اڈے کو خطرہ ہو سکتا تھا۔

سمیع الدین صاحب کے مزاج میں انتظامی صلاحیتوں اور ذوقِ سلیم کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے۔ بلند شہر اور علی گڑھ میں تعیناتی کے دوران ''ضلع زراعتی، صنعتی نیز ثقافتی نمائشوں'' کے موقعوں پر آپ نے کئی تاریخ ساز مشاعرے کرائے جس کی وجہ سے ہندوستان کے صفِ اوّل کے سبھی شعراء کرام آپ سے بخوبی واقف ہیں۔ شمیم جے پوری، راز الہ آبادی، خمار بارہ بنکوی، نازش پرتاپ گڑھی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، وامق جونپوری، کیف بھوپالی، فنا نظامی کانپوری، عالم فتح پوری، مشیر جھنجھانوی، شمسی مینائی وغیرہ وغیرہ مرحومین تو آپ کے گرویدہ تھے۔ راز الہ آبادی کا جو مجموعۂ کلام ''منزلیں'' کے عنوان سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا اس کے سرِ ورق پر آپ کے ہی Comments درج ہیں۔

جناب سمیع الدین کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ اردو میں ''کہکشاں'' اور ''آ بگینہ''، ہندی میں ''پریتی پنج'' اور کچھ ٹیکنیکل کتابیں آپ کی شاہکار ہیں۔ ''آ بگینہ'' سے متاثر ہو کر تو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے آپ کو دعوت دی تھی کہ آپ ملازمت چھوڑ کر ان کے ساتھ فلمی دنیا میں آجائیں اور فلمی کہانیاں نیز مکالمے لکھنے لگیں۔ آپ کی ایک اور کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' جو تقریباً ڈھائی ہزار صفات پر مشتمل ہے، زیرِ اشاعت ہے۔ یہ کتاب انشاء اللہ تصوف میں سنگِ میل ثابت ہوگی۔

جناب سمیع الدین، ''زباں شیریں ملک گیری'' کے مقولے کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ ایک ملاقات پر انسان آپ کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ آپ میں بے پناہ قوتِ ارادی ہے۔ ایک بار ارادہ کر لینے پر دنیا کی کوئی طاقت، کوئی پریشانی آپ کو اس سے نہیں ہٹا سکتی۔ آپ کو شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں سے حد درجہ رغبت اور لگاؤ ہے۔

مختصراً جناب سمیع الدین میں بیک وقت وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک بہترین انسان میں ہونی چاہیے۔ آپ بہترین دوست، کامیاب انجینیر، فرض شناس آفیسر، خوش مذاق، سلیقہ مند، باوضع، متواضع، منکسر مزاج، نرم اور شیریں گفتار، صاف گو، جری، بہادر، حوصلہ مند، درویش صفت، ادب نواز، علم دوست اور حُسنِ مجلسی رکھنے والے عمدہ انسان ہیں۔ اللہ آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے (آمین)

(ایس۔ ایم۔ ظفر)

باب دوم

گزارشات

بارِ اوّل [۱]

[طباعتِ اولیٰ]

اس برِصغیر ہندو پاک کے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں انگریزوں کے تسلط سے آزاد ہو جانے پر دو خود مختار مملکتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ بحث تو غالباً بے معنیٰ ہے کہ تقسیم مناسب تھی یا غیر مناسب کیوں کہ نہ تو یہ میرا موضوع ہے اور نہ ہی بقول شخصیکہ ''گڑے مردے اکھاڑنے'' سے کوئی فائدہ ہی ہوگا بلکہ تلخی میں مزید اضافہ ہی ہوگا۔ اب یہ ایک حقیقت ہے کہ دو مملکتیں وجود میں آچکی ہیں اور حقیقت کو تسلیم کر لینا ہی دانش مندی ہے۔ شُتر مرغ کے ریت میں منھ چھپا لینے سے حقیقت بدل نہیں جاتی یا بلّی کے دودھ میں منہ ڈالتے وقت آنکھیں بند کر لینے سے چوری چھپ نہیں سکتی۔ اب ضرورت ہے تو اس بات کی کہ ہر دو جانب کے عوام ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر کے آپس میں بھائی بھائی کی طرح ایک دوسرے کے قوتِ بازو بنیں اور دوست کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں۔ یہی وقت کا تقاضا ہے۔ میں نے اپنے سفر کے دوران دیکھا کہ ہر دو جانب کے عوام اور سرکاری مشینری میں یہ جذبۂ خیر سگالی موجود بھی ہے۔ یہ ایک امید افزا امر ہے۔ کاش کہ حکمراں طبقہ بھی اس جذبہ کی آبیاری کرے تاکہ یہ ایک تناور درخت بن کر آنے والی نسلوں کو سایہ اور شیریں پھل مہیا کر سکے۔ لیکن یہاں تو کھیلوں پر بھی سیاست کا ملمہ چڑھا دیا گیا ہے جس کا عوام کے جذبۂ خیر سگالی کے آگے کافی عرصے تک برقرار رہنا مشکل ہوگا۔ [انڈین کرکٹ ٹیم کو ۶ر جنوری سے ۲۶ر فروری ۲۰۰۹ء تک پاکستان کا دورہ کرنا تھا جہاں اسے تین ٹیسٹ، پانچ

ایک روزہ اور ایک بیس اوور کے میچ کھیلنے تھے لیکن اب ۲۶ر نومبر ۲۰۰۸ء کو ممبئی میں ہوئے دہشت گردانہ حملوں کے پس منظر میں ان کو Cancel کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی دونوں ممالک کے درمیان کشیدہ تعلقات کی بنا پر کرکٹ پر زلہ ڈھل چکا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں جو تعلقات منقطع ہو گئے تھے وہ ۱۰ر مارچ تا ۱۳ر اپریل ۲۰۰۴ء کے مذاکرات سے بحال ہوئے؛ ۲۸ر فروری تا ۱۸ر اپریل ۲۰۰۵ء کے مذاکرات سے ۶ سال بعد پاکستانی کرکٹ ٹیم کا دورۂ ہند اور ۷ر جنوری تا ۱۹ر فروری ۲۰۰۶ء کے مذاکرات سے دونوں ممالک کے مابین کرکٹ سیریز کا انعقاد ممکن ہو سکا تھا۔ خدا کرے کہ پھر سے جلد تعلقات استوار ہو جائیں۔]

آزادی کے فوراً بعد ہر دو ممالکِ مذکورہ سے عوام کے نقلِ مکانی کا ایک پُر درد المیہ ظہور پذیر ہوا۔ سرحد کے اِس پار صدیوں سے رہنے والے مسلم خاندان اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ شاید ہی ایسا کوئی مسلم خاندان، بالخصوص شمالی ھند میں آباد تعلیم یافتہ خاندان رہا ہوگا جو ملک کی تقسیم کے ساتھ خود بھی منقسم نہ ہو گیا ہو۔ ہوا دراصل یہ کہ نا گفتہ بہ حالات نے جس برق رفتاری سے کروٹ لی اُس سے ہر تعلیم یافتہ مسلم خاندان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ اُس کو جلد یا بدیر اپنی جنم بھومی کو خیر باد کہنا ہوگا۔ چنانچہ پہلے اُن افراد نے ہجرت کی جو یا تو سرکاری ملازمت میں تھے یا جو نوجوان اپنی تعلیم مکمل کر چکے تھے۔ نتیجتاً زیادہ تر عمر رسیدہ اشخاص، زیرِ تعلیم بچے اور کچھ سرکاری ملازمت پیشہ افراد ہی یہاں رہ گئے۔ اسی اثناء میں پُر آشوب دور کے دم توڑنے، ماحول کے پُر سکون اور حالات کے سازگار ہو جانے سے امید کی ایک نئی کرن پھوٹی جس سے نقلِ مکانی کا وہ خوف ناک ریلا یکلخت تھم سا گیا اور جو جہاں تھا وہیں کا ہو رہا۔ لیکن اِس سے خاندان دو حصوں میں تقسیم ہو گئے اور والدین سے اولاد، بھائی سے بھائی اور بہن بچھڑ گئے۔ غرض یہ کہ Creamy Layer اپنے Base سے جدا ہو گئی۔

انسانوں نے سرحد کی شکل میں زمین پر لکیر کھینچ کر خاندانوں کو تو بانٹ دیا لیکن وہ اللہ کے بنائے ہوئے دلوں کو تقسیم نہ کر سکے۔ چنانچہ آج بھی (ابھی تک تو) منقسم خاندان ترجیحی بنیادوں پر آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پاکستان میں تو ہندوستانی لڑکی کو جلد ہی شہریت مل جاتی ہے جب کہ ہندوستان میں شاذونادر ہی کسی پاکستانی لڑکی کو شہری حقوق مل پاتے ہوں حتیٰ کہ اس کے کئی کئی بچے بھی ہو جاتے ہیں جو ہندوستانی شہری ہی ہوتے ہیں۔ ستم ظریفی تو دیکھئے کہ شوہر ہندوستانی، بچے ہندوستانی لیکن محترمہ غیر ملکی!۔ لاہور میں مجھے بھتیجی [بھائی نمبر ۳ کی سب سے بڑی بیٹی] کی لڑکیاں بہت پیاری لگیں۔ کاش کہ وہ ہندوستان میں ہوتیں تو میں ان میں سے ایک کو تو ضرور اپنی بہو بنا لیتا! انھیں دیکھ کر اور حالات کے پیشِ نظر میں دل مسوس کر رہ گیا۔

میری بات رہی میرے من میں
کچھ کہہ نہ سکا الجھن میں

اس سلسلے میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر حکمرانوں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ملک کو تقسیم ہوئے چون سال (۲۰۰۱ء تک) ہو چکے ہیں۔ ہجرت کرنے والوں میں سے زیادہ تر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میں نے اپنے قیامِ پاکستان کے دوران کچھ بقیدِ حیات مہاجرین سے اُن کے ہجرت کرنے سے متعلق تاثرات جاننے چاہے تو کم و بیش سبھی کے یہ تاثرات تھے کہ اُس وقت جو حالات تھے اُس سے ایسا لگتا تھا کہ بالآخر سبھی کو نقلِ مکانی کرنا ہو گا یا پھر دونوں ممالک کے درمیان حالات اِس حد تک خوشگوار ضرور رہیں گے کہ ہر دو ممالک کے عوام بنا روک ٹوک سرحد کے دونوں جانب آجا سکیں گے اور پاسپورٹ کی کوئی بندش نہیں ہوگی۔ [جس طرح سے یورپین یونین کے ممالک میں ہے۔] میں نے اُس نسل کے بھی تاثرات جاننے چاہے جو وہیں پیدا ہوئی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ یہاں زیادہ خوش ہیں۔ البتہ وہ اپنے ہندوستانی رشتہ داروں کے بارے میں ضرور فکر مند دکھائی دیئے۔

اُن میں اپنے خانوادے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا جذبہ تو جنون کی حد تک پایا گیا۔ اس کی وجہ غالبًا یہ رہی ہوگی کہ کچھ خاندانوں نے تو نئے ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے کفو ہی بدل ڈالے ہیں۔ [اس سلسلے میں احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' کی جلد اوّل، ''تاریخ دودمانِ عالی'' ملاحظہ فرمائیں۔] اس سے ازدواجی زندگیوں میں رخنہ اندازی واقع ہوئی ہے۔ ویسے پاکستانی اپنے بچوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں کفو سے متعلق کچھ زیادہ چھان بین نہیں کرتے محض معاشی حالات ہی دیکھتے ہیں۔ ایک مہاجر خاندان اپنے آبائی وطن کے مہاجر خاندان ہی کو اوّلیت دیتا ہے۔ پہلے ضلعی سطح پر، پھر صوبائی سطح پر اور آخیر میں یوپی۔ بہار، یوپی۔ راجستھان، یوپی۔ مدھیہ پردیش اور یوپی۔ دہلی کے تعلقات کی تجدید کرتا ہے۔

میرے والدِ بزرگوار کا ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) میں میرا خاندان نو افراد (والدہ ماجدہ، پانچ بھائی اور تین بہنیں) پر مشتمل تھا۔ اس میں سے دو بھائی (بھائی نمبر ا اور ۳) ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ بعد میں ایک بہن (بہن نمبر ۲) کی بھی پاکستان میں شادی ہو جانے سے وہ وہاں کی شہری ہو گئیں تھیں۔ [ان کی شادی تائے زاد بھائی سے ہوئی تھی جو ۱۹۴۷ء ہی میں پاکستان چلے گئے تھے۔] اس طرح میرا ایک تہائی خاندان پاکستان اور دو تہائی ہندوستان کے مابین تقسیم ہو کر رہ گیا تھا۔ بھائیوں میں سے ایک بھائی (نمبر ا) اور بہن تو کئی بار ہندوستان تشریف لا چکے تھے اور ان سے ملاقات بھی ہو گئی تھی لیکن دوسرے بھائی (نمبر ۳) پاکستان جانے کے بعد سے ایک بار بھی ہندوستان تشریف نہیں لائے (غالبًا عیالدار ہونے کی وجہ سے یا پھر اس وجہ سے کہ بھابی صاحبہ کے والدین اور بہن، بھائی، سبھی پاکستانی شہری ہو چکے تھے) اور نہ ہی میں (۲۰۰۱ء سے پہلے) اور والدہ صاحبہ پاکستان جا سکے۔ اس سے نہ تو میں بھائی سے بغلگیر ہو سکا اور نہ ہی والدہ اپنے بیٹے کو گلے لگا سکیں۔

والدہ صاحبہ اکثر انھیں یاد کر کے رویا کرتی تھیں اور اسی تڑپ میں بالآخر انھوں نے ۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) میں اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ اُدھر بھائی بھی والدہ اور ہم سب کو یاد کرتے کرتے ۶؍اگست ۱۴۲۱ھ (۲۰۰۰ء) کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میں سرکاری ملازمت میں تھا۔ والدہ صاحبہ کو پاکستان لے جانے کی غرض سے میں نے اپنا پاسپورٹ بنوانے کے سلسلے میں گورنمنٹ سے No Objection Certificate کی درخواست کی لیکن افسوس کہ والدہ صاحبہ کی حیات تک مطلوبہ سرٹیفکیٹ دستیاب نہ ہو سکا۔ ہر بار ایک نئی Query کی جاتی رہی۔ مثلاً پوچھا گیا، کیوں جانا چاہتے ہیں؟۔ احقر نے جواب دے دیا، حالانکہ درخواست میں پہلے ہی سب کچھ لکھ چکا تھا۔ پھر پوچھا، کب جانا چاہتے ہیں؟۔ پھر جواب دے دیا۔ پھر پوچھا، کب واپس آئیں گے؟۔ اب اُن سے کون یہ پوچھے کہ اجازت دی نہیں، چنانچہ گیا بھی نہیں، اب یہ کیسے بتا دوں کہ واپس کب آؤں گا!!، وغیرہ وغیرہ۔ مجبور ہو کر خاموشی اختیار کرنی پڑی اور ملازمت سے سبکدوش ہو جانے پر ہی میں نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا۔ عزیزوں سے ملاقات کا منظر سوچنے سے ہی میرا دل بھر آتا تھا اور آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ بالآخر میں نے رخت سفر باندھا اور خوشی خوشی جب ٹیلیفون پر بھائی (نمبر ۳) کو یہ مژدۂ جانفزا سنانے کے لئے رنگ کیا تو پتہ چلا کہ وہ اُسی دن صبح کو ابدی نیند سو چکے تھے اور اُس وقت غسّال کے ہاتھوں میں تھے۔ اُس طرف سے روتے ہوئے میری اَن دیکھی بھابھی نے بتایا کہ انتقال سے پہلے انھوں نے مجھے (راقم الحروف کو) یاد کیا اور پھر حسرت ویاس کے عالم میں فرمایا (مرحوم بھائی نے) کہ اب وہ (میں) میرے انتقال کے بعد ہی آئے گا۔ انھوں نے (بھابی صاحبہ نے) یہ بھی بتایا کہ زندگی کے آخری دور میں اُن کی زبان پر اکثر داغ دہلوی کا یہ شعر رہتا تھا جو اُن کے لئے ایک الہامی شعر ثابت ہوا۔

ہوش و حواس، تاب و تواں جا چکے ہیں داغ
اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

مجھ پر اُس وقت کیا گزرا ہوگا، قلم اُس کے بیان سے قاصر ہے۔ کیا کیا خواب سجائے تھا!!۔ ملنے کی خوشی کے احساس سے جو آنسو آنکھوں سے چھلک جاتے تھے اب وہ رنج و الم کی غمازی کرنے لگے تھے۔ صبر کا دامن تار تار ہو چکا تھا۔ ایک ایک کر کے ماضی کی دھندلی تصویریں ابھرنے لگیں تھیں۔ ریٹائر ہونے کے بعد جب میں نے ایک بار ٹیلیفون پر اُن سے کہا تھا کہ اب میں ریٹائر ہو چکا ہوں، اب ضرور آؤں گا تو انھوں نے قدرے چونکتے ہوئے کہا تھا کہ تُو ابھی سے کیسے ریٹائر ہو گیا! میرے سامنے تو ابھی بھی وہ منظر ہے کہ تُو مچل رہا ہے اور میں اُنگلی پکڑے تجھے مدرسے لے جا رہا ہوں اور پھر اس کے بعد ان کا گلا کچھ رونده سا گیا تھا اور انھوں نے روتے ہوئے ریسور رکھ دیا تھا۔ اِدھر میں بھی بے قابو ہو کر رونے لگا تھا۔ بقول جگر مراد آبادی ۔

اِدھر سے بھی سوا ہے کچھ اُدھر کی مجبوری!
کہ ہم نے آہ کی تو، اُن سے آہ بھی نہ ہوئی!!

اس کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ یہ اُن سے میرا آخری رابطہ تھا۔

بھائی کے انتقال کی خبر سن کر میں نے دل شکستگی کے عالم میں پاکستان جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا تھا۔ میں ڈرپوک تھا، ڈرتا تھا کہ کس طرح بیوہ بھابی اور یتیم بھتیجوں کے افسردہ چہرے دیکھ سکوں گا!، کیا کہہ کر ان کو دلاسا دے سکوں گا!!۔ بھائی کے انتقال سے میں تو خود ٹوٹ چکا تھا، مجھے تو خود سہارے کی ضرورت تھی۔ پھر کس طرح دوسروں کو سہارا دے سکوں گا!!!............ میں بچپن میں ہی نعمتِ پدری سے محروم ہو گیا تھا۔ اس لئے دولتِ پدری کے درد سے بخوبی واقف تھا۔ وہ بھائی ہی تو تھے جنھوں نے سایۂ پدری سے مجھے مالا مال رکھا اور اللہ کے فضل و کرم سے پروان چڑھایا۔

کچھ عرصہ بعد جب پاکستان سے بھابی صاحبہ کا ٹیلیفون آیا اور میں نے اُن کو نہ آنے کا فیصلہ سنایا تو انھوں نے قدرِ ڈانٹتے ہوئے، شفقت بھرے لہجے میں سمجھایا اور سوال کیا کہ کیا اپنے مرحوم بھائی کو جھوٹا ثابت کرو گے؟ جنھوں نے کہا تھا کہ وہ ضرور آئے گا؟۔ پھر سوال کیا کہ کیا اپنی اولاد کے سر پر ہاتھ نہ رکھو گے؟۔ اُن کی آواز میں کرب و بے چینی تھی، شفقت تھی؛ ان کے سوالات نے ذہن کو جھنجھوڑ دیا۔ اسی بیچ میرے دوسرے بھائی (نمبرا) بھی پاکستان سے ہند تشریف لے آئے۔ انھوں نے بھی جب پاکستان چلنے کو کہا تو بالآخر میں نے انھیں کے ہمراہ پاکستان جانے کا ارادہ کر ہی لیا۔

[۲] بارِ دوم

[طباعتِ ثانی]

مجھے پوری زندگی میں، ملازمت سے سبکدوش ہوجانے کے بعد محض ایک بار ۲۰۰۱ء میں پاکستان جاکر اپنے حقیقی بہن، بھائی اور اُن کے اہلِ خانہ نیز دیگر عزیز واقارب اور بستی کے مہاجر افراد سے ملاقات کرنے کا سنہرا موقع نصیب ہوا۔ اس دلچسپ سفر اور جذباتی ملن کو یادگاری بنانے کے مقصد سے احقر نے وطن واپسی پر یادوں کی بارات لئے ''چند قدم گھر سے..........'' [ہمارے یہاں سے پہلے مزدور تک مزدوری کرنے لاہور جایا کرتے تھے۔] کے عنوان سے ایک سفر نامہ تحریر کیا جو دہلی سے ''عاکف بکڈپو'' نے شائع کیا۔

مذکورہ سفرنامے کی وطنِ عزیز اور پاکستان میں جس طرح پذیرائی ہوئی اس سے احقر کی ہمت افزائی تو ہوئی ہی ساتھ ہی اس کے اس احساس کو بھی تقویت ملی کہ دونوں جانب کے عوام بہر صورت ایک روح دو قالب ہیں۔

احقر کے سبھی پاکستانی حقیقی رشتے دار اور زیادہ تر عزیز واقارب کراچی، لاہور اور راولپنڈی، خاص کر کراچی اور لاہور میں رہتے ہیں۔ اسی لئے ان ہی دو شہروں کے ویزے حاصل کئے گئے تھے لیکن عجلت کی وجہ سے سفرنامے میں محض کراچی ہی کی تفصیل دی جانی ممکن ہوسکی تھی۔ اس پر لاہور کے اپنوں نے پیار بھرا قدرِ احتجاج کیا جس کو احقر نے سر آنکھوں پر قبول کرتے ہوئے ان کو یہ یقین دہانی کرادی تھی کہ پہلی فرصت میں سفرنامے پر

نظرِ ثانی کرتے ہوئے اس میں لاہور کو بھی اس کے شایانِ شان شامل کرلیا جائے گا۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ کچھ تو خانگی مصروفیات اور کچھ نامکمل مسودوں [''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' (جلد اوّل تا چہارم)، ''سلطان الشہداء'' اور ''سید عبدالرحمٰن بن فضل اللہ''] کو مکمل کرنے میں اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ جلد وعدہ وفا کرسکتا اور تقریباً سات سال کا ایک طویل عرصہ شرمندگی کی نذر ہوگیا۔ یہ صفائی اس لئے دینی پڑی کہ کہیں قارئین زیرِ نظر سفرنامے کو ''باسی کڑھی میں اُبال'' کے مترادف نہ سمجھ لیں۔

یہ قابلِ تحریر ہے کہ سفر اور کراچی سے متعلق بھی جو چند دلچسپ اور معلوماتی احوال لکھنے سے رہ گئے تھے، اب ان کو بھی زیرِ نظر جلد میں شامل کرلیا گیا ہے اور مناسب تصاویر کا بھی اضافہ کردیا گیا ہے۔

ایک حقیقت جس کا ذکر کرنا میں اوّل بار بھول گیا تھا، وہ یہ کہ ماضی میں جو پاکستانی ہندوستان آتے تھے وہ اپنے عزیز واقارب کے لئے تحفتاً ''فلیٹ'' (کپڑے کی ایک قسم) لاتے تھے اور باقی کپڑا ہندوستان سے خرید کرلے جاتے تھے لیکن اب اس کے برعکس ہے۔ میرے بھانجے اور بھتیجوں نے مجھے جو سفاری سوٹ (احقر کو موسمِ گرماں میں سفاری سوٹ زیادہ پسند ہیں) اور پٹھانی سوٹ بنا کردیئے ان کا کپڑا اتنا عمدہ ہے کہ وہ آج بھی (سات سال بعد) ایسے ہیں جیسے پہلے تھے۔ یہی حال جوتوں کا بھی ہے۔ جو پشاوری سینڈل مجھے سوغات میں ملا تھا، وہ آج بھی جیوں کا تیوں ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستان کے جوتوں کے مارکیٹ پر تو کافی حد تک پاکستان نے قبضہ کرلیا ہے۔ اسی ضمن میں اکبرالہ آبادی کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

بوٹ ''ڈاسن'' نے بنایا، میں نے اک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا، اور جوتا چل گیا

بہر حال وعدہ ایفاء کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، یعنی لاہور کی تفصیلات بھی شامل کی جا رہی ہیں؛ بس فرق اتنا ہے کہ کراچی کی تفصیلات تو بحیثیت ایک انجینیر کے پیش کی گئی تھیں اور اب لاہور کی تفصیلات بحیثیت ایک فقیر [احقر کا تعلق ''چشتیہ'' سلسلے کے خاندان سے ہے۔] کے پیش کی جا رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور میں جتنے اولیاء اللہ محوِ خواب ہیں اتنے شاید ہی اس برِّ صغیر کے کسی دوسرے مقام پر ہوں گے۔ ویسے بھی لاہور کو ''دارالاسلام'' کہا گیا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ احقر وا تنا وقت نہیں مل سکا کہ وہ سب اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دے سکتا۔ محض تین مزارات پر ہی فاتحہ پڑھ سکا۔ ان میں سے دو کے نام تو داتا گنج بخشؒ اور میاں میرؒ یاد رہے جب کہ تیسرے کا نام اب ذہن سے اتر چکا ہے۔ وہ تیسرے یا تو شیخ عزیز الدینؒ (المشہور بہ پیر مکّیؒ) رہے ہیں یا پھر سید فخر الدین زنجانیؒ۔ بہر حال، ان دونوں ہی بزرگوں کے بھی حالاتِ زندگی قلم بند کر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کاش کہ قارئین کو پسند آ جائیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص یہ دعوہ نہیں کر سکتا کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہر طور مکمل، ہر خامی سے پاک، ہر غلطی سے مبرّا اور ہر تنقید سے بالاتر ہے، پھر احقر کی تو بساط ہی کیا ہے!!۔

آخر میں احقر اُن تمام ناشرین اور مصنفین کا شکریہ ادا کرنا چاہے گا جن کی تصنیفات سے اس نے استفادہ کیا۔ اگر اس موقع پر وہ اپنے اُن کرم فرماؤں کو فراموش کر دے جن کی مثبت تنقید اور بروقت مشوروں سے یہ ''بیل منڈھا چڑھ سکی'' تو یہ اُس کی کم ظرفی ہوگی، یعنی اس کا اشارہ جناب نورالحسن راشد کاندھلوی (مفتی الٰہی بخش اکیڈمی، کاندھلہ۔ مظفر نگر)، مولانا ریاست علی ظفر (استاذ دارالعلوم، دیوبند۔ سہارن پور)، جناب ڈاکٹر الطاف حسین ندوی (سابق ریڈر، شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) اور

جناب افضال الرحمن بچھرایونی ثم الدہلوی وغیرہ کی طرف ہے۔

ہر چند کے "گھر کی مرغی دال برابر" کہی گئی ہے لیکن درحقیقت دال بھی بڑا مال ہوتا ہے۔ اب مسور ہی کی دال کو لے لیجئے، دالوں میں سب سے زیادہ گراں ہے، شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "یہ منہ اور مسور کی دال!"۔ اس لئے مشکور ہوں اپنے سب سے چھوٹے فرزند، میاں محمد کامران سعید کا جنھوں نے انٹرنیٹ سے اہم معلومات اور تصاویر حاصل کر کے احقر کر بہم پہونچائیں۔ اللہ اس کو عمرِ خضر عطا فرمائے۔ (آمین)
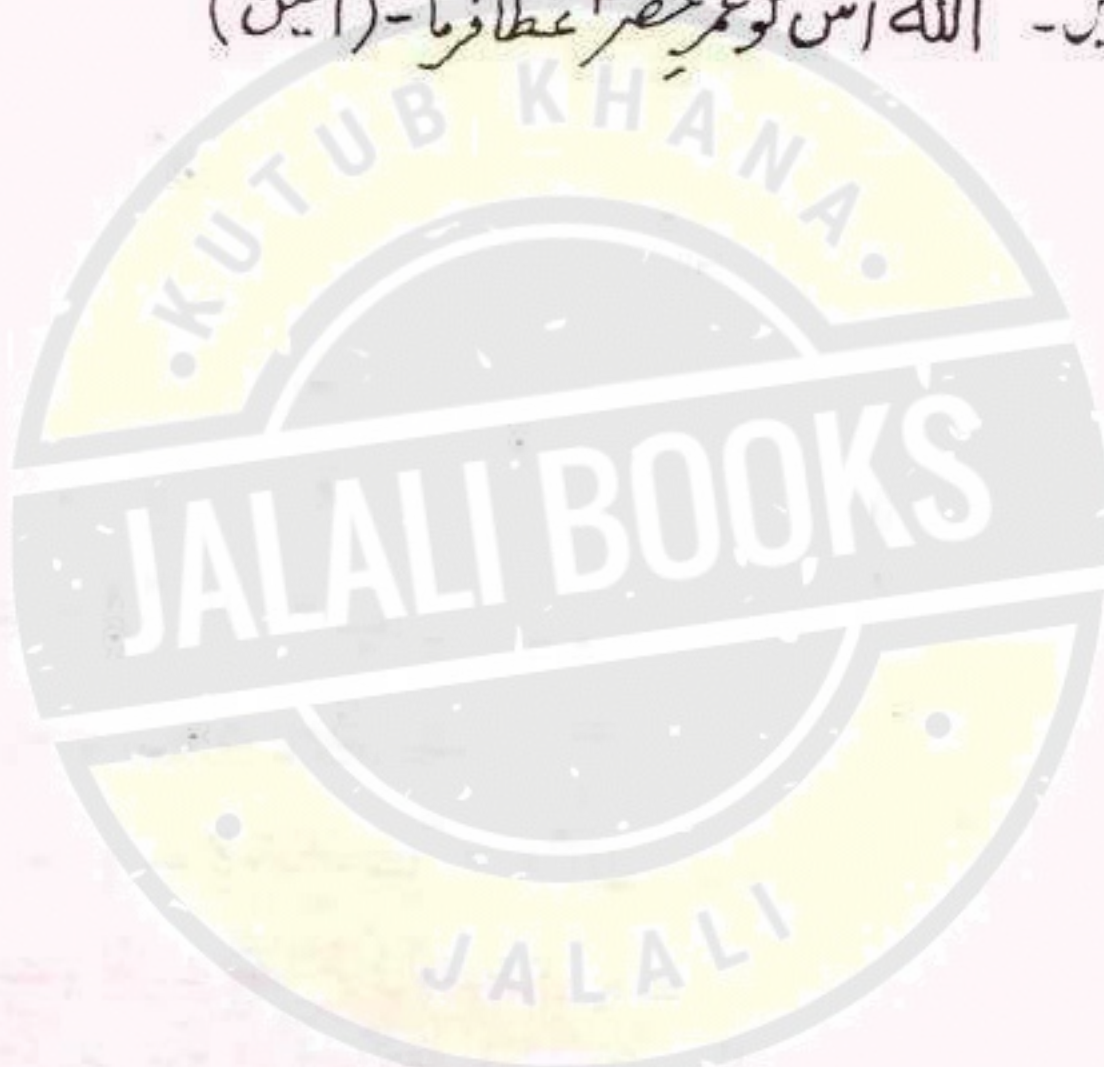
باب سوم

روانگی

میں ایک ماہ کے ارادے سے ۲۸ رفروری ۲۰۰۱ء بروز بدھ بذریعہ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' (۱) شب کے تقریباً نو بجے پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن سے بھائی، بھابی وغیرہ کے ہمراہ پاکستان کے لئے روانہ ہوا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بذریعہ ٹرین آمد ورفت کا محض ''سمجھوتہ ایکسپریس'' ہی واحد ذریعہ ہے [یہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے۔ اب بذریعہ ''تھار ایکسپریس'' (۲) بھی جایا جاسکتا ہے، بلکہ کراچی کے لئے تو یہی زیادہ مناسب ہے۔] جو ہفتہ میں دو دن، پیر اور جمعرات کو لاہور سے اور بدھ اور اتوار کو دہلی سے چلتی ہے۔ یعنی محض پیر اور جمعرات کو ہی بارڈر کھلتا ہے۔ اس میں محض ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ہی سفر کرنے والے سوار ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے پاسپورٹ دکھا کر اس ٹرین کا ٹکٹ ملتا ہے۔ پہلے دہلی سے پاکستان کے کسی بھی ریلوے اسٹیشن اور لاہور سے ہندوستان کے کسی بھی ریلوے اسٹیشن تک کا ٹکٹ مل جایا کرتا تھا لیکن اب دہلی سے محض انڈین بارڈر (اٹاری ریلوے اسٹیشن) اور لاہور سے محض پاکستانی بارڈر (واگھا ریلوے اسٹیشن) تک کا ہی ٹکٹ مل پاتا ہے۔ خدا کرے کہ پھر سے پہلے ہی جیسے فیصلے پر عمل ہونے لگے کیوں کہ اُس میں مسافروں کو زیادہ سہولت تھی۔

ہماری ٹرین اگلے دن، یکم مارچ بروز جمعرات علی الصبح، تقریباً چار بجے اٹاری ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ یہ ریلوے اسٹیشن ہندوستان کی سرحد سے ملحق آخری ہندوستانی ریلوے اسٹیشن ہے اس لئے یہ چیک پوسٹ بھی ہے۔ اسٹیشن پر دو پلیٹ فارم ہیں جو کافی لمبے چوڑے اور ریلوے کے مخصوص ڈیزائن کے مطابق Steeltruss سے Covered ہیں۔ جس پلیٹ فارم پر ہماری ٹرین جا کر رُکی اُس پر کافی تعداد میں Emigration اور Custom کے لئے مستقل Counters بنے ہیں جو آپس میں یکساں، خاصے فاصلے پر اور پورے پلیٹ فارم پر پھیلے ہیں اور ان پر نمبر پڑے ہیں۔ اسی پلیٹ فارم کے ایک کنارے پر ٹکٹ گھر، کرنسی تبدیل کرنے کے لئے ''اسٹیٹ بینک آف

انڈیا'' کا ایک دفتر، کینٹین اور کافی تعداد میں الگ الگ زنانے اور مردانے بیت الخلاء نیز غسل خانوں کا معقول بندوبست ہے۔ اسٹیشن نہایت صاف ستھرا اور کشادہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نئی تعمیر ہوئی ہے۔ اسٹیشن پر قلی کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ غالباً اس لئے کہ دلالی کی کوئی گنجائش نہ رہنے پائے؛ حالانکہ یہ ایک کتابی سوچ ہے۔ [سادے کپڑوں میں بہت سے لوگ یہ کام انجام دیتے ہوئے دیکھنے میں آئے۔] مسافروں کو اسٹیشن پر مہیا Luggage Carriers (ٹرالیوں) کے ذریعہ خود اپنا سامان لے جانا ہوتا ہے۔ Carriers کم ہیں اور مسافر زیادہ ہوتے ہیں اس لئے جیسے ہی ٹرین پلیٹ فارم پر آکر آہستہ ہوتی ہے تو فوراً سواریاں Carriers حاصل کرنے کے لئے چلتی ٹرین سے کودنے لگتی ہیں۔ ان Carriers کا کوئی کرایہ نہیں لیا جاتا۔

تقریباً آٹھ بجے Counters کھلے۔ سب مسافر پہلے Emigration کے لئے Counters پر قطار در قطار کھڑے ہوگئے۔ ہندوستانی اور پاکستانی شہریوں کے لئے الگ الگ کاؤنٹرس ہیں۔ ہندوستانی مسافروں کی مزید سہولت کی خاطر ہر صوبہ کا الگ الگ کاؤنٹر ہے۔ یوپی چونکہ بڑا صوبہ ہے اور اس کے مسافروں کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے، اس لئے یوپی والوں کے لئے زیادہ کاؤنٹرس کا انتظام کیا ہوا ہے۔ کاؤنٹرس کے قدرِ فاصلے پر ہونے سے یہ فائدہ ہے کہ لائن لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

Emigration کے بعد Custom کرانا ہوتا ہے۔ Emigration کاؤنٹر سے ہی کسٹم کاؤنٹر کا نمبر دے دیا جاتا ہے۔ چونکہ میرا اور بھائی کا الگ الگ کاؤنٹر پر Emigration اور کسٹم ہونا تھا (شہریت کی وجہ سے) اس لئے پہلے میں نے بھائی کے سامان کا کسٹم کرایا اور پھر اپنے کاؤنٹر پر پہنچا۔ چونکہ ہمارے پاس کوئی غیر قانونی سامان تو تھا نہیں اس لئے کسٹم ہونے میں بھی نہ تو کوئی دیر ہوئی اور نہ ہی تکلیف۔ کاؤنٹر پر

موجود عملے نے بہت خندہ پیشانی سے ہمارے سامان پر نمبر ڈال کرا سے کلیر کردیا۔ میں نے سُن رکھا تھا، اور دیکھ بھی رہا تھا کہ کسٹم کا عملہ اٹیچی، بستر بند اور بیگ وغیرہ سب کچھ کھلوا کر ایک ایک سامان دیکھتا ہے لیکن مجھے تعجب تھا کہ انھوں نے میری اٹیچی نہیں کھلوائی۔ میرے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ تجربے کی بنا پر انھیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس کے پاس غیر قانونی سامان ہوگا۔ میں نے ہندی رسم الخط میں اردو شعر و شاعری کی ایک کتاب لکھی ہے (''پریتی پنچ'')۔ میں عملے کے حسنِ اخلاق سے اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے انھیں ایک کتاب اپنے دستخط کے ساتھ نذر کی۔ ایک صاحب جو غالباً اس عملے کے افسرِ بالا رہے ہوں گے، یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ فوراً لپک کر میرے پاس آئے اور معلوم کیا کہ مذکورہ کتاب ان کے عملے نے تو مجھ سے طلب نہیں کی ہے؟۔ جب میں نے ان کو پوری بات بتائی تو انھوں نے بھی اس کتاب کی سرسری طور ورق گردانی کرتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

کسٹم کے وقت میں نے دیکھا کہ لوگ اس حد تک سامان لاتے ہیں کہ ان کے دیکھنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اُن کی نیت صاف نہیں ہے۔ کسٹم کے عملے کا رویہ بھی اُن کے ساتھ ویسا ہی ہوتا ہے۔

اسٹیشن پر ایک Steel Wire Mesh کا Partition دیتے ہوئے دونوں پلیٹ فارموں کو الگ کیا ہوا ہے اور ایک پلیٹ فارم سے دوسرے پر جانے کے لئے دونوں کے بیچ ایک آہنی گیٹ لگا ہوا ہے۔ جب زیادہ تر مسافروں کا کسٹم ہو گیا تو گیٹ کھول دیا گیا اور مسافر پہلے پلیٹ فارم سے دوسرے پر آنے لگے۔ جب سب کا کسٹم ہو گیا اور سب دوسرے پلیٹ فارم پر آگئے تو گیٹ کو پھر سے بند کر دیا گیا۔ بعد ازاں پہلے پلیٹ فارم پر لاہور کی جانب سے مسافروں کو لے کر ٹرین آگئی۔ اب اُس پلیٹ فارم پر اُن

مسافروں کا Emigration اور کسٹم ہونا تھا۔ مسافروں کو اتار کر وہی ٹرین اس پلیٹ فارم پر آ گئی جس پر ہم آ چکے تھے۔

جب مسافر ٹرین میں بیٹھ گئے تو وہ خراماں خراماں واہگہ کی جانب روانہ ہوئی۔ ٹرین کے ساتھ ساتھ، اس کے دونوں جانب ہندوستانی فوجی دستے کے چاق و چوبند مسلح گھوڑ سوار بھی چل رہے تھے۔ یکبارگی سرحد پر آ کر ٹرین رُک گئی اور وہیں وہ گھوڑ سوار بھی رُک گئے۔ جہاں ریلوے لائن سرحد کو کاٹتی ہے وہاں ایک آہنی گیٹ مقفل رہتا ہے۔ محض ٹرین کے آنے پر ہی اُس کو دونوں حکومتوں کے محافظ عملے کے ارکان کھولتے ہیں۔ جب ضابطے کی کارروائی کے بعد گیٹ کھل گیا تو ٹرین پھر سے روانہ ہوئی۔ اس طرف پاکستان کا علاقہ تھا۔ سرحد سے تقریباً سو میٹر فاصلے پر پاکستان ریلوے کا آخری اسٹیشن اور چیک پوسٹ، واہگہ واقع ہے۔ [اٹاری اور واہگہ کے درمیان تقریباً تین کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ اسی درمیان، پاکستانی علاقے میں، تاریخی "اِچھوگل کینال" بھی واقع ہے۔]

یہ قابلِ ذکر ہے کہ اٹاری سے واہگہ تک دونوں حکومتوں نے اپنے اپنے علاقے میں، ریلوے لائن کے دونوں جانب خاردار آہنی تار لگائے اور بچھائے ہوئے ہیں تاکہ ٹرین میں سے کوئی مسافر اُتر کر فرار نہ ہو سکے یا اس بیچ کوئی شخص ٹرین میں سوار نہ ہو سکے۔ پاکستانی علاقے میں ٹرین کے ساتھ گھوڑ سوار نہیں چلتے البتہ Position لئے محافظ ضرور دکھائی پڑتے ہیں۔

ٹرین کے واہگہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچتے ہی، اس کے رُکنے سے پہلے، مسافروں نے ایک بار پھر سے ٹرین سے کود کود کر Luggage Carriers حاصل کرنے کی غرض سے دوڑ لگانی شروع کر دی۔ یہاں Carriers مفت نہیں ملتے بلکہ دس روپیہ فی کیریر دینا ہوتا ہے۔ اس کے بعد سب مسافر سامان سے لدے پھندے پلیٹ فارم سے

ایک ہال میں داخل ہوئے۔ اس ہال کے صدر گیٹ پر ''رینجرس'' تعینات تھے جو پاسپورٹ دیکھ کر ہی ہال میں داخل ہونے دے رہے تھے۔

یہاں ایک پُر لطف واقعہ کا ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہوا یہ کہ پلیٹ فارم سے گیٹ پر پاسپورٹ دکھا کر جیسے ہی میں Emigration Hall No.1 میں داخل ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچا ہو۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک انجانے شخص نے قدرِ تلخ لہجے میں مجھ سے میرا پاسپورٹ طلب کیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ "Pakistan Local Intelligence Unit" سے ہے۔ میں نے جب اس سے Identity Card دکھانے کو کہا تو اس نے مزید تحکمانہ لہجے میں جواب دیا کہ اس وقت اس کے پاس I.Card نہیں ہے۔ میں اس کے لب و لہجے سے اس قدر بیزار ہو چکا تھا کہ میں نے بھی بنا I.Card دکھائے اس کو اپنا پاسپورٹ دکھانے سے صاف انکار کر دیا۔ قریب ہی ایک ''رینجر'' بھی کھڑا تھا جو کافی دیر تک ہم دونوں کی تکرار بغور سنتا رہا۔ پھر اس نے اس اجنبی شخص کو پنجابی میں پھٹکار لگائی۔ اس پر اس اجنبی نے اس بار اپنا لہجہ بدلتے ہوئے قدرِ خوشامدانہ انداز میں پاسپورٹ چاہا۔ اس بار میں نے اس کو اپنا پاسپورٹ دے دیا۔ اس کے بعد اس نے سوال و جواب کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ پہلے پوچھا کہ آپ لاہور میں کہاں جائیں گے؟۔ میں نے جواب دیا کہ پہلی بار آیا ہوں مجھے پتہ زبانی معلوم نہیں، جو بھی ہے وہ پاسپورٹ میں لکھا ہوا ہے۔ اس کے بعد اس نے سوال کیا کہ آپ کا نام کیا ہے؟۔ میں نے قدرِ ہنس کر جواب دیا کہ پاسپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک کاغذ پر اردو میں میرا نام نوٹ کیا۔ اپنے نام کا املا دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ اس بار میں نے سوال کیا کہ آپ کی Qualification کیا ہے؟۔ اس نے جواب دیا کی Graduate۔ میں نے پھر

سوال کیا کہ آپ کی مادری اور قومی زبانیں کیا ہیں؟۔اس نے جواب دیا کہ مادری زبان پنجابی اور قومی زبان اردو ہیں۔اس پر میں نے قدرِ چٹکی لیتے ہوئے کہا کہ قومی زبان اردو ہوتے ہوئے بھی آپ اردو میں صحیح صحیح نام نہیں لکھ سکتے، یہ ہے آپ کی علمی استعداد!!۔ [اس نے میرے نام کا املاسمی الدین لکھا تھا۔] ''رینجر'' جو ابھی تک ہماری باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا، نے ایک کھسیانی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا ''صاحب! ہم لوگ پنجابی ہیں، بولتے ضرور کا چو ہیں لیکن لکھتے چاقو ہی ہیں۔'' میں نے جواب دیا کہ محترم! بات لکھنے کی ہے، بولنے کی نہیں؛ یہ تو ایسا ہی ہوا ''مارے گھٹنا اور پھوٹے آنکھ''۔ [یہ ان کے جھینپ اتارنے کی بات تھی ورنہ مسئلہ بولنے کا نہیں بلکہ املے (لکھنے) کا تھا۔] اس کے بعد وہ دونوں ایک طرف کو چلے گئے اور میں Emigration کے لئے لائن میں لگ گیا۔

اس ہال کے اندر، آگے کے حصہ میں میزیں ڈال کر ایک ہی جگہ عارضی Emigration Counters بنائے ہوئے تھے۔ان کے سامنے Steel Barricading کی ہوئی تھی جن میں مسافروں کو لائن میں لگ کر Emigration کرانا تھا۔ہال کی گنجائش مسافروں کی تعداد کے لحاظ سے بہت محدود ہے جس کی وجہ سے لمبی لمبی قطاریں لگانی پڑتی ہیں اور ان قطاروں کا صحیح طریقہ سے قائم رہنا بھی بہت مشکل ہوتا ہے۔ایسے میں لاغر اور ضعیف مسافروں کو خوب دھکے کھانے پڑتے ہیں۔بس وہ اس انسانی ریلے کے سامنے فٹ بال بن کر رہ جاتے ہیں۔انڈین چیک پوسٹ کی طرح یہاں بھی پاکستانی اور ہندوستانی شہریت رکھنے والے مسافروں کی الگ الگ قطاریں لگتی ہیں۔ جگہ کی تنگی اور انسانی سیلاب کی وجہ سے گھٹن کا سا ماحول رہتا ہے۔ میں نے تو توبہ کی کہ آئندہ پاکستان آنے سے پیشتر ہزار بار سوچوں گا یا پھر بس یا ہوائی جہاز سے سفر کروں گا۔

خدا خدا کر کے Emigration سے نمٹے۔ اس کے بعد اُس ہال سے

دوسرے ہال میں سامان کے ساتھ جانا پڑا جہاں پہلے مشین اور پھر انسانی نگاہوں سے سامان کا کسٹم کرانا تھا۔ ہمارے پاس چونکہ کوئی غیر قانونی سامان تھا نہیں اس لئے ان مراحل سے بھی باعزت طریقہ سے گزر گئے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مشین سے سامان کا اسکریننگ (Screening) کرانے کے بعد جب ہم کسٹم حکام کے پاس سامان لے کر آگے بڑھے تو حکام نے پہلے تو اوپر سے نیچے تک ہمارا بغور جائزہ لیا اور پھر مسکراتے ہوئے قدرِ ہمدردانہ لہجے میں بنا سامان کھولے ہمیں آگے بڑھا دیا۔ آگے ''رینجرس'' کی ایک ٹیم بھی سامان کھول کھول کر دیکھ رہی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو انھوں نے بھی ایک طائرانہ نگاہ ہم پر ڈال کر بنا سامان کھولے ہمیں آگے جانے دیا۔ کچھ دور آگے بڑھ کر ہم نے ٹکٹ خریدے اور پھر پلیٹ فارم پر موجود پاکستانی ٹرین میں جا کر بیٹھ گئے۔

پاکستان میں ''رینجرس'' (Rangers)، پولس اور کسٹم کے عملے کی بالترتیب ہلکے ہرے رنگ کی قمیض یا کرتا اور اس پر گہرے ہرے رنگ کی پتلون یا شلوار، سلیٹی رنگ کی قمیض یا کرتا اور اس پر گہرے رنگ کی پتلون یا شلوار اور سفید رنگ کی ڈریس ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب سے ملٹری برسرِ اقتدار آئی ہے [یہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے۔] سب اپنی اپنی Proper ڈریس میں رہتے ہیں جس سے Disciplin کی غمازی ہوتی ہے۔

Disciplin ایک اچھی چیز ہے۔ [اب پاکستان میں بھی جمہوری دور ہے۔]

جب سب مسافروں کا کسٹم ہو گیا اور وہ ٹرین میں آ کر بیٹھ گئے تب کہیں ٹرین لاہور کی سمت پٹریوں پر دوڑی۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہلے ہی سے عزیز و اقارب موجود تھے۔ پہلی بار جب ان سے ملاقات ہوئی تو من میں ایک تلاطم سا برپا ہو گیا اور آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگ گئی۔

لاہور سے ہم دوسری ٹرین سے کراچی کی سمت روانہ ہوئے۔

جب تک ٹرین صوبہ پنجاب کی حدود میں چلتی رہی، ہریالی دکھائی دیتی رہی اس کے بعد صوبہ سندھ میں جیسے جیسے ہم کراچی کے نزدیک ہوتے گئے، ہریالی بھی بتدریج غائب ہوتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کراچی پہنچتے پہنچتے ریت اور گردوغبار سے ہماری صورتیں اتنی بگڑ گئیں کہ خود کو ہی پہچاننا مشکل ہو گیا۔

بالآخر لاہور سے روانہ ہو کر ہم اگلے دن کراچی پہنچے۔ لاہور کی طرح یہاں بھی ریلوے اسٹیشن پر بہت سے صورت آشنا اور نا آشنا عزیز پہلے ہی سے خوش آمدید کہنے کو موجود تھے۔ سب سے بغلگیر ہوا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بار بار رومال کا سہارا لیتا رہا۔ اسٹیشن سے پورا قافلہ بھائی صاحب (نمبرا۔ جن کے ہمراہ میں آیا تھا) کے گھر پہنچا۔ منہ ہاتھ دھو کر فوراً ہی پولس ہیڈ کواٹر جا کر آمد لکھائی۔ پولس ہیڈ کواٹر پر بھی سرکاری عملہ بہت اخلاق سے پیش آیا اور عزت واحترام سے بٹھا کر ضابطے کی کارروائی مکمل کی۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں ملٹری حکومت ہونے سے ''رینجرس'' کا سبھی محکموں میں عمل دخل ہے۔ [یہ ۲۰۰۱ء کی بات ہے۔] اس سے عوام نے راحت کا سانس لیا ہے۔ وگرنہ کہتے ہیں کہ دیگر عملہ کھلے بندوں بھتہ [ہندوستان میں یہ ''سُوِیدھا شُلک'' (آسانی بہم پہنچانے والی فیس) کہلاتا ہے] وصولتا تھا۔ [اب جمہوری دور میں کیا حال ہے، یہ معلوم نہیں۔]

حواشی

(۱) ''سمجھوتہ ایکسپریس'' = یہ دہلی سے لاہور کے درمیان ہفتہ میں دو بار [دہلی سے اٹاری (ہندوستانی علاقے میں) اور واگھہ سے لاہور (پاکستانی علاقے میں)] چلنے والی

ایک دوستانہ ٹرین ہے۔ حال ہی میں چلائی گئی ''تھار ایکسپریس'' (۲) سے پہلے یہ دونوں ممالک کے درمیان چلنے والی واحد ٹرین تھی۔ اس کی شروعات ۲۲ر جولائی ۱۹۷۶ء سے ''شملہ معاہدہ'' میں طے شدہ خطوط پر ہوئی۔ پہلے یہ امرتسر اور لاہور (۴۲ کلومیٹر کا فاصلہ) کے بیچ چلائی گئی تھی لیکن ۱۹۸۰ء کے عشرہ میں پنجاب میں ہوئی بدامنی کے پیشِ نظر انڈین ریلوے نے اس کو امرتسر کی بجائے اٹاری تک کر دیا تھا اور ۱۴ر اپریل ۲۰۰۰ء کو انڈین ریلوے (IR) اور پاکستانی ریلوے (PR) کے درمیان ہوئے معاہدے کی رو سے ۴۲ کلومیٹر کا فاصلہ Revise کر کے تین کلومیٹر کے اندر اندر [اٹاری سے واگھہ] کر دیا گیا۔

شروع میں یہ روزانہ چلتی تھی لیکن ۱۹۹۴ء سے اس کو ہفتہ میں دو بار (Bi-weekly) کر دیا گیا اور پہلے جو rakes اسی دن اس کے ملک کو واپس کر دیے جاتے تھے وہ ۲۰۰۰ء سے اگلے دن واپس کیے جانے لگے۔ اس کے علاوہ، شروع میں ایک ہی rakes دہلی اور لاہور کے درمیان چلائی جاتی تھیں لیکن بعد میں انڈین ریلوے کے rakes واگھہ (پاکستان) اسٹیشن پر اور پاک ریلوے کے rakes اٹاری (ہندوستان) اسٹیشن پر روکے جانے لگے؛ یعنی مسافروں کو ان دونوں اسٹیشنوں پر rakes تبدیل کیے جانے پڑنے لگے۔ ہندوستانی اور پاکستانی rakes اور انجن لگاتار چھ ماہ تک کے عرصے کے لئے alternately استعمال کیے جاتے ہیں۔ ٹرین میں عموماً چار سے آٹھ coaches ہوتے ہیں۔ پاکستانی rakes جن میں Alco DL-543 کلاس ALU20 ڈیزل لوکو (لاہور شیڈ) لگا ہوتا ہے، کا رنگ گہرا سبز ہوتا ہے۔

دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی کی حالت میں کئی بار یہ سروس منقطع بھی کی گئی۔ ایک بار یکم جنوری ۲۰۰۲ء سے ۱۵ر جنوری ۲۰۰۴ء تک جب دہشت گردوں نے ۱۳ر دسمبر ۲۰۰۱ء کو ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملہ کیا۔ دوسری بار احتیاطاً جب ۲۷ر دسمبر ۲۰۰۷ء کو دہشت گردوں نے بے نظیر بھٹو کو قتل کیا اور تیسری بار ۱۹ر فروری ۲۰۰۷ء کو علی الصبح پانی پت کے قریب واقع دیوانہ ریلوے اسٹیشن (ہندوستان) پر دہشت گردوں کے اس میں آگ لگا دینے کے

سبب۔اس سانحہ میں ۱۶۸ افراد (پاکستانی مسافراور ہندوستانی حفاظتی عملے کے افراد) جاں بحق اور سینکڑوں زخمی ہو گئے تھے۔ پہلے تو ہندوستانی خفیہ ایجنسی نے اس کا الزام "SIMI" کے نام پر صفدر ناگوری وغیرہ (مسلمانوں) پر لگایا لیکن بعد میں جب مہاراشٹر ''دہشت گردی مخالف دستے'' (ATS) نے مالیگاؤں بم دھماکوں کے سلسلے میں پرگیہ سنگھ ٹھاکر (سادھوی)، لیفٹیننٹ کرنل شری کانت پروہت اور امرتانند سرسوتی مہاراج وغیرہ کو پکڑ کر ان سے معلومات کیں تو راز فاش ہو چلا تھا کہ اس میں پروہت کا ہاتھ تھا لیکن بدقسمتی سے ۲۶ رنومبر ۲۰۰۸ء کو جب دہشت گردوں نے ممبئی میں ''تاج ہوٹل''، ''اوبرائے ہوٹل'' اور ''نریمن ہاؤس'' وغیرہ پر حملے کیے تو ATS کے اُن افسران جو مالیگاؤں سانحہ کی تفتیش میں ایمانداری سے لگے ہوئے تھے، کو شہید کر دیا گیا۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ ہیمنت کرکرے (ATS چیف) کو مستقل ''ہندو دہشت گرد'' تنظیموں کی جانب سے قتل اور گھر کو اڑا دینے کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔ [مزید تفصیلات ص ۱۲۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔]

(۲) **''تھار ایکسپریس''** = یہ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' کی طرح، لیکن جودھ پور (ہندوستان) اور کراچی (پاکستان) کے درمیان چلنے والی ایک دوستانہ ٹرین ہے۔ اٹاری اور واگھہ کی طرح، موناباؤ (Munabao) اور کھوکھراپار (Khokhrapar) جو آپس میں چھ کلومیٹر فاصلے سے واقع ہیں، بالترتیب ہندوستان اور پاکستان کے علاقوں میں واقع سرحدی ریلوے اسٹیشن ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی انڈو۔پاک جنگ کے دوران بمباری کی وجہ سے یہ track تباہ ہو گیا تھا۔ پھر سے رشتے استوار کرنے کی غرض سے دونوں ممالک کے اربابِ اقتدار نے جو متعدد ذرائع اختیار کیے انھیں میں سے ایک ۴۰ سال بعد ۱۸ رفروری ۲۰۰۶ء سے اس رابطے کا بھی بحال کیا جانا ہے۔

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان زیادہ تر سفر کرنے والوں کا تعلق پاکستان کے کراچی، لاہور اور راولپنڈی، بالخصوص کراچی اور لاہور شہروں سے ہے۔ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' سے لاہور جانا تو بہت آسان ہے۔ [لاہور کے بالکل سرحد پر واقع ہونے کی

وجہ سے] لیکن اس سے کراچی کا سفر بہت تکلیف دہ ہے۔[کراچی کے لاہور سے بہت دور ہونے کی وجہ سے] جب کہ ''تھار ایکسپریس'' سے معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خدا کرے کہ اس کو کسی دہشت گردی کی نظر نہ لگے اور یہ بحال رہے۔ نیز مزید اخوت و بھائی چارے کی علامت بنی رہے۔ (آمین)

کینٹ ریلوے اسٹیشن، کراچی

[۱] جغرافیائی پس منظر

میں چونکہ ایک انجینیر ہوں اس لئے میں نے اُسی زاویے سے کراچی کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ کراچی "12-'45-°24 تا "03-'39-°25 شمالی عرض البلد اور "12-'39-°66 تا "30-'35-°67 مشرقی طول البلد کے درمیان واقع دنیا کا بائیسواں ایک بڑا بین الاقوامی شہر ہے۔ اس کے شمال۔مشرق میں ضلع دادو، مشرق میں ضلع ٹھٹھ، جنوب میں بحیرۂ عرب اور دریائے سندھ کے طاس کی کھاڑیاں (Creeks) واقع ہیں۔

[۲] تاریخی پس منظر

جہاں اس وقت کراچی آباد ہے وہاں کافی پہلے ایک ویرانہ ہوا کرتا تھا اور مچھیروں کی چند جھونپڑیاں تھیں۔ وہ اس کو ڈربو کہتے تھے۔ ڈربو اصل میں درب یا الدرب کا بگڑا ہوا نام ہے۔ درب یا الدرب عربی میں راستے کو کہتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کافی پہلے سے عرب جہاز رانوں کا آنا جانا رہا ہے اور انھوں نے ہی اس کو یہ نام دیا ہوگا۔ اس بستی کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا تالاب تھا جو ایک مچھیرے، کلاچی کے نام پر کلاچی کنوں کہلاتا تھا۔ [کنوں، گہرے گڑھے کو کہتے ہیں۔]

موجودہ کراچی بندرگاہ سے تقریباً چالیس کلومیٹر مغرب میں، حب ندی کے دہانے پر، بحرالعرب میں سترہویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں کھڑک بندرگاہ کے نام سے ایک اہم بندرگاہ تھا۔ ۴۲_۱۱۴۱ھ (۲۹_۱۷۲۸ء) میں جب تیز بارش، طوفانی ہواؤں اور سمندری موجوں کے سبب اس بندرگاہ کا دہانہ ریت سے پٹ گیا تو اُس پر آباد لوگوں نے مذکورہ بالا قدرتی بندرگاہ کو اپنا مسکن بنا لیا اور اُس کو کلاچی

جو گوٹھ کے نام سے پکارنے لگے۔ اس طرح موجودہ کراچی بندرگاہ کا سنگِ بنیاد ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) میں رکھا گیا۔

مچھیروں کی اس چھوٹی سی بستی نے آگے چل کر بہت سے تاریخی، سیاسی اور اقتصادی بحران دیکھے۔ کبھی اس پر کلہوڑوں کا قبضہ رہا جن کا سلسلۂ نسب کہتے ہیں کہ عباسیوں سے ملتا تھا اور جن کا حکمران نہایت منصف مزاج اور شریعت اسلامیہ کا پابند تھا۔ اس کے بعد ''خان آف قلات'' کی حکمرانی رہی لیکن جلد ہی ''تالپوروں'' (بلوچیوں) نے اس پر قبضہ کرلیا ۱۲۱۰ھ (۱۷۹۵ء) سے ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) تک یہ ''تالپوروں'' کے قبضہ میں رہا۔

''میران تالپور'' کے زمانہ میں اس بستی نے خوب ترقی کی۔ انھوں نے منوڑا جزیرے پر ایک قلعہ تعمیر کرایا اور اس کی فصیلوں پر توپیں نصب کرائیں۔ بعد میں بندرگاہ کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہ ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کی نگاہوں میں آگیا۔ چنانچہ ''کمپنی'' نے ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) اور پھر ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں ''میران سندھ'' سے مختلف معاہدے کیے جو بظاہر دوستانہ اور درپردہ معاندانہ تھے۔ ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) میں جب مہاراجہ رنجیت سنگھ [تفصیل لاہور کے باب میں ملاحظہ فرمائیں۔] نے سندھ پر حملہ کیا تو ''میران سندھ'' نے کمپنی سے مدد طلب کی۔ کمپنی پہلے ہی سے موقع کی تلاش میں تھی۔ غرضیکہ ۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں دونوں کے مابین ایک معاہدہ ہوگیا جس کی رو سے کمپنی کو حیدرآباد (سندھ) میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ بعد میں، ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں کراچی اور ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں سندھ پر بھی کمپنی کا قبضہ ہوگیا۔ اُس نے سندھ کا صدر مقام حیدرآباد سے کراچی منتقل کرتے ہوئے سندھ کو بمبئی پریسیڈینسی کا حصہ بنا دیا۔ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) میں سندھ کو کمشنری کا درجہ دے دیا گیا لیکن اس کو صوبہ بمبئی کے ہی تحت رکھا گیا۔ ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۶ء) میں سندھ کو الگ ایک صوبہ کا درجہ دیتے ہوئے

اسے بمبئی سے الگ کر دیا گیا۔ اس کے بعد کراچی آزادی ملنے تک کئی ادوار سے گزرا۔ آزادی سے پہلے کے کراچی کو موٹے طور پر مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:—

ا۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے کی آبادی والا علاقہ اور اُس سے ملحق وہ علاقہ جو انگریزوں کی آمد کے بعد آباد ہوا۔ اُن علاقوں میں گھنی آبادی، تنگ گلیاں اور Wholesale مارکیٹ تھی۔ ان میں کافی تعداد میں مساجد، مندر اور دھرم شالائیں بھی تھیں۔

۲۔ صدر بازار، جو انگریزوں کے لئے خرید وفروخت کا مرکز تھا۔ اس علاقے میں پارسیوں اور یورپین کی آبادی اور تجارت تھی۔ اس میں سڑکیں عمدہ اور کشادہ تھیں۔ بازار میں چرچ، مشنری اسکول اور دیگر اہم عمارتیں تھیں جن کے مالک یورپین تھے۔

صدر بازار کے جنوب۔ مشرق میں سول لائن اور ملٹری چھاؤنی کا علاقہ تھا جہاں انگریزوں کے کلب اور ان کے رہائشی مکانات واقع تھے۔

۳۔ مندرجہ بالا دونوں علاقوں کے درمیان میں واقع وہ علاقہ جس میں انتظامی امور سے متعلق عمارتیں اور اسکول وغیرہ تھے۔

۴۔ لیاری اور دوسرا وہ علاقہ جس میں Working Class رہتی تھی۔

اُس وقت کراچی کی آبادی ۵۰،۰۰۰ء۴ تھی جن میں سے ۶۱٫۲ فی صد سندھی بولنے والے اور ۶٫۳ فی صدی ہندی یا اردو بولنے والے رہتے تھے۔ اُن میں ہندوؤں کی تعداد ۵۱ فی صدی اور مسلمانوں کی تعداد ۴۲ فی صدی تھی۔

کراچی شہر کے مغربی حصہ میں زمین کے ایسے متعدد بڑے بڑے قطعات تھے جن پر نمک کی موٹی تہہ بچھی ہوئی تھی۔ کراچی کے شہری اس نمک کو اکٹھا کر کے نہ صرف اپنی ضروریات پوری کرتے تھے بلکہ اُسے دوسرے شہروں کو بھی بھیجتے تھے۔

نمک کے علاوہ کراچی بندرگاہ سے تیل کے بیج، غلہ، کپاس، اُون بھی Export ہوتی تھی اور بنی بنائی مصنوعات کراچی کی بندرگاہ پر اترتی تھیں۔ ان میں دھاتیں، ریشم اور شکر وغیرہ شامل تھیں۔

[۳] ترقیاتی پس منظر

ترقیاتی کاموں (Developmental Works) کا Rate of Population Growth، سیاسی استحکام اور معیشت سے سیدھا تعلق ہوتا ہے۔ پہلے Factor، یعنی Rate of Population Growth کے بارے میں جو آگے تفصیل دی گئی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مختلف وجوہات سے کراچی میں بہت زیادہ رہا ہے۔ سیاسی استحکام اور معیشت کے بارے میں سب کو علم ہے ہی۔ لہٰذا ان پر تبصرہ کرنا میں غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ پاکستان میں وقتاً فوقتاً فوجی انقلابات آتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں بہت جلدی جلدی حکومتیں بدلتی رہی ہیں جن کا ترقیاتی کاموں پر اثر پڑنا فطری بات ہے۔ دراصل ہر شخص، ہر گروپ کا اپنا ایک الگ نظریہ، نقطۂ نظر یا منصوبہ ہوتا ہے۔ اگر کسی کو اپنے منصوبے کو مکمل کرنے کے لئے مناسب عرصہ نہ ملے تو اس کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ کراچی کے بارے میں بھی ہوا۔ کراچی کے حق میں کون سا دور کیسا رہا، اس کا تجزیہ کر لینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آزادی کے بعد کراچی کو Develop کرنے کی سب سے پہلی کوشش ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۲ء) میں کی گئی۔ اس سلسلے میں ایک "سویڈش" (Swedish) کمپنی نے ایک پلان تیار کیا۔ اس کے مطابق مرکزی سیکریٹریٹ، ریلوے نظام، Legislative عمارات، ایک یونیورسٹی، مہاجرین کی آبادکاری کے لئے لیاری ندی کے کنارے دس منزلہ

عمارتوں وغیرہ کا منصوبہ تیار کیا گیا لیکن ۱۳۷۳ھ (۱۹۵۳ء) میں طلباء کا ہنگامہ ہوا جس کی وجہ سے محض ایک سال میں ہی حکومت گر گئی اور اس طرح یہ منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

۱۳۷۸ھ (۱۹۵۸ء) سے ۱۳۸۹ھ (۱۹۶۹ء) کے دوران ایک فوجی انقلاب کے ذریعہ جرنیل ایوب خاں برسر اقتدار رہے۔ انھوں نے سپریم کورٹ، مرکزی پارلیمنٹ، سفارت خانے اور دوسرے مرکزی دفاتر کراچی سے اسلام آباد (۱) منتقل کرتے ہوئے کراچی کی بجائے اسلام آباد کو پاکستان کا دارالخلافہ بنادیا، اور اس طرح کراچی محض صوبۂ سندھ کا ہی صدر مقام ہوکر رہ گیا۔ انھوں نے ایک ''گریک'' پلانر کے ذریعہ "Greater Karachi Resettlement Plan" تیار کرایا جس کے لحاظ سے دو "Setellite Towns" Develop کرنے تھے؛ ایک لانڈھی۔ کورنگی، شہر کے مشرق میں اور دوسرا نیو کراچی، شہر کے شمال میں۔ یہ شہر سے ۲۵ کلومیٹر فاصلہ پر تھے۔ یہ منصوبہ بھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا اور بالآخر ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴ء) میں اس کو ترک کرنا پڑا۔

ایوب خاں کے دورِ حکومت سے پہلے کراچی میں تمام Transport Companies پر سندھیوں، بلوچیوں اور مہاجرین کی اجارہ داری تھی۔ بڑے بڑے سرکاری Projects کا ٹھیکہ بھی سندھیوں اور بلوچیوں کے ہی پاس تھا۔ ایوب خاں نے اپنے دور میں صوبہ سرحد کے پٹھانوں کو زیادہ اہمیت دی۔ نتیجتاً باہمی Ethnic چپقلش کو بڑھاوا ملا۔ اس کے علاوہ ایوب خاں نے جب National Language، جو اردو تھی، کے حق میں سندھی پریس اور Publications کو بند کرانا شروع کیا تو اردو بولنے والوں نے اُس کی تائید وحمایت کی۔ اس سے پورا سندھ اردو بولنے والے اور سندھی بولنے والے، دو خیموں میں منقسم ہوکر رہ گیا۔

جرنیل ایوب خاں کے بعد، ۱۳۸۹ھ (۱۹۶۹ء) (۳) میں جرنیل یحییٰ خاں برسر

اقتدار آئے۔ موصوف کے کارناموں کے بارے میں تو آج کل (۲۰۰۱ء میں) پاکستانی اخبارات میں کافی تفصیلات آرہی ہیں۔ اخبارات میں شائع اطلاعات کے مطابق ان کو تو ''تھری ڈبلیو'' سے ہی فرصت نہیں تھی۔ [واللہ عالم بالصواب] اگر یہ صحیح ہے، تو ایک اسلامی مملکت کا سربراہ اور اس کا یہ کردار، سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

۱۳۹۱ھ (۱۹۷۱ء) سے ۱۳۹۸ھ (۱۹۷۷ء) تک جناب ذوالفقار علی بھٹو برسرِ اقتدار رہے۔ انھوں نے خود کو ایک طرف تو کچی آبادی کے مکینوں کے مسیحا کے روپ میں پیش کیا اور دوسری جانب سندھی بولنے والے Masses کے حق میں سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں کوٹا سسٹم رائج کیا۔ اس سے اردو بولنے والوں (مہاجرین) اور سندھی بولنے والوں کے بیچ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوگئی۔ اس کے علاوہ اس نے Gulf States کو کراچی کی طرف راغب کرنے کی غرض سے کراچی میں ''ریس کورس''، ''فائیو اسٹار ہوٹلس''، ''کیبریٹس'' (Cabarets) اور ''کیسینوز'' (Casinos) وغیرہ کا منصوبہ تیار کرایا اور ان میں سے کچھ پر عمل درآمد بھی کرایا گیا۔ اُس نے Building-by-Laws میں بھی ترمیمات کرائیں جس سے مکانات کی اونچائی اور Covered Area میں مزید اضافہ کیا جاسکے۔ اس سے ''فلیٹ کلچر'' نے جنم لیا اور آبادی میں Congestion بڑھا۔ ساتھ ہی Horizontal کی بجائے Vertical Development کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انھیں کے دورِ حکومت میں پاکستانی مزدوروں، Professionals اور Entrepreneurs کو گلف اسٹیٹس میں جانے کا بڑھاوا ملا جنھوں نے جب اپنا سرمایہ پاکستان بھیجا تو اُن کے لواحقین نے اس کو زیادہ تر مکانات تعمیر کرنے پر خرچ کیا یہاں تک کہ کھلی جگہوں پر بھی قبضے کر لئے گئے۔ صدر بازار سے ملحق علاقوں میں جو مکانات گرادئے گئے تھے ان کی بھی پھر سے تعمیر ہوگئی۔

۱۳۹۶ھ (۱۹۷۸ء) سے ۱۴۰۹ھ (۱۹۸۸ء) تک ایک فوجی انقلاب کے

ذریعہ جرنیل ضیاء الحق برسرِ اقتدار رہے۔ ان کے دور میں افغانستان میں خانہ جنگی کی وجہ سے کراچی میں سستے داموں اسلحہ اور منشیات کا دھندہ خوب پنپا اور کچی آبادی میں مزید اضافہ ہوا۔ ۱۴۰۸ھ (۱۹۸۷ء) سے ۱۴۱۸ھ (۱۹۹۷ء) کے عرصہ میں ایم۔ کیو۔ ایم (مہاجر قومی موومینٹ) ایک زبردست طاقت کی شکل میں برسرِ اقتدار رہی۔ اسی عرصہ میں سیاسی نقطۂ نگاہ سے سرکاری محکموں میں ملازمتیں، ٹھیکے، Consultancies، تعلیمی اداروں میں داخلے اور تجارتی پرمٹ جاری کیے گئے۔ سرکاری سیکٹر میں ہزاروں کی تعداد میں بنا ضرورت بھرتیاں کی گئیں، مثلاً: "Karachi Water & Sewerage Board" (KWSB) جہاں محض ۶،۰۰۰ عملہ کی ضرورت تھی میں ۱۴،۵۰۰ کا عملہ رکھا گیا۔ یہی حالت "Karachi Municipal Corporation" (KMC) اور ''پاکستان اسٹیل ملس'' کی بھی رہی۔ نیتجتاً ادارے دیوالیہ پن کے دہانے تک پہنچ گئے۔ "MQM" کے غلبے (Domination) کا سندھیوں، پٹھانوں، پنجابیوں اور بلوچیوں پر یہ اثر پڑا کہ الیکشن میں جہاں مہاجرین نے "MQM" کو ووٹ دیئے وہیں سندھیوں اور بلوچیوں نے ''پاکستان پیوپلس پارٹی'' (PPP) کو، پختونوں نے ''عوامی نیشنل پارٹی'' (ANP) کو اور پنجابیوں نے ''مسلم لیگ'' کو ووٹ دیئے۔ اس سے باہمی اعتماد کی فضا کو ٹھیس پہنچی اور Ethnic دوریاں بڑھیں۔ بعد میں "MQM" بھی دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی اور پھر اقتدار کی رسّہ کشی میں دونوں کے درمیان خوب جم کر خوں ریز تصادم ہوئے۔ منشیات اور غیر قانونی اسلحہ نے اس آگ میں گھی کا کام کیا۔

۱۳۹۵ھ (۱۹۷۵ء) سے ۱۴۰۶ھ (۱۹۸۵ء) کے عرصہ سے متعلق "Karachi Master Plan" کی میعاد کے خاتمہ کے بعد ''کراچی ڈیولپمینٹ اتھارٹی'' (KDA) نے UNDP کی مدد سے "Karachi Develop Plan 2000" شروع کیا جو ۱۴۱۱ھ (۱۹۹۰ء) میں اختتام پذیر ہوجانا تھا لیکن اس کا بھی سابقہ

دیگر Plans جیسا ہی حشر ہوا۔ یہاں یہ قابلِ ذکر ہے کہ ہمارے یہاں ہندوستان میں ''ٹیکنو کریٹس'' (Technocrates) کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کو انتظامیہ کے مقابلے میں کم تر درجہ کا Treat کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک تحصیل دار بھی خود کو ایک اسسٹینٹ انجینیر (Assistant Engineer)، حتیٰ کہ ایگزیکیٹیو انجینیر (Executive Engineer) اور چیف میڈیکل آفیسر سے Superior سمجھتا ہے اور اپنی سی کوشش کرتا ہے کہ یہ افسران اس کی میٹنگ میں حصہ لیں۔ ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ (جو کلکٹر کہلانا کسرِ شان سمجھتا ہے) Technical Matters میں بھی ایک لیکھپال (پٹواری) کی رپورٹ کو Qualified Technical Hands کی رپورٹ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ (۲) غرضیکہ یہ پتہ نہیں چل پاتا کہ مختلف محکموں میں کون سا افسر کس کے برابر ہے۔ پاکستان میں سب کے Grades مقرر کئے ہوئے ہیں اور میٹنگ بلاتے وقت اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ یہ کارنامہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کا تھا۔ اس سے ''ٹیکنو کریٹس'' کی ذہنی الجھنوں کا کسی حد تک ازالہ ہو جاتا ہے۔ کاش کہ ہمارے ملک میں بھی یہ دستور رائج ہو جائے۔ اچھائی کسی کی ملکیت نہیں ہوتی، جو بھی اس کو اپنا لے اسی کی ہوتی ہے۔

حواشی

(۱) **اسلام آباد** = یہ پاکستانی ساحلِ سمندر سے تقریباً ۱۲۰۰ کلو میٹر اندر کو، راولپنڈی شہر سے ملحق، ملک (پاکستان) کے شمالی حصے میں واقع "Potohar Plateau" پر نیز خوشنما ''مارگلا'' (Margalla) پہاڑیوں کے درمیان واقع ایک Well Planned، موڈرن اور نہایت خوبصورت شہر ہے جس کا تعمیراتی کام ۱۹۶۰ء سے شروع کیا گیا۔ اس کا ماسٹر پلان ایک گریک Architect فرم، "Doxiadis Associates" نے تیار

کیا تھا۔ یہ آٹھ Zones میں منقسم ہے، جیسے: سفارتی (Diplomatic) انکلیو، تجارتی (Commercial) زون، تعلیمی (Educational) سیکٹر، صنعتی (Industrial) سیکٹر وغیرہ وغیرہ۔

اس کی پلاننگ اور تعمیراتی کام جنرل ایوب خاں کے دورِ حکومت میں ہوا۔ وہ ہی کراچی سے پہلے راولپنڈی اور پھر یہاں دارالخلافہ لائے جس کی وجہ کراچی کے ساحلِ سمندر پر واقع ہونے کے سبب اس کے دشمن کے جہازی بیڑے کی زد میں رہنے کی رہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ راولپنڈی، جو آرمی کا جنرل ہیڈ کواٹر ہے، سے ملحق بھی ہے اور اسی سبب دونوں شہروں کو Twin Cities کہا جاتا ہے۔

(۲) ایک لطیفہ یاد آیا۔ ۱۹۹۲ء میں میں دیوریا میں تعینات تھا۔ اس سال موسمِ باراں میں بھی بارش نہیں ہوئی اور سخت سوکھا پڑ گیا۔ ایک دن صبح کو سوکھے سے متعلق میٹنگ ہونی تھی لیکن اچانک اس رات بارش ہوگئی جس سے وہ میٹنگ سوکھے سے باڑھ (سیلاب) میں تبدیل ہوگئی۔ میٹنگ کے دوران ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھ سے پوچھا کہ انجینیر صاحب! رات کتنی بارش ہوئی؟۔ میں نے بتا دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک صاحب جو میرے ہی پاس بیٹھے ہوئے تھے، کھڑے ہوئے اور انھوں نے مجھ سے اختلاف کرتے ہوئے دوسری figure بتائی۔ اس پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے قدرِ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب دیکھا۔ میں ان صاحب کو نہیں جانتا تھا۔ جب میں نے ان صاحب سے پوچھا تو پتہ چلا کہ وہ تحصیلدار ہیں۔ اب تو میرے تعجب اور غصّے کی کوئی انتہا نہ رہی [ایک ٹیکنیکل معاملہ میں بے جا مداخلت پر]۔ میں نے ان سے سوال کیا ''آپ نے جو figure بتائی ہے، وہ کس Rain gauge اسٹیشن کی ہے؟'' انھوں نے چونک کر پوچھا ''یہ Rain gauge اسٹیشن کیا ہوتا ہے؟'' میں معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ قدرِ چٹکی لیتے ہوئے میں نے پھر سوال کیا ''آپ نے یہ کیسے پتہ لگالیا کہ کتنی بارش ہوئی ہے؟'' اس پر وہ کچھ اس انداز سے مسکرائے گویا میں نے کوئی بچکانہ یا احمقانہ سوال ان سے کرلیا ہو۔ انھوں نے بہت لاپرواہی سے جواب دیا ''اس میں کیا پریشانی ہے؛ ہماری تحصیل میں ایک مٹکا رکھا ہوا ہے، جب بارش ہوئی تو پانی اس میں بھی گرا۔ ہم نے سامنے، ایک دودھ والے کی دوکان سے

نپانا منگا کر مٹکے کا پانی ناپ لیا؛ بس پتہ چل گیا کہ کتنی بارش ہوئی ہے۔‘‘ میں نے فوراً جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا دھیان تحصیلدار کے بیان کی طرف دلایا تو پورا ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ [اس واقعے کے بعد سے ڈی۔ایم مجھ سے اس قدر احتیاط برتنے لگے تھے کہ ایک بار جب میں ۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۶ء کے عرصے میں مراد آباد پوسٹیڈ تھا تو غالباً 1995ء میں ان سے بریلی میں Agriculture Production Commissioner (A.P.C) کی میٹنگ میں اچانک ملاقات ہوگئی۔ ہیلو، ہیلو کے بعد انھوں نے پوچھا کہ انجینیر صاحب! آج کل کہاں پوسٹیڈ ہیں؟ میں نے جواب دیا ’’مراد آباد‘‘، چونک کر بولے ’’بھائی جان! میں بھی اسسٹنٹ کمشنر ہو کر مراد آباد آ گیا ہوں تھوڑی مہربانی رکھنا۔‘‘]

(۳)۔ پاکستان کے صدور اور وزرائے اعظم کی تفصیلات

صدور

۱۔اسکندر مرزا ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸
۲۔محمد ایوب خاں ۲۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹
۳۔آغا محمد یحیٰ خان ۲۵ر مارچ ۱۹۶۹ ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱
۴۔ذوالفقار علی بھٹو ۲۰ر دسمبر ۱۹۷۱ ۱۳ر اگست ۱۹۷۳
۵۔فضل الٰہی چودھری ۱۳ر اگست ۱۹۷۳ ۱۶ر ستمبر ۱۹۷۸
۶۔جنرل محمد ضیاء الحق ۱۶ر ستمبر ۱۹۷۸ ۱۷ر اگست ۱۹۸۸
۷۔غلام اسحاق خان ۱۷ر اگست ۱۹۸۸ ۱۸ر جولائی ۱۹۹۳
۸۔وسیم سجاد (کارگزار) ۱۸ر جولائی ۱۹۹۳ ۱۴ر نومبر ۱۹۹۳
۹۔فاروق احمد لغاری ۱۴ر نومبر ۱۹۹۳ ۲ر دسمبر ۱۹۹۷
۱۰۔وسیم سجاد (کارگزار) ۲ر دسمبر ۱۹۹۷ یکم جنوری ۱۹۹۸
۱۱۔محمد رفیق تارڑ یکم جنوری ۱۹۹۸ ۲۰ر جون ۲۰۰۱
۱۲۔جنرل پرویز مشرف ۲۰ر جون ۲۰۰۱ ۱۸ر اگست ۲۰۰۸
۱۳۔محمد میاں سومرو (کارگزار) ۱۸ر اگست ۲۰۰۸ ۹ر ستمبر ۲۰۰۸
۱۴۔آصف علی زرداری ۹ر ستمبر ۲۰۰۸ دمِ تحریر

وزرائے اعظم

۱۔لیاقت علی خان ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۵۱
۲۔خواجہ ناظم الدین ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۱ ۱۷ر اپریل ۱۹۵۳
۳۔محمد علی بوگرا ۱۷ر اپریل ۱۹۵۳ ۱۲ر اگست ۱۹۵۵
۴۔چودھری محمد علی ۱۲ر اگست ۱۹۵۵ ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۶
۵۔حسین شہید سہروردی ۱۲ر ستمبر ۱۹۵۶ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۷
۶۔ابراہیم اسماعیل چندریگر ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۷ ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۷
۷۔سر فیروز خاں نون ۱۶ر دسمبر ۱۹۵۷ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۸
۸۔محمد ایوب خاں ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ ۲۸ر اکتوبر ۱۹۵۸
۹۔نورالامین ۷ر دسمبر ۱۹۷۱ ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱
۱۰۔ذوالفقار علی بھٹو ۱۴ر اگست ۱۹۷۳ ۵ر جولائی ۱۹۷۷
۱۱۔محمد خان جونیجو ۲۴ر مارچ ۱۹۸۵ ۲۹ر مئی ۱۹۸۸
۱۲۔بینظیر بھٹو ۲ر دسمبر ۱۹۸۸ ۶ر اگست ۱۹۹۰
۱۳۔غلام مصطفیٰ جتوئی ۶ر اگست ۱۹۹۰ ۶ر نومبر ۱۹۹۰
۱۴۔نواز شریف ۶ر نومبر ۱۹۹۰ ۱۸ر اپریل ۱۹۹۹
۱۵۔بلخ شیر مزاری (کارگزار) ۱۸ر اپریل ۱۹۹۹ ۲۶ر مئی ۱۹۹۳
۱۶۔نواز شریف ۲۷ [illegible] ۱۹۹ ۱۸ر جولائی ۱۹۹۳
۱۷۔معین الدین قریشی (کا) ۱۸ر جولائی ۱۹۹۳ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۹۳
۱۸۔بینظیر بھٹو ۱۹ر اکتوبر ۱۹۹۳ ۵ر نومبر ۱۹۹۶
۱۹۔ملک معراج خالد (کا) ۵ر نومبر ۱۹۹۶ ۱۷ر فروری ۱۹۹۷
۲۰۔نواز شریف ۱۷ر فروری ۱۹۹۷ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۹۹
۲۱۔ظفر اللہ خان جمالی ۲۱ر نومبر ۱۹۹۹ ۲۶ر جون ۲۰۰۴
۲۲۔چودھری شجاعت حسین ۳۰ر جون ۲۰۰۴ ۲۰ر اگست ۲۰۰۴
۲۳۔شوکت عزیز ۲۰ر اگست ۲۰۰۴ ۱۶ر نومبر ۲۰۰۷
۲۴۔محمد میاں سومرو (کا) ۱۶ر نومبر ۲۰۰۷ ۲۵ر مارچ ۲۰۰۸
۲۵۔یوسف رضا گیلانی ۲۵ر مارچ ۲۰۰۸ دمِ تحریر

ترقیاتی کاموں کے مختلف ادوار میں جائزے کے بعد کراچی میں دستیاب دیگر سہولتوں؛ جیسے: آبادکاری (Housing)، Electric Supply, Sewerage System, اور Water Supply System، ذرائع نقل و حمل (Transportation) نیز نظم ونسق (Law & Order) وغیرہ وغیرہ پر بھی ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

[۴] آبادکاری (Housing)

کراچی کو ہمیشہ سے ہی مناسب آبادکاری کا مسئلہ درپیش رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کے بندرگاہ کی اہمیت کے پیشِ نظر نیز اندرون اور بیرونِ ملک سے مہاجرین کی یلغار کے سبب تیزی سے بڑھتی ہوئی مردم شماری رہی ہے۔ اس حقیقت پر مندرجہ ذیل اعداد وشمار سے بخوبی روشنی پڑ جاتی ہے:—

۱۲۵۴ھ (۱۸۳۸ء) میں کُل مردم شماری ۱۴،۰۰۰ تھی۔
۱۲۶۷ھ (۱۸۵۰ء) میں کُل مردم شماری ۱۶،۷۷۳ تھی۔
۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) میں کُل مردم شماری ۵۷،۰۰۰ تھی۔
۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء) میں کُل مردم شماری ۷۳،۰۵۶ تھی۔

۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) سے ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) کے بیچ آبادی کے بڑھنے کی وجہ کراچی سے پنجاب تک ریلوے لائن کا پورا ہونا اور نتیجتاً اندرونی علاقوں سے مال کا کراچی بندرگاہ پر آنا رہا۔ ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۰ء) سے ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) کے دوران کراچی بندرگاہ پر جو شراب اتری اس کی مقدار ۶۸،۱۳۰ گیلن تھی جو

۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء) میں بڑھ کر چار لاکھ گیلن ہوگئی۔ اس کے علاوہ ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) سے ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) کے بیچ پنجاب اور سندھ میں نہری نظام کے پورا ہوجانے سے Exportable اجناس کی پیداوار میں اضافہ ہوا اور نتیجتاً زیادہ مال بندرگاہ پر پہنچا۔

۱۳۶۰ھ (۱۹۴۱ء) میں کُل مردم شماری ۴،۳۵،۸۸۷ تھی۔

آزادی سے پہلے، ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) میں کُل مردم شماری ۵،۰۰،۰۰۰ تھی۔

سندھی بولنے والوں کی تعداد ۶۱ء۲ فی صد اور اردو یا ہندی بولنے والوں کی تعداد ۶ء۳ فی صدی تھی۔ اس کے علاوہ ہندو ۵۱ فیصد اور مسلمان ۴۲ فیصدی تھے۔

۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) میں کُل مردم شماری ۱۱،۳۷،۰۰۰ تھی۔

ہندوستان سے تقریباً ۶،۰۰،۰۰۰ مہاجرین کے ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) کے بعد کراچی آجانے سے، سندھی بولنے والوں کی تعداد گھٹ کر ۸،۶ فی صد اور اردو بالنے والوں کی تعداد بڑھ کر ۵۰ فی صد ہوگئی۔ اس کے علاوہ مسلمان بڑھ کو ۹۶ فی صد اور ہندو گھٹ کر ۲ فی صد رہ گئے۔

۱۳۸۱ھ (۱۹۶۱ء) میں کُل مردم شماری ۲۰،۰۰،۰۰۰ تھی۔

۱۳۹۲ھ (۱۹۷۲ء) سے ۱۴۰۸ھ (۱۹۸۷ء) کے عرصہ میں جو اعداد شمار جمع کیے گئے اس کے مطابق آبادی ۳ء۶ ملین سے بڑھ کر ۴ء۷ ملین ہوگئی جس کی وجہ سے اندرونی

علاقوں سے نقلِ مکانی کے علاوہ ۳،۵۰،۰۰۰ بنگلہ دیش سے، ۳،۰۰،۰۰۰ ایران اور افغانستان سے مہاجرین کا کراچی میں آ کر آباد ہونا تھا۔ ان کے علاوہ بنگلہ دیش، سری لنکا، برما، فلپائن سے غیر قانونی تارکینِ وطن بھی آئے جن کی تعداد تقریباً ۲،۰۰،۰۰۰ تھی۔

۱۴۰۲ھ (۱۹۸۱ء) کے Census کے مطابق اردو بولنے والوں کی تعداد مزید بڑھ کر ۴۳،۴ فی صد، پنجابی بولنے والوں کی تعداد ۷،۸ فی صد، سندھی بولنے والوں کی تعداد ۶،۳ فی صد اور بلوچی بولنے والوں کی تعداد ۴،۴ فی صد ہوگئی۔

۱۴۱۹ھ (۱۹۹۸ء) میں کل مردم شماری ۹۸،۰۲،۱۳۴ تھی۔

موجودہ کل مردم شماری ۱،۲۵،۰۰،۰۰۰ کم و بیش ہے۔

پاکستان کا قیام عمل میں آنے پر ہندوستان سے ایک کثیر تعداد میں مہاجرین کے سیلاب کی وجہ سے کراچی میں آبادکاری کا ایک زبردست مسئلہ (۱) پیدا ہو گیا تھا۔ کچی آبادیاں قائم ہوگئیں تھیں، سڑکیں تنگ ہوگئیں تھیں نیز پارکوں کے اطراف اور کھیل کے میدانوں میں بھی جھونپڑیاں نظر آنے لگیں تھیں۔ اس پیچیدہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے حکومت نے اپنے محدود وسائل کے باوجود اور دیگر صاحب استطاعت نجی شعبوں نے بھی ان کی آبادکاری کے سلسلے میں کئی اقدامات کئے۔ اورنگ آباد، لیاقت آباد، ڈرگ کالونی، ملیر کالونی، لانڈھی کالونی، کورنگی کالونی، نارتھ ناظم آباد اور اورنگی کالونی وغیرہ متعدد کالونیاں وجود میں آئیں۔ ان میں سے اورنگ آباد ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) میں، لیاقت آباد ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۲ء) میں، ڈرگ کالونی ۱۳۷۴ھ (۱۹۵۴ء) میں، ملیر کالونی

۱۳۷۵ھ (۱۹۵۵ء) میں، لانڈھی کالونی اور کورنگی کالونی ۱۳۷۵ھ (۱۹۵۵ء) میں، نارتھ کراچی اور اورنگی کالونی ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں اور بلدیہ کالونی ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۸ء) میں وجود میں آئیں۔ یہ سب مہاجرین کالونیاں ہیں۔ ان کے علاوہ دلکشا ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۲ء) میں، تیموریہ (نارتھ ناظم آباد) ۱۳۷۳ھ (۱۹۵۳ء) میں، الہلال، چاندنی چوک ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں، منصورہ (فیڈرل بی ایریا) ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۰ء) میں، قصبہ ٹاؤن ۱۳۸۲ھ (۱۹۶۲ء) میں، کہکشاں (کلفٹن) اور گلشن اقبال ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴ء) میں اور گلستانِ جوہر ۱۳۹۹ھ (۱۹۷۸ء) میں منظور ہوئیں۔ یہ متوسط طبقہ سے اعلیٰ طبقہ تک کے لئے منظور کی گئی تھیں جب کہ غریب طبقہ کے لئے سرجان اسکیم و دیگر اسکیمیں تیار کی گئی تھیں۔

کراچی میں رہ رہے ہر خاندان کی ابھی تک مناسب آبادکاری نہیں ہوسکی ہے۔ ۱۴۲۱ھ (۲۰۰۰ء) میں تقریباً ستر لاکھ انسان کچی آبادی میں رہ رہے تھے جو کل آبادی کا تقریبا ۵۶ فی صد ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا شمار ایشیا کی دوسری سب سے بڑی کچی آبادی میں سے ہوتا ہے۔ ویسے مسلسل "فلیٹس" کے نئے "بلاکس" کی تعمیر کا کام جاری ہے اور آہستہ آہستہ کراچی کنکریٹ کے ایک جنگل میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ جس سے اس کی Climatic Conditions بھی متاثر ہو رہی ہیں۔ سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے اس کی آب و ہوا مرطوب تھی لیکن کہتے ہیں کہ اب دن میں زیادہ گرمی کا احساس ہونے لگا ہے حالانکہ رات کو اب بھی ٹھنڈی ہوا چلنے سے موسم قدرِ خوشگوار ہو جاتا ہے۔

پہلے کبھی کراچی میں گھر کی دیواریں مٹی اور لکڑی کی اور چھتیں چٹائی، لکڑی اور مٹی کی بنائی جاتی تھیں۔ گھروں میں روشن دان کا معقول انتظام رکھا جاتا تھا لیکن اب یہ طرزِ تعمیر گو شہر میں تو موجود نہیں ہے، البتہ کہتے ہیں کہ گردونواح کے دیہاتوں میں ابھی بھی

ایسے مکانات موجود ہیں۔ اب تمام مکانات (.Cement Concrete (C.C
اور (.Re-inforced Cement Concrete (R.C.C کے بنائے جاتے
ہیں۔ اینٹوں کی جگہ C.C. Blocks استعمال کئے جاتے ہیں کیوں کہ وہاں کی مٹی
اینٹوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ [اچھی اینٹوں کے لئے مناسب مٹی جس میں Clay،
Sand اور Loam ایک خاص ratio میں ہوں بہت ضروری ہے۔ Clay کی مقدار
زیادہ ہونے سے اینٹوں میں Shrinkage، Cracking اور Warping ہوگی
اور Sand کی مقدار زیادہ ہونے سے وہ اسی قدر Brittle اور جھانوا ہو جائیں گی۔ اس
لئے Clay کی مقدار ۱۰ سے ۲۰ فیصد کے درمیان ہونی چاہیے۔ زیادہ پانی سے بھی اینٹیں
Brittle ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ مٹی ایسے علاقے کی نہ ہو جہاں کا پانی Salty ہو۔]
تعمیرات کے لئے ریت ملیر ندی سے حاصل کیا جاتا ہے جو Coarse ہوتا ہے۔ Low
income group اور middle class کے مکانات کی چھتیں Pre-casted
R.C.C. Slabs کی بھی بنی ہوئی ہیں جو Pre-casted and
pre-stressed beams پر رکھی جاتی ہیں۔ جگہ جگہ ایسے Slabs اور
Beams اور Blocks بنائے اور فروخت کئے جاتے ہیں۔

"کراچی میونسپل کارپوریشن بلڈنگ بائی لاز" کے مطابق ۴۵ فٹ سے زائد
اونچائی یا پانچ منزل سے زائد منزلہ عمارت میں لفٹ کا لگانا لازمی ہے اس لئے زیادہ تر
"بلاکس" پانچ منزل تک ہی بنائے جا رہے ہیں کیوں کہ عمارت میں لفٹ لگانے سے
تعمیراتی لاگت زیادہ ہو جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ کراچی میں سمندر پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اس سے جو زمین حاصل ہو
رہی ہے اس کے اوپر بھی عمارات کی تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسے ہی ایک قطعۂ زمین پر
ایک Multi Storeyed بلڈنگ میں نے دیکھی جو حال ہی میں گجرات میں آئے

زلزلے، جس کا اثر پاکستانی علاقوں میں بھی دیکھا گیا، کی وجہ سے قدرِ زمین میں دھنس گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ نارتھ ناظم آباد سے ملحق جو پہاڑ ہے اور جس سے Lime Stone Querry کیا جاتا ہے، وہ پہلے کبھی سمندر کے اندر ہی تھا اسی لئے اس کے اوپر ابھی بھی Fossils پائے جاتے ہیں۔

ایک بات اور، وہ یہ کہ میں نے تمام ''بلاکس'' کی باہر سے رنگت اُڑی اُڑی سی پائی گویا اُداس اُداس سی۔ جب اس کی وجہ میں نے ''کراچی بلڈنگس کنٹرول آتھورٹی'' (KBCA) کے سابق افسرِ اعلیٰ جو میرے بھانجے ہوتے ہیں، سے پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ دراصل یہ ''بلاکس'' پرائیویٹ اداروں کے ذریعہ تعمیر کئے جاتے ہیں اور پھر ان کے ''فلیٹس'' مختلف لوگوں کو فروخت کردیئے جاتے ہیں۔ شروع شروع میں تو ان ''بلاکس'' کے باہر تازہ تازہ ''سنوسیم'' (Snowcem) ہونے کی وجہ سے تازگی رہتی ہے پھر جیسے جیسے عرصہ گزرتا جاتا ہے ''سنوسیم'' فیڈ ہونے لگتا ہے اور ''بلاک'' کی مشترکہ ملکیت ہوجانے کی وجہ سے اس پر آگے کوئی ''سنوسیم'' نہیں کراتا۔ اس طرح سب ''بلاکس'' ایک جیسے ہوجاتے ہیں اور ان سے بیوگی کا سا تاثر ملتا ہے۔

آبادی کے لحاظ سے کراچی کا موازنہ دہلی سے کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ دہلی ہندوستان کا دارالخلافہ ہے اور کراچی پاکستان کا دارالخلافہ رہا ہے۔ اس معاملے میں بھی دونوں میں یکسانیت ہے۔ دونوں ہی میں نئی اور پرانی آبادی بھی ہے، یعنی نئی دہلی اور پرانی دہلی نیز نیو کراچی اور پرانا کراچی؛ لیکن اس معنیٰ کر دونوں میں تضاد ہے کہ دہلی میں تو نئی دہلی، پرانی دہلی سے عمدہ، پُرکشش اور جاذب نظر ہے جو ہونا بھی چاہیئے لیکن کراچی میں نیو کراچی، پرانی کراچی یعنی کلفٹن، صدر وغیرہ سے بہت کم تر درجے کا ہے۔ غالباً اس کی وجہ

یہ ہے کہ نئی دہلی انگریزوں نے اپنے اور رؤساء کے لئے نیز نئی کراچی پاکستانیوں نے Middle Class مہاجرین کے لئے آباد کیں۔ کراچی میں چوراہے کو چورنگی کہتے ہیں۔ تقریباً ہر چورنگی پر خوبصورت Monuments تعمیر کرائے گئے ہیں۔

اسی ضمن میں ''ابدی آبادکاری'' کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ کراچی میں کافی قبرستان ہیں جو وسیع وعریض علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ رات کے بارے میں تو کچھ کہا نہیں جا سکتا، البتہ دن میں ہر وقت، خاص کر صبح اور شام کے اوقات میں، وہاں کافی چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔ کئی کئی میتیں ایک ساتھ لائی جاتی ہیں۔ لوگ اپنے عزیزوں کی قبروں پر پھول چڑھاتے اور فاتحہ خوانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جب کوئی اپنے کسی عزیز کی قبر پر پھول چڑھاتا ہے تو ساتھ ہی اس قبر کے آس پاس کی قبروں پر بھی پھول چڑھاتا ہے۔ قبروں کو پختہ کرنے کا زیادہ رواج ہو گیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کئی قبرستانوں کو ان میں بظاہر گنجائش نہ ہونے کے سبب بند کرنا بتایا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کراچی میں ''فلیٹ'' خریدنا آسان ہے بہ نسبت قبر کی جگہ حاصل کرنے کے۔ کچھ برادریوں نے تو Societies بنا کر قبرستانوں میں زمین خریدتے ہوئے اس کی چہاردیواری کر رکھی ہے۔ اسی طرح کی ایک Site میں نے ایک قبرستان میں سادات امروہہ کی دیکھی۔ اربابِ اقتدار کو اس طرف جلد دھیان دینا ہوگا ورنہ وہ دن دور نہیں جب قبرستانوں میں بھی زمیں دوز Multi Storeyed قبروں کا Culture Develop کرنا پڑ جائے گا۔

یہاں ایک سماجی ادارے، ''ایدھی ٹرسٹ فاؤنڈیشن'' کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی اور بے ربط نہ ہوگا۔ یہ ادارہ لاوارث بچوں اور بیواؤں کی پرورش، ان کی شادی بیاہ؛ لاوارث لاشوں کی تجہیز و تکفین کراتا ہے نیز قربانی اور صدقے کا انتظام کراتا ہے۔ ان کا اپنا

منشیات پر کنٹرول کرنے کا ادارہ، فری میڈیکل سروس، کینسر اسپتال، لنگر خانہ اور میتوں کو رکھنے کے لئے سرد خانہ وغیرہ ہیں۔ ان کی اپنی ایمبولینس اور حتیٰ کہ ہیلی کوپٹر سروس بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کو ٹیلیفون کرتے ہی آناً فاناً ان کا عملہ حرکت میں آجاتا ہے اور بروقت سہولت بہم پہنچادیتا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ شام کو عطیات دینے والے اہل خیر حضرات کی ان کے مراکز کے باہر قطاریں لگ جاتی ہیں۔ لطف یہ کہ اگر کوئی شخص دیدیئے گئے عطیہ کے اصراف سے مطمئن نہ ہو تو وہ رسید دکھا کر اپنا عطیہ واپس لے سکتا ہے۔ اس ادارے کے پاکستان کے ہر بڑے شہر جیسے کراچی، لاہور، راولپنڈی، کوئٹہ، پشاور وغیرہ میں مراکز قائم ہیں۔ ٹرسٹ کے مالک نامور سماجی شخصیت جناب عبدالستار ایدھی ہیں جو میمن برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور گجرات نژاد ہیں۔ ان کو دیکھنے سے ایسا نہیں لگتا کہ وہ اتنے بڑے ادارے کو چلا رہے ہوں گے۔ کہتے ہیں کہ وہ کھدر کا لباس، اس پر ٹوپی اور پلاسٹک کے ہوائی چپل استعمال کرتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر خود ہی ایمبولینس چلا کر لے جاتے ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ ایسی ہستی کو بھی ابھی تک "نوبل انعام" سے نہیں نوازا گیا۔! اگر یہی شخص انگریز یا یہودی ہوا ہوتا تو کبھی کا اس اعزاز سے نوازا جا چکا ہوتا۔

حواشی

(۱) آخری اعداد و شمار کی رو سے پاکستان میں پناہ لینے والوں کی مجموعی تعداد ۹۰ لاکھ تھی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے سندھ چھوڑ کر جانے والے غیر مسلموں کی تعداد ۹ لاکھ تھی جب کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین میں سے محض ۵ لاکھ ۴۰ ہزار ہی کو وہاں آباد کیا گیا۔ اسی طرح صوبہ سرحد سے جانے والے غیر مسلموں کی تعداد ۲ لاکھ ۹۶ ہزار تھی جب کہ صرف ۵۱ ہزار مہاجرین ہی کو وہاں آباد کیا گیا۔

۱۹۵۰ء میں کھوکھراپار کے راستے آنے والے مسلمانوں کی تعداد ۲،۶۴،۸۹۹ تھی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ تعداد ۶ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۷ لاکھ مسلمان زیادہ تر بہار سے مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تھے۔

مہاجرین کو آباد کرنے کا مسئلہ سالہا سال تک پاکستان کے لئے دردِ سر بنا رہا۔ اس کے برخلاف جب دوسری جنگِ عظیم [۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء] کے بعد مغربی جرمنی پر جرمن پناہ گزینوں کا ایک سیلاب ٹوٹ پڑا تھا اور جون ۱۹۶۱ء تک یہ تعداد بڑھتے بڑھتے ایک کروڑ ۲۵ لاکھ تک پہنچ گئی تھی اور وہ بھی اس حال میں جب کہ مغربی جرمنی سے کوئی بھی شخص اپنی جائیداد وغیرہ چھوڑ کر نہیں گیا تھا، تو مغربی جرمنی نے بڑی خوش اسلوبی سے نہ صرف یہ کہ ان تمام مہاجرین کو آباد کیا بلکہ انھیں مناسب کاموں پر بھی لگایا جس سے مہاجرین کا وہی سیلاب مغربی جرمنی کی معاشی خوشحالی و ترقی کا ایک بڑا ذریعہ بن گیا تھا۔

[''تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان'' حصہ دوم ص ۳۲۰، ۳۲۳]

[۵] پینے کے پانی کا نظام

(Water Supply System)

پہلے بھی کراچی میں ہر گھر کے ساتھ ایک کنواں ہوا کرتا تھا جس کا پانی برتن اور کپڑے دھونے کے کام آتا تھا جب کہ لیاری ندی کے کنارے جو کنویں تھے ان کا پانی پینے کے کام میں لایا جاتا تھا۔ بعد میں دریائے ملیر کے کنارے بنے کنوؤں کا پانی تقسیم کرنے کا منصوبہ عمل میں لایا گیا۔ ساتھ ہی کچھ عرصہ بعد سندھ ندی سے بھی استفادہ کیا جانے لگا۔

۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں میونسپلٹی نے شہر کے مختلف علاقوں میں مزید گیارہ کنویں کھودے جن میں سے زیادہ تر لیاری ندی کے بائیں کنارے پر واقع تھے۔ اس کے علاوہ رام تلاؤ، رتن تلاؤ، فریئر تلاؤ، نانک واڑہ تلاؤ اور رام باغ تلاؤ کے گرد بھی متعدد کنویں کھودے گئے۔

۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) سے ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) کے عرصہ میں ڈملوٹی میں بارہ کنویں کھودے گئے اور اُن سے حاصل شدہ پانی تقریباً چالیس کلومیٹر دور پتھر کی بنی ہوئی ایک زیرِ زمین پائپ لائن کے ذریعہ پمپ کر کے کراچی لایا گیا۔

پانی کا ذخیرہ کرنے کے لئے ''ٹیمپل'' اور ''کرتی''، دو ''رزروائیرس'' (Reservoirs) بھی بنائے گئے تھے۔ یہ دونوں آج بھی استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ مزید دو ''رزروائیرس'' ''سیڈھم'' اور ''ایل۔ ایس۔ آر'' بنائے گئے جو کشمیر روڈ پر واقع ہیں۔

دراصل ڈملوٹی کے کنوؤں کا پانی بارش کا مرہونِ منت ہے۔ بارش کا پانی ملیر ندی کے ریت میں جذب ہو جاتا ہے اور پھر کنوؤں کے ذریعہ تمام سال چلتا رہتا ہے لیکن بارش نہ ہونے کی صورت میں کنویں خشک ہو جاتے ہیں جس سے پانی کی قلت ہو جاتی

ہے۔اس کے علاوہ آزادی کے بعد کراچی میں تمام تعمیراتی کام اسی ندی سے حاصل کردہ ریت سے ہوا جس سے ندی کی پانی جذب کرنے کی استعداد کم ہوتی گئی اور اب ان کنوؤں سے بمشکل پانچ ملین گیلن پانی ہی مل پاتا ہے۔

مندرجہ بالا مشکلات کے پیشِ نظر ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۳ء) میں ایک منصوبے کے تحت ہالیجی جھیل سے پانی حاصل کیا جانے لگا۔کلری نہر اس جھیل کے قریب سے ہی گزرتی ہے لہٰذا جھیل کے قریب چاروں طرف نو مربع میل (۲۳.۰۴ مربع کلومیٹر) میں ایک پشتہ بنا کر اسے ایک مصنوعی جھیل کی شکل دے دی گئی جس میں ۱۳,۰۰۰ ملین گیلن پانی کا ذخیرہ ہونے کی گنجائش ہے۔

اِس وقت کس Source سے کتنا پانی دستیاب ہو رہا ہے اُس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:—

Source of Bulk Water Supply

Source	MGD
Dumlo ttee wells	5
Indus via Haleji/Gharo	20
Indus via Greater Karachi Bulk Water Supply	240
Indus Balance Conveyor Scheme	42
Hub System from Balochistan	100
TOTAL -	407

شہر میں ہر روز تقریباً ۳۶۳ ملین گیلن پانی فراہم کیا جاتا ہے جب کہ ۵۰۰ ملین گیلن پانی کی ضرورت ہے۔ جو پانی فراہم کیا جاتا ہے اس میں سے تقریباً ۳۷ فی صد پائپ لائن کی ٹوٹ پھوٹ اور رساؤ وغیرہ کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے؛ اور اس طرح

تقریباً ۵۰ فی صد پانی ہی صارفین کو مل پاتا ہے۔ اسی وجہ سے ابھی بھی کچھ کالونیاں Running Water کی سہولت سے محروم ہیں۔ وہاں Tankers سے پانی مہیا ہو پاتا ہے۔ تقریباً ۵،۰۰۰ ٹینکرس ۵۰،۰۰۰ کے قریب چکّر روزانہ لگاتے ہیں اور اس طرح ۸،۵ ملین گیلن پانی روزانہ فروخت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ گدھا گاڑیاں بھی پانی لادنے کے کام میں لائی جاتی ہیں۔ یہ بھی "KWSB" کی لائنوں سے ہی خلاف قانون پانی لے کر بیچتے ہیں۔ [اب بھی جگہ water table بہت تیزی سے down ہوتا جارہا ہے، جو ایک مسئلہ ہے۔]

کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر صارفین پمپ سے پانی کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں تو گندہ اور بدبودار پانی آنے لگتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پانی کی لائینوں میں اس حد تک ٹوٹ پھوٹ ہے کہ ان میں Sewer یا گندے نالوں کا پانی آنے لگتا ہے اور Sewer Lines سے بھی رساؤ ہو رہا ہے۔ اس سے متعلقہ سرکاری عملے کی کارکردگی پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

پانی کی قلّت کی وجہ سے کراچی میں "Intermittant Supply System" ہے [محض خاص اوقات میں پانی آتا ہے۔]۔ اگر "Continuous Supply System" [چوبیسوں گھنٹے پانی آئے۔] ہو تو پانی کی لائن میں گندہ پانی نہیں آئے گا [لائینوں میں اندر سے باہر کی طرف پانی کا دباؤ بنا رہتا ہے۔]؛ لیکن اس میں پانی کی قلّت کا مسئلہ مانع ہے۔

پانی کی لائینوں میں اتنا پریشر بھی نہیں ہوتا کہ Multi Storeyed Buildings میں پانی چڑھ سکے۔ چنانچہ تقریباً ہر ''بلاک'' میں مناسب سائز کا ایک زمیں دوز ''رزروائیر'' (Reservior) بنایا ہوا ہے جس سے ضرورت کے مطابق پانی پمپ کر دیا جاتا ہے۔ [دہلی کو بھی اب پانی کی قلّت کا سامنا ہے۔]

کچھ صارفین نے نجی Water Jet Pumps بھی لگائے ہوئے ہیں جو عموماً دو سوفٹ گہرائی تک بور کیے ہوئے ہیں۔ تقریباً سوفٹ گہرائی تک جو زیر زمین پانی کا ذخیرہ (Underground water reservoir) ہے، وہ کھارا ہے [ساحلِ سمندر پر واقع ہونے کے سبب]۔ اس کے نیچے کا ذخیرہ میٹھے پانی کا ہے۔ کچھ صاحبِ استطاعت لوگوں نے تو دو دو واٹر جیٹ پمپ لگائے ہوئے ہیں۔ ایک کم لاگت والا کھارے پانی کا اور دوسرا میٹھے پانی کا۔ کھارے پانی کو تو Plantation اور صفائی وغیرہ کے کام میں لایا جاتا ہے جب کہ میٹھے پانی کو کھانے پینے کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

Chemically پانی کو دو Classes میں بانٹا ہوا ہے: Soft Water اور Hard Water۔ آخر الذکر بھی دو sub-classes؛ Temporary Hard Water اور Permanent Hard Water میں بانٹا ہوا ہے۔ Temporary Hard Water پانی میں Carbon Dioxide کی موجودگی کی وجہ سے ہوتا ہے جو Calcium اور Magnecium کے insoluble carbonate کو dissolve کر کے soluble bicarbonate کی شکل میں لئے رہتا ہے۔ Insoluble carbonates کی وجہ سے scale formation ہوتا ہے جب کہ Permanent Hard Water پانی میں Sulphates یا Nitrates یا Calcium اور Magnecium کے Chlorides کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ Salts, Corrosive ہوتے ہیں۔ Hard Water کے مقابلے میں Soft Water صابن کے زیادہ جھاگ دیتا ہے۔

[۶] گندگی کی نکاسی کا نظام

(Drainage System)

گندگی چار شکل میں ہو سکتی ہے: (۱) کوڑا کرکٹ (Garbage)، (۲) ''سلیج'' (Sullage)، یعنی غسل خانے، باورچی خانے اور واش بیسن وغیرہ کا گندہ پانی جس میں کسی جاندار کا فضلہ (Excreta) نہیں ہوتا: (۳) ''سیوریج'' (Sewage)، یعنی بیت الخلاء سے نکلنے والا فضلا اور پانی، Sullage-water اور Urinals کا اخراج اور (۴) برساتی پانی (Rain water)۔ ان سب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے Drainage System بھی تین شکل میں ہو سکتا ہے۔ (۱) "Combined System": اس میں مندرجہ بالا سبھی ۲ سے ۴ تک کی گندگیوں کو ایک ساتھ Remove کیا جاتا ہے۔ (۲) "Separate System": اس میں ۲ سے تین تک ایک ساتھ اور ۴ کو الگ Remove کیا جاتا ہے۔ (۳) "Partially Separate System": اس میں بارش کا زیادہ تر پانی نالوں کے ذریعہ نکال دیا جاتا ہے جب کہ مکانوں کی چھت، صحن اور سڑکوں کا Run-off اور ''سوائیل سیورس (Soil-sewers) الگ سے خارج ہونے دیا جاتا ہے۔ "Combined System" اور "Separate system" کی اپنی کچھ خصوصیات اور کمیاں ہیں۔ اس لئے "Partially Separate System" ہی زیادہ مناسب رہتا ہے۔ کراچی میں یہی System ہے۔

[۱] برساتی پانی (Flood Water)

کراچی کی ایک اہم خصوصیت اس کا صاف ستھرا پن تھا۔ آزادی سے پہلے

برساتی پانی کی نکاسی کا معقول بندوبست تھا۔ ۱۳۴۱ھ (۱۹۲۲ء) میں متعدد نالوں کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا اور جیسے جیسے شہر پھیلتا گیا ان کو پختہ کیا جاتا رہا۔ بارش ہوتے ہی تمام تر پانی اِن نالوں کے ذریعہ سمندر میں چلا جاتا تھا۔

شروع میں تو نالے کھلے ہوئے تھے لیکن بعد میں ''کراچی میونسپل کارپوریشن'' نے جب تجارتی عمارات تعمیر کرائیں تو ان نالوں کو بھی جگہ جگہ پر پاٹ دیا۔ نتیجتاً اُن کی مناسب صفائی نہیں ہو پاتی اور نہ ہی ان کی ضروری مرمت کی جارہی ہے۔ جگہ جگہ پر یہ ٹوٹ چلے ہیں اور خستہ حالت میں ہیں۔ ان میں گھاس اور دیگر جنگلی پودھے تک اُگ آئے ہیں۔ Engineering نقطۂ نگاہ سے پکّے کاموں پر پیڑ پودھوں اور گھاس وغیرہ کے اُگنے سے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پلاسٹک کی تھیلیاں، جن پر کسی کا کوئی کنٹرول نہیں، بھی اُڑ اُڑ کر اِن میں آ کر جمع ہو رہی ہیں۔ ان سب سے نالوں میں پانی کے مناسب بہاؤ میں رخنہ اندازی ہو رہی ہے اور گندے پانی کو Self Cleansing Velocity نہیں مل پا رہی ہے جس سے Solid Particles کے تلی میں جمتے چلے جانے سے نالے Chock ہو چلے ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے زیرِ زمیں پانی بھی متاثر ہو رہا ہے۔

[۲] سیوریج (Sewerage)

برساتی پانی کے نظام کی طرح پہلے "Sewerage System" (Sullage & Sewage کی نکاسی) کا بھی موثر انتظام تھا۔ شہر کو اٹھائیس زون میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ہر زون میں سب سے نچلی سطح پر ایک اجیکٹر (Ejector) لگایا گیا

تھا۔ قدرتی بہاؤ (Gravity Flow) سے تمام پانی اجیکٹر کے پاس جمع ہو جاتا تھا جہاں سے اجیکٹر ہوا کے پریشر سے اس پانی کو پمپنگ اسٹیشن تک پہنچا دیتے تھے۔ پمپنگ اسٹیشن بارتس اسٹریٹ پر ایک اونچی جگہ واقع تھا۔ دوسرے مرحلے میں تمام پانی پمپ کے ذریعہ ''سیوریج فارم'' میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ یہ فارم لیاری ندی کے دائیں جانب منگھوپیر روڈ پر واقع ہے۔

مندرجہ بالا طریقہ قدرے دشوار تھا اس لئے ۱۳۸۰ھ (۱۹۶۹ء) میں ''ٹرنک سیور'' پر کام شروع ہوا۔ 20MGD کی استعداد کے دو ''ٹریٹمینٹ پلانٹس'' [Treatment Plants] کی بنیاد ڈالی گئی تاکہ پرانے نظام کو بدلا جا سکے۔ بعد میں "Greater Karachi Sewerage Plan" (GKSP) کے تحت مزید Gravity سیور لائنس [Sewer Lines] ڈالی گئیں۔ اس طرح شہر کی یہ گندگی ٹی۔پی۔ون [T.P.i] اور ٹی۔پی۔ٹو [T.P.ii] آنے لگی جس کو پمپ کر کے ''ٹریٹمینٹ پلانٹ'' میں ٹریٹ [Treat] کیا جانے لگا۔ لیکن کراچی کی آبادی کچھ اس برق رفتاری سے بڑھی کہ ٹریٹمینٹ [Treatment] کا یہ نظام پیچھے رہ گیا۔

ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت تقریباً ۴۰ فی صد لوگوں کو ہی سیوریج [Sewerage] نظام کی سہولت حاصل ہے۔ روزانہ تقریباً ۲۹۵ سے ۳۵۰ ملین گیلن Waste water پیدا ہوتا ہے جس میں سے سرکاری نظام کے ذریعہ مشکل سے ۲۰ سے ۴۰ ملین گیلن ہی ٹریٹ [Treat] ہو پاتا ہے۔ باقی نالوں کے ذریعہ سمندر میں چلا جاتا ہے۔ ویسے "Karachi Water & Sewerage Board" (KWSB) نے ۱۵۱.۵۰ ملین گیلن یومیہ صلاحیت کا ''ٹریٹمینٹ پلانٹ'' نصب کیا ہوا ہے جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:۔

Treatment Plant (TP)	Installed Capacity (MGD)	Actual treatment (MGD)
TP I	51.00	7.00
TP II	45.50	15.00
TP III	54.00	5.00
Total	**151.50**	**27.00**

[۷] بجلی کا نظام

(Electric Supply System)

کراچی روشنیوں کا شہر کہلاتا ہے۔ اس میں ۱۳۰۱ھ (۱۸۸۳ء) تک بجلی نہیں تھی۔ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) میں سڑکوں کو رات کے وقت روشن رکھنے کی غرض سے ناریل اور تل کے تیل سے لیمپ روشن کئے گئے۔ اس کے بعد مٹی کے تیل کا استعمال ہونے لگا۔ ۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء) میں شہر کے بڑے چوراہوں پر گیس کے لیمپ لگائے گئے۔ (۱۳۴۴ھ (۱۹۲۵ء) میں کچھ صورتِ حال اس طرح سے تھی:—

۱۲۴۲عدد تیل سے روشن ہونے والے لیمپ،

۳۵۳عدد پیٹرول سے روشن ہونے والے لیمپ،

۲۱۱عدد کٹسن لیمپ،

۶۷اعدد بجلی کے بلب (۱۰۰ کینڈل پاور کے)،

۲۰۵عدد بجلی کے بلب (۴۰ کینڈل پاور کے) اور

۸عدد بجلی کے بلب، (۴۰۰ کینڈل پاور کے)

اس وقت جو صورتِ حال ہے وہ مندرجہ ذیل ٹیبل سے عیاں ہوجاتی ہے:—

Actual Distribution From KESC .... 1,217 MW

Borrowing from WAPDA .... 250 MW

Total Supply .... 1,467 MW

Power Lossess and Pilferage 30%

Actual Demand ....1,500 MW

اس طرح "Karachi Electric Supply Corporation" (KESC) جو بجلی Supply کرتی ہے وہ ضرورت سے بہت کم ہے۔ اس لئے اس کو نجی سیکٹر (Private Sector) اور "KANUP" سے بھی بجلی خریدنی پڑتی ہے۔

بجلی کی کمی کا زیادہ تر احساس گرمیوں میں ہوتا ہے کیوں کہ اس موسم میں کافی تعداد میں پنکھے Air Conditioners, Refrigerators, اور Coolers استعمال کئے جاتے ہیں۔ بار بار کبھی تو کافی وقفہ کے لئے بجلی کی Supply منقطع ہو جاتی ہے۔

بجلی کی کمی کی وجہ سے تقریباً ۲۰ فی صد خاندان بغیر بجلی کے گزارا کرنے پر مجبور ہیں لیکن رات کو بازار کی روشنیاں نگاہوں کو خیرہ کئے رہتی ہیں۔ طرح طرح سے مختلف انداز میں انھیں روشنی سے سجائے رکھا جاتا ہے۔ میں نے "KDA" کے ایک ذمہ دار افسر سے یہ سوال کیا کہ جب بجلی کی ضرورت سے بہت کم پیداوار ہے اور شہر کی کافی کچھ آبادی بنا بجلی کے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے، تو پھر رات کی اس نمائشی روشنی پر پابندی لگاتے ہوئے ضرورت مندوں کو کیوں نہیں بجلی مہیا کرادی جاتی؟۔ وہ اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے۔

[۸] ذرائع نقل و حمل

(Transportation)

۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) تک کراچی میں کوئی سڑک پختہ نہیں تھی۔اس کے بعد ہی پختہ سڑکیں تعمیر کی گئیں اور ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) تک تقریباً ایک ہزار سڑکیں پختہ ہوئیں۔

ابتدائی دور میں مختلف اقسام کی گاڑیاں استعمال کی جاتی تھیں جیسے: بیل گاڑیاں، اونٹ گاڑیاں، گدھا گاڑیاں، بگھیاں اور ہاتھ گاڑیاں۔۱۳۰۳ھ (۱۸۸۵ء) میں اسٹیم سے چلنے والی ''ٹرام وے'' کا استعمال ہونے لگا جو "East India Tramway Co" کی ملکیت تھی۔لیکن اس کے شور کی وجہ سے جلد ہی اس کو بند کر کے ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۲ء) میں اس کی جگہ چھوٹی اور ہلکی کار نما ٹرام جو گھوڑوں سے کھینچی جاتی تھی، سڑکوں پر آ گئی۔ان میں محدود گنجائش ہوتی تھی؛ اس لئے ان کو بھی بند کرنا پڑا۔ بعد ازاں ٹرام لائن جو ڈیزل سے چلتی تھی، رائج ہوئی لیکن چند وجوہات سے یہ بھی بند ہو گئی۔ پھر ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں بس سروس شروع ہوئی جو پرائیویٹ کمپنیوں کی ملکیت تھی۔

پہلے کچھ عرصہ "Karachi Transport Corporation" (KTC) نے اپنی بسیں چلائیں لیکن خسارہ کی وجہ سے ان کو بند کرنا پڑا۔ تبھی سے کراچی میں کوئی مربوط نظام Transportation کا نہیں ہے۔ مختلف سائز اور ڈیزائن کی بسیں سڑکوں پر دوڑا کرتی ہیں جو تمام کی تمام پرائیویٹ ملکیت میں ہیں۔ جہاں چاہو، جب چاہو، ان کو روکا جا سکتا ہے۔ان کے باضابطہ کوئی اسٹینڈ نہیں ہیں۔ جب اسٹینڈ ہی نہیں ہیں تو شیڈ کی تو بات ہی کرنا فضول ہے۔Private Sector میں ہونے کی وجہ سے Centralized Depot اور Workshop بھی نہیں ہیں۔ ہر Transporter اپنی سہولت کے مطابق ان کو کھڑا کرتا ہے اور ہر / Workshop

Garrage Owner اپنی مرضی کا مالک ہے۔ جہاں چاہتا ہے مرمت کرنی شروع کر دیتا ہے۔ اس سے Smooth Traffic Running میں رخنہ اندازی ہوتی ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ ایک ایک بس کا ایک ایک مالک اور بعض بعض بس کے تو کئی مالک ہوتے ہیں۔ یعنی ہر شخص ''اپنی ڈفلی اپنا راگ'' کے مقولے کا مصداق ہے۔

کراچی کی سڑکوں پر قدم رکھتے ہی جس چیز نے مجھے سب سے پہلے اپنی طرف راغب کیا وہ دلہن کی طرح سجی ہوئی، درمیانی سائز کی بسیں تھیں۔ یہ بسیں تقریباً سبھی کی سبھی پٹھانوں کی ملکیت ہیں۔ ان کے آگے کا بمپر اوپر سے نیچے کو اور سامنے کا ٹول بوکس نیچے سے اوپر کی طرف Vertically سیدھے سیدھے اور Horizontally ایک Curvature لئے Slope میں ہوتے ہیں۔ چھت پر کنارے کنارے، زیادہ تر آگے اور پیچھے کی جانب مور کے پر اور دیگر مصنوعی جھاڑ لگے رہتے ہیں اور ساتھ ہی مختلف رنگوں میں کپڑے جھالر کی شکل میں لہراتے رہتے ہیں۔ بسوں کے سامنے اور پیچھے، بالخصوص سامنے کی جانب Count less بتیاں لگی ہوتی ہیں جن میں سے زیادہ تر مصنوعی ہوتی ہیں۔ بس کے چاروں جانب، معہ کھڑکیوں کے گلاس کے، لیکن Wind Glass کو چھوڑ کر، مختلف خوشنما رنگوں میں نقش و نگار Paint کئے ہوتے ہیں۔ میری تو ان پر کچھ اسی طرح نگاہ اٹھی جیسے کسی نا ندیا بیل پر اُٹھ کر رک جائے اور پھر دل اُس کا جی بھر کر اور بغور جائزہ لینے پر مجبور کر دے۔ میرے خیال میں تو اگر مالکان کا بس چلے تو ان بسوں کے Wind Glass پر بھی پینٹ کرا دیں۔ میں نے یہ محسوس کیا کی تمام رنگوں میں کالا رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور کپڑوں کی پٹیاں بھی زیادہ تر کالی ہوتی ہیں۔

ویسے تو سبھی جگہ نجی Vehicle مالکان، ڈرائیور اور کنڈکٹر صاحبان اپنے ذوق کے اعتبار سے Vehicle کے اندر اور باہر مختلف اشعار اور نعرے لکھوائے رہتے ہیں جیسے ''بُری نظر والے تیرا منھ کالا''، لیکن جو لطف میں نے یہاں بسوں میں لکھے ہوئے اشعار

سے محسوس کیا وہ دیگر جگہ نصیب نہیں ہوا۔ ایک شعر بالکل آگے کی سیٹ کے سامنے، ڈرائیو کی پشت پر لکھا تھا۔ (جہاں خواتین بیٹھتی ہیں) آپ بھی اس شعر سے لُطف اندوز ہوں۔

بُلبُلو غُل نہ کرو مرا محبوب سوتی ھے
تم تو چلی جاتی ھے وہ خفا ھم پہ ھوتی ھے

تقریباً سبھی بسوں میں آگے مستورات بیٹھتی ہیں اور پیچھے مرد۔

اب لمبے سائز کی بہت آرام دہ بسیں بھی چل گئی ہیں اور اُن میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں اب جو نئی بسیں سڑکوں پر آ رہی ہیں وہ سب لمبی بسیں ہیں جن میں سے کچھ تو Air Conditioned ہیں۔

ٹرکوں کا سائز بھی ان کے پٹھان مالکان اور ڈرائیوروں کی ہی طرح تندرست ہے۔ ان ٹرکوں کے آگے کے بمپر اور ٹول بوکس کے ڈیزائن بھی مذکورہ بالا بسوں کی طرح ہیں۔ جو ٹیکسیاں چلتی ہیں وہ دو رنگوں میں دستیاب ہیں۔ ایک پورے پیلے رنگ میں جو "Yellow Cap" کہلاتی ہیں اور دوسرے پیلے اور کالے مشترک رنگ میں۔ یہ "Black Cap" کہلاتی ہیں۔ ان میں سے یلو کیپ ٹیکسیاں نئی حالت اور قدرے زیادہ گنجائش والی ہوتی ہیں۔ جبکہ بلیک کیپ ٹیکسیاں زیادہ تر پرانی اور محدود گنجائش والی ہوتی ہیں۔ بعض بلیک کیپ تو اتنی پرانی ہیں کہ اُن میں ہارن کی بھی ضرورت نہیں۔ انگریزوں کو ''اینٹیکس'' (Antiques) کا بہت شوق ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ اُن کی نگاہِ جوہر شناس سے ابھی تک یہ ٹیکسیاں بچی ہوئی ہیں!!۔ اگر اُن کو پتہ چل جائے تو ان ٹیکسیوں کے مالکان عیش کریں۔ یہ ایک ریسرچ کا موضوع ہے کہ کیا حضرت آدمؑ کے وقت میں بھی ٹیکسیاں چلا کرتی تھیں؟۔ اگر نتیجہ ہاں میں نکلتا ہے تو میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ بلیک کیپ ہی رہی ہوں گی اور پھر اس کے بعد میوزیم والوں کو بھی حرکت میں آ جانا چاہئے۔

تقریباً سبھی ہلکی گاڑیاں گیس سے چلتی ہیں۔ [کراچی میں ''سوئی گیس'' کی

فراوانی ہے۔] اس سے پیٹرول اور ڈیزل بھی بچتا ہے اور Running Cost بھی کم آتی ہے۔ ساتھ ہی Air Pollution بھی کم ہوتا ہے۔ دہلی کے مقابلے کراچی میں ٹیکسیوں کا کرایہ کافی کم ہے۔

ایک اور چیز جس نے مجھے اپنی طرف کھینچا وہ گدھوں سے کھینچی جانے والی گاڑیاں ہیں۔ یہ گاڑیاں کافی چھوٹی حد تک بھی ہوتی ہیں جن میں (خدا جھوٹ نہ بلائے) دہلی کی سیور لائن میں رہنے والے چوہے (گھوس) نما چھوٹے چھوٹے دو گدھے مشقت کرتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر بعض مرتبہ تو آنکھیں ملنی پڑ جاتی ہیں۔ زیادہ تر گاڑیوں پر اردو کے ساتھ ساتھ چینی رسم الخط بھی ہوتا ہے۔ اس سے پاکستان اور چین کے درمیان تعلقات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ایک معلومات کے مطابق اس وقت کراچی میں کم وبیش تیرہ لاکھ ایسی گاڑیاں ہیں۔

[۹] مذہبی بیداری
(Religious Awareness)

پاکستان مملکتِ خداداد کہلاتا ہے۔ کراچی کی خوشنما، کئی کئی منزلہ مساجد اور ان کے بلند و بالا مینار اس بات کی منہ بولتی تصاویر ہیں۔ اب جو مساجد تعمیر ہو رہی ہیں ان کے گنبد اور مینار، بالخصوص مینار پرانی طرز سے ہٹ کر نئی طرز کے، ایک جدّتی انداز میں تعمیر کئے جا رہے ہیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، کراچی میں ''فلیٹس'' کے ''بلاکس'' کا کلچر ترقی پر ہے۔ ہر بلاک کے Ground Floor پر مسجد کے لئے ایک ہال ضرور بنایا جاتا ہے۔

سڑکوں کے کنارے کنارے، Main شاہراہوں کے Central Island پر، کچھ کچھ فاصلے سے بورڈ لگے ہیں جن پر قرآنِ حکیم کی آیتیں اور کلمات لکھے ہوئے

ہیں۔ مکانات کے Front Face پر کلمات لکھنے کا بھی کافی شوق دیکھنے میں آیا۔ خواہ ہاتھ کی صفائی (ناجائز طریقوں) سے ہی کیوں نہ مکان تعمیر کرایا گیا ہو لیکن اُس کے باہر "ھٰذامِن فَضلِ رَبّی" لکھا ہوا ضرور ہوگا۔

نماز کے وقت فٹ پاتھ اور خالی جگہوں پر بھی لوگوں کو نماز پڑھتے دیکھا۔

تقریباً سبھی ٹیکسیوں میں آگے کی سیٹ کے سامنے سفر کی دعا بہت عمدگی سے لٹکی رہتی ہے۔

کراچی میں الحمد للہ ہر قسم کی شراب پر سختی سے پابندی ہے۔ صرف غیر مسلم پرمٹ سے اور بیمار مسلمان، ڈاکٹر کے نسخے پر ہی شراب حاصل کر سکتے ہیں۔

ایک بات جو میری سمجھ میں نہیں آئی، وہ یہ کہ اسلام میں ہر جاندار کی تصویر بنانا یا اپنے پاس رکھنا ممنوع ہے لیکن پھر کیوں ایک اسلامی مملکت میں کرنسی نوٹوں پر قائدِ اعظم کا فوٹو Print کیا ہوا ہے؟۔ کیا ایسے نوٹوں کو جیب میں رکھ کر نماز پڑھنا جائز ہے..........؟؟ (معذرت کے ساتھ)

کہتے ہیں کہ اگر کوئی بے قصور مسلمان کسی غیر مسلم کے ہاتھوں محض مسلمان سمجھ کر مارا جائے تو وہ مسلمان سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ لیکن اگر مسلمان مسلمان کے ہاتھوں مارا جائے تو کس کا کیا ٹھکانہ ہوگا؟ یہ ایک قابلِ غور بات ہے۔ کراچی میں ہر طبقۂ فکر کے مسلمان رہتے ہیں۔ ایک عقیدے والا دوسرے عقیدے والے پر خوب خوب کھلے بندوں قہر برپا کرتا ہے۔ (میری مراد "سپاہِ صحابہ" اور "تحریکِ جعفریہ" سے ہے۔) یہاں تک کہ مساجد میں نمازیوں اور میتوں تک کو بھی نہیں بخشا جاتا۔ یہ ایک اور تلخ حقیقت ہے کہ ایسا کرنے والے خود کو اپنے فرقے کا علمبردار اور صوم وصلوٰۃ کا پابند گردانتے ہیں۔ اس سے اسلام دشمن قوتوں کے حوصلے بلند ہو رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ہم جلد اس حقیقت کو سمجھ جائیں کہ صیہونی طاقتیں ہمہ وقت عالمگیر سطح پر ہمارا چہرہ مسخ کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ وہ

نہیں چاہتیں کہ مسلمانانِ عالم خوشحال اور متمول ہوں، سائنسی اور عسکری میدان میں ترقی یافتہ اور طاقتور بنیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ اگر آپ آہ بھی کریں تو دہشت گردوں کے زمرے میں شامل کردیئے جائیں اور اگر وہ نہتوں کو بموں اور راکٹوں سے بھی اُڑادیں تو حقوقِ انسانی کے علمبردار کہلائیں۔ اسی کا نام ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' ہے۔ پھر کراچی میں تو باہمی دست وگریباں سے ان کے منصوبوں کو ہی عملی جامہ پہنایا جارہا ہے۔

[۱۰] صحتِ عامہ
(Health)

شہر میں علاج و معالجہ کے لئے اسپتال تو کافی ہیں لیکن زیادہ تر پرائیویٹ اور Costly ہیں۔ سرکاری شفاخانے ضرورت کے اعتبار سے بہت کم ہیں اور ان کی جغرافیائی تقسیم بھی نہایت غیر مناسب ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں "Apollo" اور "Escorts" جیسے معیاری اسپتال کراچی میں ہی نہیں بلکہ غالباً پاکستان کے کسی دوسرے شہر میں بھی نہیں ہوں گے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امراضِ قلب، گردہ اور دماغ جیسے پیچیدہ امراض کے مریض Heart Surgery، Kidney Transplantation اور Neuro Surgery وغیرہ کے لئے ہندوستان آنا ہی زیادہ پسند کرتے ہیں۔

شہر میں جو نالے ہیں ان کا تذکرہ پہلے کیا ہی جاچکا ہے۔ نیو کراچی کے علاقے میں میں نے دیکھا کہ کافی کچھ گلیاں کچی ہیں۔ ان میں نالیاں بھی کچی ہیں۔ ان نالیوں میں پلاسٹک کی تھیلیاں پڑی رہتی ہیں اور نالیوں کی کوئی صفائی نہیں ہوتی۔ مختصراً ان علاقوں سے تو ہمارے دیہات کی گلیاں زیادہ صحت مند ہیں جہاں ہر گلی کم سے کم اینٹوں سے تو پختہ ہے اور نالیاں بھی پختہ ہیں۔ جگہ جگہ خالی Plots پر گندگی کے ڈھیر لگے ہیں جن کی بھی

کوئی صفائی نہیں ہوتی۔ جب کراچی جیسے اہم شہر کا یہ عالم ہے تو اندرونِ ملک مواضعات کا کیا حشر ہوگا......؟

بقر اعید کو میں وہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ تقریباً سبھی اپنے اپنے گھروں میں، حتیٰ کہ بڑے جانوروں تک کی قربانی خود ہی کرتے ہیں۔ عورتیں بھی جانوروں کی تگا بوٹی کرنے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ بڑے جانوروں میں گائے، بیل، اونٹ کی قربانی کی جاتی ہے۔ اونٹ کی قربانی کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے لئے زیادہ جانکاری اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اونٹ کا گوشت قدرِ جلد تقسیم ہوجاتا ہے۔ کافی کچھ خواہشمند حضرات تو قربان گاہ پر ہی جمع ہوجاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے کچھ مخصوص عضو مخصوص امراض میں کام آتے ہیں۔

گوشت کو Deep Freezer میں رکھ کر عرصہ تک استعمال کرنے کا رواج غالباً عام ہے۔ قربانی کے پیٹوں اور دیگر الائش کا سڑکوں کے کنارے، Central Island پر ڈھیر لگا دیا جاتا ہے۔ وہاں افغانی پٹھان بیٹھے رہتے ہیں جو ان کے کارآمد Parts، جیسے ہڈیاں، آنتیں وغیرہ الگ کر لیتے ہیں؛ اور اس طرح یہ کارآمد Parts اور بچی الائش ٹرکوں میں بھر کر باہر لے جائی جاتی ہے۔ اس سے گندگی بھی صاف ہوجاتی ہے اور کارآمد Parts سے مزید فائدہ بھی حاصل کر لیا جاتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے۔

گھر گھر ناریل کے پیڑ کھڑے ہیں لیکن ان کا ڈل ہندوستانی ناریل کے ڈل سے پتلا ہوتا ہے۔ Main شاہراہوں پر One way traffic ہے۔ ایسی شاہراہوں کے بیچ Islands چھوڑے ہوئے ہیں جن پر Plantation کیا ہوا ہے۔ کافی تعداد میں یوکلپٹس کے پیڑ لگائے گئے ہیں۔ [یوکلپٹس کے پیڑ دلدلی علاقوں کے لئے ہی مناسب ہوتے ہیں کیوں کہ یہ Water Table کو Down کر دیتے ہیں جو آج کل ایک مسئلہ بن چکا ہے۔ اس لئے ان کا Plantation اب متروک ہوگیا ہے۔] اگر ان کی جگہ

ناریل یا دوسری قسم کے پھول دار جیسے کنیر، گولڈ مہر، املتاس، کچنار، جگرینڈا وغیرہ کے پیڑ یا مناسب سائے دار پیڑ لگا دیئے جائیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔ دہلی کے مقابلے میں کراچی میں ہریالی کم دیکھنے کو ملی جس کی وجہ غالباً پانی کی قلت ہے۔

[۱۱] نظم و نسق

(Law & Order)

کراچی میں Law & Order کی صورتِ حال تسلی بخش نہیں کہی جا سکتی۔ (یہ تاثرات ۲۰۰۱ء کے ہیں۔) ہاں البتہ جیسا کہ بتایا گیا، پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ [خدا کرے کہ اب مزید بہتر حالات ہو گئے ہوں۔] لیکن ابھی بھی سیاسی چپقلش اور باہمی رنجش و رقابت کا لاوا قتل و غارت گری کی شکل میں کبھی بھی پھوٹ پڑتا ہے۔ گاڑیاں جلا دی جاتی ہیں۔ [اب یہ وباء عام ہے۔] سڑکیں ویران اور چہل پہل ندارد ہو جاتی ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان میں جب بھی کوئی فتنہ یا فساد پھوٹ پڑتا ہے یا کوئی حادثہ ہو جاتا ہے تو سربراہانِ مملکتوں کو غیر ملکی ہاتھ نظر آنے لگتے ہیں۔ خدا کرے کہ عوام کو بھی وہ ہاتھ نظر آنے لگیں اور وہ خود ہی ان کو قلم کر دیں یا پھر یہ طلسم جلد ہی ٹوٹ جائے۔

پہلے، جیسا بتاتے ہیں، کراچی میں امن و امان تھا لیکن بعد میں کچھ ناعاقبت اندیش سیاست دانوں اور حکمرانوں نے اپنی سیاسی کھچڑی پکانے کی غرض سے دانستہ طور پر حالات کو بگاڑا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، جنرل ایوب خان کے دور میں Ethnic دوریاں بڑھیں۔ بعد میں ذوالفقار علی بھٹو کے دورِ اقتدار میں بھی اس کو بڑھاوا ملا۔ "MQM" کے دور میں تو یہ دوریاں ندی کے دو کنارے بن گئے۔ پھر ریشہ دوانیوں کا دور

چلا اور "MQM" کے بھی دو دھڑے ہو گئے۔ ایک کی باگ ڈور جناب الطاف کے ہاتھ میں رہی تو دوسرے کی قیادت جناب آفاق نے سنبھال لی۔ ایک کا انتخابی نشان پتنگ ہوا تو دوسرے کا موم بتی۔ خوب خوب داؤں پیچ چلے۔ ایک دوسرے کی ڈور کاٹنے کی پوری کوشش کی گئی۔ موم بتی بھی ویسے تو بظاہر موم کی بنی ہوتی ہے لیکن اس کا رشتہ شعلہ سے جڑا ہوا تھا، صحبت کا اثر قبول کرنا ایک لازمی بات ہے۔ پہلے تو دونوں دھڑوں کے بیچ جم کر رن پڑا لیکن بعد میں قدرِ ٹھنڈا پڑ گیا۔ دونوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اجارہ داری قائم کر لی۔ حد تو یہ ہے کہ عید الضحیٰ کے دن دونوں دھڑوں کے نمائندے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے علاقے میں چرم قربانی ان کو ملے۔ اس کے لئے وہ پہلے سے ہی رسید دے جاتے ہیں۔ لوگ ڈر کر انہیں کو کھال دے دیتے ہیں۔ اب وہ اس کھال کا کیا کرتے ہیں، یہ خدا جانے یا وہ جانیں۔

یہ بات یہاں قابلِ ذکر ہے کہ یہ بدنظمی انھیں علاقوں میں پھیلتی ہے جہاں So called مہاجرین رہتے ہیں۔ جہاں دیگر Ethnic Groups رہتے ہیں یا ان کی اکثریت ہے وہاں ماحول پُر سکون یا قدرِ پُر سکون رہتا ہے۔ مجھے تو تعجب ہے کہ پاکستان کو وجود میں آئے ایک عرصہ ہو گیا لیکن ابھی بھی جو لوگ ہجرت کر کے وہاں گئے تھے، حتیٰ کہ وہیں پیدا ہوئے، وہ خود کو ابھی تک مہاجر کہتے ہیں!! ہندوستان میں بھی پاکستانی علاقوں سے شرنارتھی آئے تھے لیکن وہ تو اب شرنارتھی نہیں کہلاتے اور نہ ہی انھوں نے الگ سے اس نام سے کوئی سیاسی پارٹی ہی تشکیل دی ہوئی ہے۔ اگر سوچا جائے تو مہاجرین تو سبھی ہیں۔ ہندوؤں میں بھی ''شیڈولڈ کاسٹ'' (Scheduled Caste) اور ''شیڈولڈ ٹرائب'' (Scheduled Tribe) کے علاوہ سبھی ہندوستان کے باہری علاقوں سے یہاں ہجرت کر کے آئے۔ کہا جاتا ہے کہ پنڈت، مصر سے؛ جاٹ، کردستان سے؛ گوجر، چیچنیا سے اور لالہ، افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ اسی طرح ہندوستان یا

پاکستان میں مسلمان بھی زیادہ تر ہجرت کر کے آئے۔ ویسے بھی اسلام میں وطن پرستی کا تصور نہیں ہے۔ مسلمان جہاں رہتا ہے وہی اس کا وطن ہے۔ اسی لئے اسلام ''بندے ماترم'' [اے ماں میں تیری بندنا (بندگی)، یعنی عبادت کرتا ہوں] کی نفی کرتا ہے۔ اسی طرح ''نمسکار'' یا ''نمشکار'' جو سنسکرت کے لفظ ''نت مستِشک سُوِیکارم'' (سر جھکانا قبول فرمائیں) کی بگڑی ہوئی شکل ہے، کی بھی اسلام میں ممانعت ہے کیوں کہ مومن غیر اللہ کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔ بقول علامہ اقبال ؎

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

دراصل اقتدار کے کچھ بھوکوں نے Masses کو گمراہ کر کے اور اشتعال پھیلا کر ان کا استحصال کیا۔ اب یہی دیکھ لیجئے، پہلے "MQM" سے ''مہاجر قومی موومنٹ'' ہوا کرتا تھا اور جب سے غیر مہاجر سے شادی ہوئی، "MQM" سے ''متحدہ قومی موومینٹ'' ہو گیا۔ ویسے ہم بھی کسی سے کم نہیں۔ پہلے یو۔ پی سے ''یونائیٹیڈ پروونسز'' (U.P.) ہوا کرتا تھا اور اب آزادی کے بعد ہم نے اسے اتر پردیش (U.P.) کر دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اب لوگ زیادہ سمجھدار ہو رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ تو خود کو اس سحر سے بالکل آزاد کر چکا ہے۔ اُن کو احساس ہو چلا ہے کہ اِس زہر سے اُن کی آنے والی نسلیں متاثر ہو سکتی ہیں۔

مساجد اور میتوں پر گولی چلنے کے واقعات پر تو میں پہلے ہی روشنی ڈال چکا ہوں۔ کراچی میں قتل و غارت گری کو شہ عوام میں غیر قانونی، جدید اور سستے داموں پر دستیاب اسلحہ سے بھی ملی ہے۔ یہ اسلحہ افغانستان کی خانہ جنگی کی بدولت پاکستان میں اسمگل ہوتا ہے۔

میں نے کراچی میں خوف و ہراس کا ماحول دیکھا۔ تقریباً سبھی Blocks میں

داخل ہونے سے پہلے اس کے ایک صدر دروازے سے گزرنا پڑتا ہے جہاں اُس ''بلاک''
میں رہنے والے مکینوں نے نجی مسلح ''گارڈس'' (Guards) رکھے ہوئے ہیں۔ پہلے یہ
''گارڈس''، تفصیل سے معلومات کرتے ہیں اور کہیں کہیں تو آنے والے کو اپنا نام، پتہ اور
کس سے اور کیوں ملنا ہے وغیرہ وغیرہ تک رجسٹر پر لکھنا پڑتا ہے۔ کہیں کہیں ''انٹرکوم'' کا
بھی نظام قائم کیا ہوا ہے۔ غرضیکہ ''گارڈس'' مطمئن ہونے کی صورت میں ہی کسی کو اندر
جانے کی اجازت دیتے ہیں۔ اسی طرح جہاں کوٹھیاں ہیں وہاں کالونی میں سڑکوں پر
Barriers لگاتے ہوئے نجی مسلح ''گارڈس'' بٹھائے ہوئے ہیں۔ [اب یہ نظام
ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں جہاں سرمایہ دار رہتے ہیں، میں بھی عام ہو چلا ہے]
رات کو Barrier گرادیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ رہائش کے باہر، صدر دروازوں
پر Telephonic System کے ساتھ بجلی سے گیٹ Lock ہونے کا نظام لگایا ہوا
ہے۔ جب کوئی شخص باہر گیٹ پر گھنٹی کا Switch دباتا ہے تو صاحب خانہ اندر ہی سے
ٹیلیفون یا ''انٹرکام'' کے ذریعہ پہلے آنے والے سے بات کر کے مانوس ہوتا ہے پھر مطمئن
ہو جانے کی صورت میں اندر ہی سے گیٹ کے Electric تالے کا Switch دباتا ہے
جس سے تالا کھلنے سے گیٹ کھولا جا سکتا ہے۔

عورتیں زیورات پہن کر باہر نہیں نکلتیں اور بچوں کو بھی تنہا باہر نہیں نکلنے دیا جاتا۔
[یہ احتیاط اب یہاں بھی برتی جاتی ہے۔] جیسا کہ مجھے بتایا گیا، لُٹیرے بہت ڈرامائی انداز
میں ایک موٹر سائیکل پر کم سے کم دو کی تعداد میں آتے ہیں۔ اگر کسی گھر میں گھسنے کا موقع مل
جائے تو گھر میں گھس کر مکینوں کو یرغمال بنا لیتے ہیں اور پھر زیورات و نقد روپیہ لے کر فرار
ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ مل جائے تو اسے اغوا کر کے ''پھروتی'' طلب کرتے ہیں۔ اگر
کوئی عورت زیورات پہنے باہر مل جائے تو زیورات چھین کر فرار ہو جاتے ہیں۔ کبھی تو ایسا
بھی ہوتا ہے کہ عورتوں سے کوئی بھی نام بتا کر اس کا پتہ پوچھتے ہیں اور پھر اس کو بے خبر پا کر

اس کی کنپٹی پر پستول رکھ کر اس کی سونے کی انگوٹھیاں، چین یا بُندے، جو بھی وہ پہنے ہو، لے کر فرار ہو جاتے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ کوئی مدد کو نہیں آتا [روحانی قدروں کے پامال ہونے اور مادّہ پرستی کے سبب اب ہر شہر میں نفسا نفسی کا عالم ہے۔] اور زیورات یا نقدی خاموشی سے دے دی جاتی ہے۔ پولس میں FIR تک نہیں لکھائی جاتی۔ اُن کا کہنا ہے کہ پولس خود اس میں ملوث ہوتی ہے۔ اور اس کو بھی رہزنوں سے "بھتہ" ملتا ہے۔ اگر FIR کرائیں گے تو نہ تو گئی ہوئی چیز واپس آئے گی اور نہ ہی رہزنوں کو پکڑا جائے گا بلکہ اس کے برعکس رہزن مزید دشمن ہو جائیں گے اور پولس بھی بار بار تھانے بلوائے گی اور پریشان کرے گی۔ اس سے لگتا ہے کہ عوام کو پولس پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ [یہی سوچ اب یہاں بھی پروان چڑھ چکی ہے۔]

پولس فورس کو زیادہ فعال بنانے اور عوام میں اس کا اعتماد بحال کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عوامی سطح پر امن کمیٹیاں قائم ہوں جن میں پولس اہلکار بھی شامل ہوں اور کسی بھی بدامنی کی صورت میں اس علاقے کا تھانہ انچارج ذمہ دار گردانا جائے۔

ایک دن میرے سامنے ہی ایک ایسا حادثہ ہوتے ہوتے بچا۔ میری یا ان رہزنوں کی قسمت اچھی تھی۔ ہوا یہ کہ ایک دن میں اپنی ہمشیرہ، بھانجے اور ایک دوسرے شخص کے ہمراہ بھانجے کی سسرال گیا جہاں ہماری دوپہر کی دعوت تھی۔ جب ہم واپس چلے تو بھانجے کی بیوی ہمیں چھوڑنے کے لئے دوسری منزل سے نیچے تک آئی۔ اس کا بچہ اس کے ساتھ تھا۔ اچانک ایک موٹر سائیکل پر دو نوجوان بظاہر Criminal چہرے مہرے کے ہماری طرف تیزی سے لپکے۔ انھیں دیکھ کر بھانجے کی بیوی تو اپنے بچے کو کھینچتی ہوئی اوپر کو بھاگ گئی۔ میری ہمشیرہ، بھانجہ اور دوسرا شخص فوراً پھرتی سے کار میں بیٹھ گئے۔ ہمشیرہ نے مجھے بھی جلدی سے کار میں بیٹھنے کو کہا لیکن میں سینہ سپر ہو گیا۔ جس سختی سے ان لوگوں نے مجھ سے کسی کا پتہ پوچھا اسی سختی سے میں نے بھی جواب دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ مجھے

گھورتے رہے۔ میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک کا ہاتھ جیب میں تھا اور ایسا لگتا تھا کہ اس کی جیب میں کچھ اور بھی ہے۔ میں آیۃ الکرسی پڑھتا رہا۔ چند لمحوں بعد وہ مجھے گھورتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میں کار میں بیٹھ گیا اور ہم کار اسٹارٹ کر کے چل دئے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ دونوں پھر سے واپس آئے اور جہاں ہم گئے تھے وہاں زینہ کے سامنے جا کر رک گئے ہیں۔ ہم نے سوچا، ہوسکتا ہے کہ بہو اور بچہ ابھی تک اوپر نہ گئے ہوں اور یہ بدمعاش اوپر چڑھ جائیں۔ یہ سوچ کر ہم نے کچھ ہی فاصلہ پر پھر سے کار روک دی۔ جب ہمیں رُکا ہوا دیکھا تو وہ دونوں پھر پلٹے اور ہمارے پاس آکر قدرِ زیادہ تلخ لہجہ میں کہا کہ تم نے پتہ نہ بتا کر اچھا نہیں کیا۔ میں بھی ان سے دو دو ہاتھ ہونے کے موڈ میں تھا۔ میں نے بھی تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے دوسری جانب نکل گئے۔ اگر انھیں واقعی کسی کا پتہ پوچھنا ہوتا تو وہ گلی میں کسی اور سے بھی پوچھنے کی کوشش کرتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ دراصل اگر حوصلہ رکھیں، ہمت کریں اور یکجہتی کا ثبوت دیں تو خود بھی بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ میرے ایک عزیز کے ساتھ پیش آیا۔ رات کو جب وہ عزیز تہجد کی نماز کے لئے اٹھے تو تین آدمی گھر کے اندر آگئے اور اُن سے کہا کہ چچا میاں! ہم آپ کو کچھ نہیں کہیں گے لیکن جو روپیہ، پیسہ، زیورات ہیں وہ ہمارے سپرد کردو۔ عزیز سن رسیدہ، پنشن یافتہ اور اللہ والے تھے۔ انھوں نے جواب دیا کہ بیٹا! چابیاں یہ رکھی ہیں تم خود دیکھ لو، مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ میرے پاس کوئی ایسی قیمتی شے ہے بجز دعاؤں کے، جو میں تمھیں دے سکوں۔ ہاں! البتہ اگر کچھ تمھارے پاس ہے تو دیتے جاؤ۔ یہ سن کر وہ خاموشی سے اسی مکان کے دوسرے حصے میں رہ رہے ایک کرائے دار کے یہاں گھس گئے۔ کرائے دار حوصلہ مند تھا۔ اُس کی اُس رہزن سے ہاتھا پائی ہوگئی جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اسی ہاتھا پائی میں پستول زمین پر گر کر ٹوٹ گیا۔ بدمعاش فوراً فرار ہوگئے۔ بعد میں جب پستول

کو دیکھا تو وہ پلاسٹک کا تھا۔ مجھے بھی میرے عزیز نے اس پستول کی زیارت کرائی۔

ایک اور واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ ایک دن شام کو میں اپنے ایک ایسے عزیز سے ملنے کے لئے گھر سے روانہ ہوا جن کو میں تو جانتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ گھر کے قریب پہنچ کر میں نے سوچا کہ پہلے ٹیلی فون پر ان سے رابطہ قائم کرلیا جائے۔ چنانچہ ایک نزدیکی PCO سے میں نے انھیں ٹیلی فون کیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے مجھ سے صاف الفاظ میں ملنے سے انکار کردیا۔ اب اُن کے نہ ملنے کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ بداخلاق رہے ہوں گے، یا پھر ڈر کی وجہ سے وہ کسی ایسے شخص سے نہ ملنا چاہتے ہوں گے جسے شکل و صورت سے وہ نہ پہچانتے ہوں۔ انھیں بداخلاق تو میں اس لئے نہیں کہہ سکتا کیوں کہ وہاں ہر وہ شخص جو خود کو مہاجر کہتا ہے ہندوستان سے آنے والے مہمان کا پُرتپاک خیر مقدم کرتا ہے، حتیٰ کہ اسے کھانے پر ضرور مدعو کرتا ہے خواہ اس سے کوئی عزیز داری ہو یا نہ ہو۔ اس سلسلے میں محض دو مثالیں پیش کروں گا۔ میں بال کٹوانے کی غرض سے ایک حجام کی دوکان پر گیا۔ حجام باتیں بہت زیادہ کرتے ہیں، یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اس کو یہ پتہ چل گیا کہ میں بجنور کا رہنے والا ہوں اور علی گڑھ سے آیا ہوں۔ بس پھر کیا تھا، اس نے اپنے تمام گراہکوں کی چھٹی کردی اور لگا اپنے اور اپنے خاندان والوں نیز دیگر بستی والوں کے حالات بتانے۔ وہ سہارنپور سے پاکستان گیا تھا۔ اس نے نہ صرف بال کاٹنے کی اجرت میرے ازحد اصرار کے باوجود بھی نہ لی بلکہ اپنے گھر پر کھانے کی دعوت بھی کردی حالانکہ میں نے معذرت چاہ لی۔ اسی طرح ایک دن جب میں ٹیکسی سے اپنی ہمشیرہ کے گھر سے بڑے بھائی (نمبرا) کے یہاں آیا تو پتہ چلا کہ ٹیکسی والا بھی مظفرنگر (یو۔پی) کا رہنے والا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بجنور کا رہنے والا ہوں۔ اتنا سنتے ہی اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پھر لگا مظفرنگر سے متعلق اپنے بچپن کی یادوں کو دہرانے۔ منزل پر پہنچنے کے بعد

اس نے مجھ سے ٹیکسی کا کرایہ نہیں لیا ہر چند کہ میں نے بہت ضد کی۔ ساتھ ہی مجھے دعوت دی کہ ایک دن ضرور اس کے ساتھ کھانا کھاؤں اور اس کی ٹیکسی سے بنا کسی اجرت کے کراچی کی سیر کروں۔ اب آپ ہی بتائیں، جہاں غیروں کا بھی یہ حال ہو وہاں اپنوں کے جذبات کا کیا عالم ہوگا!! مختصراً میں ان عزیز کے رات کے وقت ملاقات نہ کرنے کی وجہ یہی سمجھتا ہوں کہ حالات نے انھیں ایسا برتاؤ کرنے پر مجبور کردیا ہوگا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس فیملی سے میری ملاقات نہیں ہوسکی کیوں کہ پھر میں نے بھی ان سے دوبارہ کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔

مندرجہ بالا بدامنی کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ صنعت کار اپنے کارخانے کراچی سے دیگر مقامات پر منتقل کر رہے ہیں۔ بالآخر اس سے کراچی کی معیشت بھی متاثر ہوگی اور بے روزگاری بھی مزید بڑھے گی۔ تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کراچی چھوڑ کر باہر جا رہا ہے۔ اس سے Brain Drain ہوگا۔ اس روشن شہر کے گلی کوچے شام ہی سے سنسان ہونے لگے ہیں۔

کراچی کے ریلوے اسٹیشن پر ایک قلی نے اپنے تاثرات کچھ اس طرح بیان کیے: ''بھائی جی! جب فوجی حکومت آئی تو سب ٹرینیں اپنے صحیح وقت سے چلنے لگی تھیں۔ ہم نے، مسافروں نے، غرضیکہ سبھی نے راحت محسوس کی لیکن آہستہ آہستہ جہاں سے چلے تھے ہم سب پھر وہیں لوٹ آئے ہیں۔'' وہ اور بھی نہ جانے کیا کیا حالات بیان کرتا رہا اور میں اپنے وطن کے ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا رہا۔ ۱۹۷۵ء میں جب ہمارے یہاں بھی ہنگامی حالات کا اعلان کیا گیا تھا تو تقریباً سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوگیا تھا۔ (ا) ٹرینیں تو اس حد تک اپنے صحیح وقت پر چلنے لگی تھیں کہ اُن سے گھڑی ملائی جاسکتی تھی لیکن پھر کیا ہوا! عوام نے اُس کا کیا انعام دیا!! یہی نہ کہ ۱۹۷۷ء میں عام انتخابات کے وقت ہم نے اُن کی ضمانتیں تک ضبط کرادیں، حتیٰ کہ اندرا جی جیسی کرشمہ ساز شخصیت

بھی شکست سے دوچار ہوئی۔ کسی بھی سیاسی شخصیت کو اس سے زیادہ اور کیا سزا دی جا سکتی ہے؟ دراصل ڈسپلن دو صورتوں میں قائم ہو سکتی ہے؛ یا تو ڈنڈے کے زور سے یا پھر ضمیر کی آواز پر۔ فرق یہ ہے کہ ڈنڈے کا زور تو عارضی ہوتا ہے اور ضمیر کی آواز مستقل ہوتی ہے۔ ڈنڈے سے بچا جا سکتا ہے لیکن ضمیر کی آواز سے مفر نہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارا ضمیر مر چکا ہے اس لئے جب ڈنڈا آتا ہے تو سر بچانے کی فکر کر لیتے ہیں اور ڈنڈا ہٹتے ہی بے حیائی کی چادر تان کر خوابِ خرگوش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

اب حال ہی کے واقعہ کو لے لیجئے، مسٹر بش نے اپنی ہٹ دھرمی سے جس طرح عراق کو تباہ کیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ پہلے تو کہا گیا کہ صدام حسین کے پاس Mass destruction کے اسلحہ کا ذخیرہ ہے اور پھر اس پر حملہ کر کے، صدام حسین کو پھانسی پر لٹکا کر نیز عراق کی معیشت کو تباہ کر کے وہاں کی عوام کو یرغمالی بنا لیا گیا، اور اب مطلب حاصل کرنے کے بعد کہا جا رہا ہے کہ وہ معلومات غلط تھیں۔ مسٹر بش کا یہ عجب اندازِ دلربائی ہے!!۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ پوری مہذب دنیا تب بھی گاندھی جی کے ''تین بندروں'' کے اصول (بری چیز نہ دیکھو، بری بات نہ کہو اور بری بات نہ سنو) کی منکر رہی [عراق پر حملے ہونے سے پہلے]؛ اور ابھی بھی کچھ کہنے کو تیار نہیں ہے۔ اگر ہے تو بس اتنا کہ منتظر الزیدی ہی دہشت گرد ہے۔ [۱۴؍ دسمبر ۲۰۰۸ء کو جس وقت جیورج ڈبلو بش عراقی وزیرِ اعظم، نور المالکی کی موجودگی میں عراق میں الوداعی پریس کانفرنس کر رہا تھا تو قاہرہ میں ''البغدادیہ'' ٹیلی ویژن کے ایک ۲۹ سالہ غیر معروف صحافی، منتظر الزیدی نے یہ کہتے ہوئے اپنے دونوں جوتے یکِ بعد دیگرے بش کو پھینک کر مارنے چاہے، "It is the farewell kiss you dog" (کتے! یہ الوداعی بوسہ ہے۔) (ایسا لگتا ہے کہ منتظر پہلے سے اس کے لئے تیار نہیں تھا ورنہ نشانہ خطا نہ ہوتا۔)] دنیا غریب بھی کیا کرے!، جب اس کے چراغوں میں روشنی ہی نہ رہی ہو جو وہ یہ دیکھ سکے کہ کس طرح منظم طریقے

سے استبدادی اور صیہونی طاقتیں کسی قوم کی بیخکنی اور نسل کشی پر کمر بستہ وعمل پیرا ہیں! کس طرح سے خود ساختہ امن کے پیامبر، مہذب دنیا کے قائد عراق، افغانستان اور فلسطین وغیرہ میں انسانیت کا دامن تار تار کر رہے ہیں! کتنے ہی حسینؑ حق وصداقت کی قربان گاہ پر شہید ہو چکے ہیں!! لیکن کیا کبھی یزیدِ وقت اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو سکا ہے، جواب ہوگا؟ یہ وقتی بات ہے کہ وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دے لیں کہ منتظر الزیدی ایک دہشت گرد ہے۔ بہر حال وقتی طور سے اب ایک طرف تو منتظر کو گرفتار کر کے عراقی حکومت اس پر مقدمہ چلانے کی تیاری کر رہی ہے اور دوسری طرف مظلوم اقوام میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ اور جس طرح صدام حسین پھانسی پر چڑھنے کے بعد شہید کہلائے، اسی طرح منتظر بھی اب ایک ہیرو بن گئے ہیں۔ [لوگ اتنے جذباتی ہو رہے ہیں کہ کوئی کہتا ہے کہ میں اپنی ساری زندگی کا سرمایہ اُن جوتوں کے عوض دینے کو تیار ہوں، تو کوئی اپنی ۲۰ سالہ حسین دختر کی اس سے شادی کرنے کو تیار ہے اور وہ لڑکی بھی اس پر فخر محسوس کر رہی ہے، تو کوئی اپنی لمبی چوڑی بیش بہا مرسریز کاران جوتوں کے بدلے عراق ہی میں جا کر منتظر کو نذر کرنے کا متمنی ہے۔ غرضیکہ بغداد کے مشہور بازار، خیام اسٹریٹ سے خریدے گئے بھورے رنگ کے تسموں والے ان جوتوں کی کروڑوں میں بولی لگ چکی ہے، اور اب تک جس طرح سے صیہونی طاقتوں کے ذریعہ جوتوں کے بل پر تاریخ کو اغوا کیا جا رہا تھا وہی جوتے ان کا مقدر بن چکے ہیں اور ایک نئی تاریخ رقم کرنے کے دہانے پر ہیں۔] مسٹر بش کا یہ دورہ بحیثیت ایک امریکن صدر کے تھا۔ اگر سوچیں اور محسوس کریں، تو اس واقعہ سے نہ صرف مسٹر بش بلکہ پوری امریکی عوام کی بے عزتی ہوئی ہے۔ (مسٹر بش نے تو حسب عادت اسے محسوس کیا نہیں) غیر تمندی کا تقاضہ ہے کہ مقدمہ چلنا چاہئے، لیکن کس پر؟ جڑ پر، یا پھونگل پر؟؟ یہ ایک سوچنے کی بات ہے۔ آج اگر دنیا ہمت کر کے دہشت گردی کے اسباب کی بیخکنی پر آمادہ ہو جائے تو دہشت گرد اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ مگر ہم ہیں کہ

بھوت پروار نہ کر کے اس کے سائے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ مصیبت تو یہ ہے کہ سوتے ہوئے کو جگایا جا سکتا ہے لیکن سوتا ہوا بننے والے کے سرہانے آپ ہزار ڈھول بجائیے، اس کا جاگنا تو کجا، وہ کروٹ بھی نہ لے گا۔ ایسا ہی کچھ حال ہمارا بھی ہے۔ کہہ دیتے ہیں کہ کیا کریں! ہماری کچھ مصلحتیں ہیں، ہماری کچھ مجبوریاں ہیں!!۔ دراصل ہمارے علاقے میں مثل مشہور ہے ''غریب کی بیوی، سب کی لونڈی اور امیر کی بیوی سب کی بھابی''۔ یہی حال ہمارا بھی ہے!!!

حواشی

(۱) یہ صحیح ہے کہ اس دوران کچھ زیادتیاں بھی ہوئیں۔ جیسے: ٹرینوں اور بسوں کو بیچ ہی میں روک کر جبراً مسافروں کی نس بندیاں کردی گئیں۔ Population Control کا ارباب حل وعقد پر کچھ اس درجہ بھوت سوار تھا کہ بعض مرتبہ تو عمر رسیدہ اور غیر شادی شدہ نوجوانوں تک کو بھی نہیں بخشا گیا۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہیں روک دی گئیں: ہر محکمے کا ہدف مقرر کردیا گیا: غرضیکہ ہر شعبہ ہائے زندگی کو نسبندی (Sterlisation) کے تابع کردیا گیا تھا۔ لوگ وقت بے وقت گھر سے باہر نکلنے میں ڈرنے لگے تھے۔ اور پھر دھاندھلیاں بھی خوب خوب ہوئیں؛ بہتوں کی تو چاندی ہوگئی، ایک ایک کیس کئی کئی جگہ رپورٹ کیا گیا اور فرضی آپریشن سرٹیفکٹ بھی خوب جاری کئے گئے وغیرہ وغیرہ۔ اگر کچھ عرصے اور یہی حال رہتا تو بقول شخصیکہ ہندوستان میں میلوں فاصلے سے چراغ ٹمٹماتے اور پھر کھجوراہو کے مندروں کی افادیت کا اندازہ ہوتا۔ [کھجوراہو، مدھیہ پردیش میں، مہوبہ (یو۔پی) سے تقریباً پچاس کلومیٹر فاصلے سے بندیلکھنڈ کے علاقے میں اب خود ایک ضلع ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہ اپنے انوکھے مندروں کے سبب دنیا بھر میں مشہور ایک سیاحی مرکز ہے۔ اسی وجہ سے یہاں ہوائی پٹی بھی ہے۔ یہ مندر جن میں مرد وزن کی مادرزاد برہنہ تصاویر مختلف آسنوں میں پتھروں پر تراشی ہوئی ہیں، ''چندیل'' خاندان کے راجہ دھنگ دیو (۹۵۰ء تا ۱۰۰۲ء)

(شجرہ اختری کی کتاب ''سلطان الشہداء'' میں ملاحظہ فرمائیں۔) نے بنوائے تھے۔ ''چندیل راجاؤں کا قلع قمع ۱۲۰۲ء میں قطب الدین ایبک نے کیا۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۳ء کے درمیان جب میں مہوبہ میں تعینات تھا تو مجھے بھی ایک وفد کے ہمراہ (ماہِ رمضان المبارک میں) وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ میں تو ایک ہی جھلک دیکھ کر باہر آ بیٹھا اور پھر وہیں لان پر ظہر کی نماز ادا کر کے چلا آیا۔] اللہ بھلا کرے جمہوریت کا کہ وقت سے عام انتخابات ہو گئے اور عوام نے اپنے دل کا غبار نکالتے ہوئے تختہ پلٹ کر دیا حتیٰ کہ اندرا جی بھی اپنی گدی نہ بچا سکیں۔

دراصل ''خاندانی منصوبہ بندی'' اندرا جی کے چھوٹے صاحبزادے اور اس وقت کے ابھرتے ہوئے نوجوان کانگریسی نیتا، سنجے گاندھی کے دماغ کی دین تھی۔ کہتے ہیں کہ ''ہاتھی کے پیر میں سب کا پیر'' اس مقولے کے مصداق ہمارے تمام کانگریسی نیتا ہو گئے تھے اور پھر روغن قاز لے کر اعلیٰ حکام کو تو آگے آنا ہی تھا۔ گویا کہ Race تھی کہ کون کس سے آگے نکلے، کون کس سے سبقت لے جائے اور کون کس کا نورِ نظر بن جائے۔ ایسے حالات میں عوام کا پسنا تو یقینی ہو ہی جاتا ہے۔

یہاں سنجے جی کے حوالے سے میں ایک راز پر سے پردہ ہٹانا ضروری سمجھتا ہوں۔ مذکورہ عام انتخابات ۱۹۷۷ء میں ہوئے تھے جس میں کانگریس کے تقریباً سبھی Stalwarts چت ہو گئے تھے حتیٰ کہ اندرا جی جیسی پُرکشش ہستی بھی راج نرائن جی سے مات کھا گئی تھی۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ کانگریسی خود کو کانگریسی ظاہر کرتے ہوئے بھی گھبرانے لگے تھے۔ ایسے ماحول میں، غالباً جنوری ۱۹۸۰ء کے دوسرے ہفتے میں، ایک دن جب اندرا جی بلند شہر تشریف لائیں تو میرا ملازم میرے سب سے چھوٹے بچے، محمد کامران سعید جواب L.L.M. کرنے کے بعد MBA کر رہا ہے، کو گود میں لے کر بھوڑ چوراہے پر آ کھڑا ہوا۔ [میرا خاندان ان دنوں بھوڑ چوراہے پر واقع ایک کوٹھی میں کرائے پر رہتا تھا۔ اس کے ٹھیک سامنے ایک پولس چوکی ہوا کرتی تھی جو اب تھانہ ہو گئی ہے لیکن وہ کوٹھی مسمار کر کے عالیشان عمارتوں میں تبدیل کر دی گئی ہے۔] اس وقت اندرا جی کو خوش آمدید کہنے کے لئے وہاں بمشکل تمام تین یا چار کانگریسی ہی موجود رہے ہوں گے۔ جب اندرا جی وہاں سے

گزریں تو میرے ملازم نے آگے بڑھ کر کامران کا ہاتھ ہوا میں لہرا دیا جس پر اندرا جی نے جب کار رکوا دی تو ملازم نے کامران کے ہاتھوں سے ایک پھولوں کا ہار اندرا جی کے گلے میں ڈلوا دیا۔ اندرا جی نے کامران کے گال کا بوسہ لیا اور پھر چلی گئیں۔ میں ان دنوں بلند شہر کے ایک تحصیل صدر مقام، سکندر آباد میں تعینات تھا۔ اس دن نہروں کا دورہ کرنے کے بعد جب شام کو بچوں کے پاس آیا تو پوری بات کا پتہ چلا۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی طوفان آنے والا ہے۔ [سکندر آباد کا M.L.A. جو برسرِ اقتدار ''جنتا پارٹی'' سے تھا، میرے خلاف چل رہا تھا (مجھ سے پہلے اسے کچھ ناجائز فوائد حاصل ہوتے رہے تھے جو میرے وہاں جوائن کر لینے سے بند ہو گئے تھے۔ میری مخالفت میں میرے کچھ ماتحت بھی اس کے ساتھ تھے۔) وہ بارہا میرے وہاں سے تبادلے کی کوشش بھی کر چکا تھا لیکن کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ (چیف انجینیر نے میرا یہ کہہ کر وہاں تبادلہ کیا تھا کہ سمیع الدین! ایک Challenge پر فتح حاصل کر لینے کے بعد میں تمہیں ایک دوسرے چیلینج پر تعینات کر رہا ہوں جہاں نہریں نالوں سے بھی بدتر حالت میں ہیں۔ تمہیں کچھ کر دکھانا ہے۔ اسی وجہ سے وہ میرے وہاں سے تبادلہ ہونے میں حائل تھے۔)] میرا اندازہ صحیح نکلا اور میرا تبادلہ کر دیا گیا۔ (Order No. सी-34-इ-1/171 विविध/1980, dated 16-1-80)

[MLA کو یہ سنہرا موقع ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے فوراً دہلی جا کر نمک مرچ لگاتے ہوئے چیف منسٹر (ان دنوں چیف منسٹر دہلی آئے ہوئے تھے) سے شکایت کی کہ میں ''کانگریس پارٹی'' سے ہمدردی رکھتا ہوں لہٰذا میرا ضلع سے فوراً ہٹایا جانا بہت ضروری ہے۔ (بابو بنارسی داس جی کا تعلق بلند شہر ضلع سے تھا)] جب کانگریسیوں کو پتہ چلا تو انھوں نے سنجے جی سے پورا واقعہ بیان کرتے ہوئے یہ بتایا کہ اس تبادلے سے کانگریس، بالخصوص اندرا جی کی بے عزتی ہوئی ہے۔ چنانچہ سنجے جی نے دو بار شری ہری سنگھ بالمیکی جو بلند شہر سے ایم۔ پی رہ چکے تھے، کے ذریعہ مجھے بلوایا لیکن میں نے یہ کہتے ہوئے معذرت چاہ لی کہ میں کسی سیاست میں نہیں پڑنا چاہتا، تبادلہ کوئی Punishment نہیں ہے۔ اس پر سنجے جی نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہلوایا کہ اسی سال فروری کے تیسرے ہفتے تک بابو بنارسی داس جی کی منسٹری گر جائے گی اور Governor Rule ہو جائے گا۔ [ان دنوں سنجے جی اور

راج نرائن جی کے درمیان موہن نگر کے ''موہن میکن'' ڈاک بنگلے میں خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ چل رہا تھا۔] چنانچہ ۱۷رفروری ۱۹۸۰ء کو بابو بنارسی داس جی کی سرکار گرگئی اور یو۔پی میں Governor Rule نافذ ہوگیا اور اسلام صاحب (Retd. I.G. Police) کو گورنر کا صلاح کار مقرر کردیا گیا۔ [بابو بنارسی داس جی ۲۸رفروری ۱۹۷۹ء سے ۱۷رفروری ۱۹۸۰ء تک یو۔پی کے وزیر اعلیٰ رہے اور ۱۹۸۵ء میں انتقال کر گئے۔] اس کے بعد میرا بھی تبادلہ روک دیا گیا۔ [Cancellation Order No. C-178ई-1/171 विविध/80, dated 14-3-80]

[۱۲] معاشی حالات

(Economical Conditions)

اگر کسی ایک ہی منقسم خاندان کے ہندوستانی اور پاکستانی افراد کا موازنہ کیا جائے تو میرے تجزیے کے مطابق پاکستانی تعلیمی اور معاشی، دونوں میدانوں میں، ہندوستانیوں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال اور متمول ہیں۔ وہاں زیادہ مواقع ہیں، البتہ ہندوستان کا تعلیمی معیار پاکستان کے مقابلے میں قدرِ بہتر ہے۔ پاکستان میں ہندوستانی مصنفین (Writers) کی کتابوں، بالخصوص Technical Books کی بہت مانگ ہے۔

پاکستان میں ایک متوسط خاندان کے گھر میں بھی Deep Freezer, Deep Geezer، رنگین ٹی۔وی، Cable Network Connection ضرور ہوگا۔ اگر کچھ اور زیادہ خوشحال خاندان ہے تو اس کے گھر میں Air Conditioner, Computer، ٹیلی فون، کمروں میں فرشی قالین ضرور ہوں گے۔ گیس کا کنکشن تو وہاں تقریباً ہر گھر میں ہے۔ باورچی خانے کے ساتھ ساتھ کمروں میں بھی

بجلی کی طرح گیس کی لائن سے کنکشن ہیں۔ ہر کمرے میں گیس سے جلنے والی لالٹین لگی ہوتی ہیں۔بجلی جانے کی صورت میں فوراً ان لالٹینوں کو روشن کر دیا جاتا ہے۔

''مارکیٹس'' ملکی نیز غیر ملکی سامان سے بھری ہوئی ہیں۔ غیر ملکی سامان میں چین اور کوریا سرِ فہرست ہیں، اگر ایک چھوٹا سا کھلونا، ٹین کی کار بھی خریدیں تو وہ بھی چین کی بنی ہوگی۔اب تو یہاں بھی چینی کھلونوں اور دیگر اشیاء کی بھر مار ہے۔ بلکہ دنیا کے ہر خطے میں چینی مصنوعات، خاص کر کھلونے چھا چکے ہیں۔

وہ "Multi-National Companies" جو ہندوستان اور پاکستان، دونوں میں مال تیار کرتی ہیں، ان کے ایک ہی برانڈ کے پروڈکٹ پاکستان میں قدر Superior کوالٹی کے ہیں۔جیسے Cosmetics، شیونگ بلیڈ وغیرہ۔جس کا میں نے خود تجربہ کیا۔

سوکھی اور خشک میوہ نیز پھلوں کی تو بہت افرائط ہے۔سوکھی میوہ میں چلغوزے [ہمارے یہاں اکثریت اس میوہ کے نام سے بھی نا آشنا ہے جب کہ وہاں یہ مونگ پھلی کے انداز میں استعمال ہوتی ہے۔] بادام، چھوارے اور آخروٹ؛ خشک میوہ میں منقہ، کشمش اور پھلوں میں کینو، سردا، گرما، انگور [چمن کا انگور مشہور ہوتا ہے جو پاکستان میں واقع ہے۔] انار [قندھار، جو افغانستان میں واقع ہے کا انار مشہور ہوتا ہے۔] چینی سیب اور آم اچھے معیار کے، وافر مقدار میں اور سستے داموں پر دستیاب ہیں۔چینی سیب کا رنگ کچھ پیلا پن لئے (چینی عوام کی طرح) ہوتا ہے اور یہ بہت خوش ذائقہ ہوتا ہے۔

عوام کی خوشحالی کا یہ عالم ہے کہ ایک اوسط درجے کا خاندان بھی مرغی کا گوشت استعمال کرتا ہے۔گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں جن کو ''ماسی'' کہتے ہیں، ۲۵۰ سے ۳۰۰ روپیہ کے درمیان فی کام ماہانہ اجرت لیتی ہیں۔ یہ ''ماسیاں'' پنجابی، بنگلہ دیشی یا South Indian مہاجر ہوتی ہیں۔ پٹھان اور بلوچی اپنی

عورتوں کو باہر نہیں نکلنے دیتے۔

پاکستان میں معیارِ زندگی بلند ہونے یا معاشی خوشحالی کی ایک خاص وجہ اس کے برادر عرب ممالک سے خصوصی تعلقات ہیں جس کی وجہ سے ہر خاندان کا ایک نہ ایک فرد خواہ وہ وہاں مزدوری یا صفائی کا کام ہی کرتا ہو، ضرور مشرقِ وسطیٰ میں خدمات انجام دے رہا ہوگا۔ اس کے علاوہ وہاں سے یورپین ممالک اور امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا جانا قدرِ آسان ہے۔ اس سے ملک میں زرِ مبادلہ آتا ہے اور عوام کی قوتِ خرید بڑھتی ہے۔

جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان میں عوام خوشحال ہیں وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پاکستانی حکومت کی معاشی حالت ہندوستانی حکومت کے مقابلے میں بہت خستہ ہے لیکن دونوں حکومتوں کے معاشی حالات کا تجزیہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آزادی سے پہلے انگریزوں نے اُن علاقوں کا Industrialization نہیں کیا یا ان علاقوں میں Developmental Work نہیں کرایا اور نہ ہی Educational Institutes ہی کھولے جہاں سے انھیں سپاہی ملتے تھے۔ آج پاکستان ان علاقوں کا نام ہے جہاں سے انگریزوں کو سپاہی دستیاب ہوتے تھے۔

۲۶ راپریل کو میں نے انڈین چیک پوسٹ، اٹاری پر پاکستانی کرنسی کے پانچ سو روپیہ "اسٹیٹ بینک آف انڈیا" کے کاؤنٹر پر بدلے۔ اس کے بدلے میں مجھے انڈین کرنسی کے محض تین سو پچیس روپیہ ہی ملے۔ یعنی پاکستانی کرنسی انڈین کرنسی کے مقابلے میں ۵۶ فی صدی تھی۔ [۲۰۰۱ء میں]

حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں عوام خوشحال اور حکومت کنگال ہے۔ جب کہ ہندوستان میں حکومت خوشحال اور عوام کنگال ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں Tax Payees کی شرح پاکستان سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی استحکام کا بھی اس میں بہت دخل ہے۔ پھر پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے۔ وہاں

شراب پر پابندی ہے جب کہ ہندوستان میں جمہوریت ہے اور یہاں قدم قدم پر نیز تقریباً ہر گاؤں میں شراب کی دکانیں ہیں۔ اس سے حکومت کو زرِ کثیر ملتا ہے۔

دونوں حکومتوں کے مندرجہ بالا معاشی فرق کی ہی وجہ سے پاکستان میں حکومتی اداروں کی حالت خستہ ہے جب کہ ہندوستان میں سرکاری ادارے اپنے پیروں پر مضبوطی سے کھڑے ہیں۔ محکمۂ ریلوے ہو یا Industrial Sector؛ محکمۂ ٹرانسپورٹ ہو یا Agriculture Sector؛ Film Industry ہو یا Information & Technology Sector، ہندوستان پاکستان سے بہت آگے ہے اور یہ بات پاکستانی عوام بھی تسلیم کرتے ہیں مگر یہ کہہ کر کہ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور اس کے Resources بھی بہت زیادہ ہیں، جو کسی حد تک صحیح بھی ہے۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری کا تو یہ عالم ہے کہ اس کے سامنے پاکستانی فلم انڈسٹری طفلِ مکتب جان پڑتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہندوستانی فلم انڈسٹری میں جو صفِ اول کی ہستیاں ہیں ان میں سے زیادہ تر کے خاندان کا تعلق انھیں علاقوں سے ہے جو اب پاکستان میں ہیں۔ مثال کے طور پر ''کپور خاندان''، ''پٹھان خاندان'' (شہنشاہِ جذبات یوسف خاں المشہور بہ دلیپ کمار اور کنگ خان، شاہ رخ خان وغیرہ) اور ''بھٹ خاندان'' وغیرہ وغیرہ۔ گھروں میں، ریستوراں میں، دوکانوں پر، ٹیکسیوں اور بسوں میں حتیٰ کہ محفلوں تک میں انڈین گانے (خاص کر 'برسات'، 'آوارہ'، 'مغلِ اعظم'، 'آہ'، 'پاکیزہ'، 'انارکلی' وغیرہ فلموں کے۔) ہی سنے جاتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، تقریباً ہر گھر میں Cable Network کنکشن ہے۔ پاکستانی شائقین زیادہ تر انڈین چینلس پر انڈین فلمیں (خاص کر 'مغلِ اعظم'، 'شعلے'، 'انارکلی'، 'صاحب بی بی اور غلام' وغیرہ) اور ڈرامے ہی دیکھا کرتے ہیں۔ انھیں انڈین فلم انڈسٹری سے جُڑے ہر اداکار اور اداکارہ کے بارے میں خوب خوب جانکاری ہے، حتیٰ کہ ان کی نجی زندگی کے بارے میں بھی۔ حد یہ ہے کہ

نوجوان نسل نے تو انڈین فلم اداکاراؤں اور اداکاروں کے فوٹو تک Computers میں Feed کئے ہوئے ہیں اور جب جی چاہتا ہے درشن کر لیتے ہیں۔ البتہ غزل گائیکی اور اردو شعر و شاعری کے معاملے میں حالات مختلف ہیں۔ اس میدان میں پاکستان، ہندوستان سے صدیوں آگے ہے۔ پاکستانی ڈرامے حقیقت کے بہت قریب محسوس ہوتے ہیں اور ان میں اداکاری Natural دکھائی دیتی ہے۔ ان میں مکالمے جاندار اور گیت یا نغمے بامعنی ہوتے ہیں۔ اسی لئے ہندی غیر مسلم پڑھے لکھے گھرانوں میں بھی پاکستانی ڈراموں کا بہت craze ہے۔ لب ولہجہ کا بھی عوام میں مقبولیت سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ چونکہ پاکستانی فلم انڈسٹری میں زیادہ تر پنجابی نژاد ہیں جن کا اپنا ایک منفرد لب ولہجہ ہوتا ہے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ کراچی میں جو اردو بولنے والے ہیں وہ بمبئی کا اور ہندوستان میں جو پنجابی بولنے والے ہیں وہ لاہور [پاکستانی پنجاب میں لاہور کی فلم انڈسٹری اپنے ملک میں سب سے پرانی ہے۔] کا لب ولہجہ زیادہ پسند کرتے ہوں۔

پاکستانی ریلوے اور ہندوستانی ریلوے کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں جہاں ریلوے اسٹیشنوں کا Renovation اور ان کا Extension کیا گیا ہے وہیں ٹرینوں کی رفتار اور ان میں مزید بوگیوں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ بوگیوں کو آرام دہ اور جدید بنایا گیا ہے۔ Railway Track کی Maintenance بھی اتنی عمدہ ہے کہ ٹرین کی رفتار بڑھا دیئے جانے کے باوجود بھی زیادہ کچھ جھٹکے محسوس نہیں ہوتے، کافی کچھ لمبائی میں Track ڈبل اور Electrified بھی کر دیئے گئے ہیں۔ اُدھر پاکستان ریلوے کی حالت خستہ ہے۔ زیادہ تر بوگیاں بہت پرانی اور تکلیف دہ ہیں۔ ان میں خستگی کا تو یہ عالم ہے کہ اندر سے جگہ جگہ فرش اور Sides سے Covers اُدھڑ گئے ہیں، گدیاں پھٹ گئی ہیں اور اُن میں سے Cushion نکلنے لگا ہے۔ زیادہ تر کھڑکیوں میں گلاس ندارد ہیں، بلکہ اپنی مرضی کی وہ خودمختار ہوگئی ہیں۔ اگر

آپ کھڑکی اٹھائیں تو وہ خود بخود نیچے گر جائے گی اور اگر نیچے گرائیں تو جھٹکے سے خود بخود اوپر اُٹھ جائے گی۔ کراچی سے واپسی پر ایک پُر لطف منظر دیکھنے کو ملا۔ ایک پنجابی مسلم فیملی کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ کھڑکی کچھ مذکورہ خود مختاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ پہلے تو بار بار اس فیملی کا ایک سن رسیدہ شخص اُس کو اوپر اٹھاتا رہا لیکن بعد میں اس نے قدرِ غصہ میں آ کر ایک کھڑکی کو تو ایک کمر بند کے ذریعہ کھڑکی میں لگی Horizontal bars سے باندھ دیا اور دوسرے کے نیچے سوراخ میں پتھر سے ایک لکڑی ٹھوک دی۔ تب جا کر اس بندھن اور ٹھوکا پیٹی سے کھڑکی باز آئی۔

Railway Track کے Maintenance کا تو یہ عالم ہے کہ جب ٹرین کچھ رفتار پکڑتی ہے تو مسافر جھولا جھولنے لگتے ہیں۔ ڈر اس بات کا ہے کہ اگر حکومت کو ریلوے ڈپارٹمنٹ کے اس جھولے کا پتہ چل گیا تو کہیں وہ ٹکٹ کی قیمت میں اضافہ نہ کر دے۔

''سمجھوتہ ایکسپریس''میں، میں نے دیکھا کہ پاکستانی ریل میں مال گاڑیوں کی بوگیوں کا اضافہ کیا جاتا ہے جن میں مسافر بھی بیٹھتے ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ پاکستان ریلوے کے پاس بوگیوں کی ازحد کمی ہے۔ ٹرین میں Reservation کرانے کے لئے Reservation Slip کی ضرورت نہیں پڑتی۔ Reserved Bogies میں عام مسافر بنا روک ٹوک سفر کرتے ہیں۔ [اب یہ مرض یہاں بھی عام ہو چلا ہے۔]

آزادی کے بعد سے ریلوے اسٹیشنوں کی حالت میں تو شاید کوئی سدھار لایا ہی نہیں گیا۔ Platforms پر جو شیڈ آزادی کے وقت رہے ہوں گے وہ بدستور موجود ہیں۔ اگر فرق آیا ہے تو محض اتنا کہ اُن کی Sheets خستہ ہو گئی ہیں۔ اس سے حکومت کے آثارِ قدیمہ سے لگاؤ کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ ابھی بھی بہت عمدگی سے پرانی یادوں کو

سینہ سے لگائے ہیں۔ ایسا نہیں ہے جیسا کہ ہم نے پرانی یادوں کو بھلانا شروع کر دیا ہے، حتیٰ کہ شہروں اور شاہراہوں کے ناموں کو بھی تبدیل کر دیا ہے۔ بس اب مقبروں، مزارات اور خانقاہوں کے نام تبدیل کرنے کے سفر پر نکلنا باقی ہے۔ ویسے اس سمت میں بھی شروعات ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو کی جا چکی ہے۔ (۱) یاد پڑتا ہے کہ جب شروع شروع میں شاہراہوں کے نام تبدیل کئے گئے تو ماسٹر تارا سنگھ جی نے قدرِ طنزیہ لہجہ میں چٹکی لیتے ہوئے جواہر لعل جی سے کہا تھا کہ کیوں نہ ہمایوں کے مقبرہ کا بھی نام تبدیل کر کے جواہر لال جی کا مقبرہ کر دیا جائے۔

حواشی

(۱) ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء ہندوستان کی تاریخ کا وہ سیاہ دن ہے جس دن ایک منظم طریقے سے "ہندو دہشت گردوں" [خود ساختہ "رام بھگتوں"] نے تاریخی "بابری مسجد" کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا تھا تاکہ وہاں رام مندر تعمیر کیا جا سکے۔ ویسے تو رام رتھ یاترا کے بانی اور سابق ہندوستانی وزیر داخلہ جناب مسٹر جناح کے قصیدے پڑھ رہے ہیں، ایک انکوائری کمیشن کے سامنے یہ بیان دے چکے ہیں کہ مذکورہ مسجد کو شہید کرنے کا پہلے سے کوئی پلان نہیں تھا بلکہ وہ خود ساختہ "رام بھگتوں" کے جوش کی نذر ہو گئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ضمن میں پہلے سے بخوبی مشقیں کی جا چکی تھیں اور یہ معاملہ ضرور ہماری سرکاری خفیہ تنظیموں کے علم میں بھی رہا ہوگا۔ مجھے خود میرے ایک دوست جو "وشو ہندو پریشد" سے ہیں نے کافی عرصہ پہلے وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو رونما ہوا۔ [تفصیل کے لئے احقر کی کتاب "سید عبدالرحمٰن بن فضل اللہ" ملاحظہ فرمائیں۔] ان دنوں احقر دیوریا میں تعینات تھا۔ گرچہ مجھے اس وقت اس دوست کے کہنے پر یقین نہیں آیا تھا [جس کی مناسب وجوہات تھیں] پھر بھی میں دیوریا سے فوراً علی گڑھ آیا [جہاں میرے بچے رہتے تھے۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر واقعی ایسا سانحہ ہو گیا تو ضرور کشیدگی پیدا ہوگی، اور ہو سکتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات بھی پھوٹ نکلیں۔ ویسے

بھی علی گڑھ ایک Volcanic شہر ہے۔] میں نے احتیاطاً کسی سے یہ بات نہیں بتائی [اس دوست نے مجھ سے یہ وعدہ لے لیا تھا کہ میں کسی کو یہ بات پہلے سے بتاؤں گا نہیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ خبر ہضم بھی نہیں ہو رہی تھی۔] میں نے اپنے محلے کا خاموشی سے سروے کرا کر ان خاندانوں کی ایک فہرست مرتب کر لی تھی جو مزدور پیشہ تھے۔ کئی بوریاں گیہوں کی پسوا کر، وافر مقدار میں نمک، مرچ وغیرہ اسٹور کر لیا تھا۔ مکان کی چھت کے اوپر کافی تعداد میں کنڈوں کا ڈھیر لگوا لیا تھا۔ غرضیکہ جب ۶ / دسمبر آیا اور صیہونی طاقتوں کے اس کالے کارنامے کی وجہ سے ماحول گرمایا اور علی گڑھ میں کرفیو لگا تو بنا تفریق مذہب و ملت میں مذکورہ خاندانوں کو کرفیو کے دوران مستقل روزانہ دو وقت کے لئے نمک، مرچ، آٹا اور کنڈے فراہم کرتا رہا۔

اب آگرہ کے تاج محل، دہلی کے قطب مینار وغیرہ کے بارے میں بھی صیہونی طاقتیں تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہی ہیں۔ [خدا خیر کرے] ان کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ جودھا بائی نام کی اکبر کی کوئی راجپوت رانی تھی ہی نہیں۔ دراصل ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' ہو رہا ہے۔

[۱۳] قابلِ دید چند یادگاریں

(Worth Seeing Few Monuments)

۱۔ **''مزارِ مبارک حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ'':** حضرت عبداللہ شاہ غازیؒ سیدنا حضرت امام حسنؓ [م ۵۰ھ (۶۷۰ء)] کے پڑپوتے بتائے جاتے ہیں، اور یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ آپ کا سنہ ولادت ۹۸ھ (۷۱۶ء) اور سنہ شہادت ۱۵۱ھ (۷۶۸ء) ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ آپ نے محمد بن قاسم [عاملِ بصرہ، حجاج کا بھانجہ جس

نے خلیفہ ولید کے زمانے میں ۹۲ھ (۷۱۰ء) میں ساحلِ سندھ سے ملتان تک کے علاقے کو فتح کر کے اس میں اسلامی پرچم لہرایا اور ۹۷ھ (۷۱۵ء) میں اپنوں ہی کے ہاتھوں شہید کر دیا گیا۔] کو سندھ پر حملہ کرنے کی بشارت دی تھی۔ ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ آپ محمد بن قاسم کے لشکر کے ساتھ وارد ہو کر شہید ہوئے۔
سیدنا حضرت حسنؓ کے سنہ شہادت کے حوالے اور "علم الانساب" کی رو سے یہ تو صحیح ہو سکتا ہے کہ آپ سیدنا کے پڑپوتے رہے ہوں اور آپ کا سنہ شہادت ۱۵۱ھ رہا ہو؛ لیکن آپ کے سنہ شہادت اور محمد بن قاسم کے سنہ شہادت نیز اس کے سندھ کو فتح کرنے کی رو سے یہ صحیح معلوم نہیں دیتا کہ آپ محمد بن قاسم کے لشکر کے ساتھ وارد ہوئے یا آپ نے محمد بن قاسم کو حملہ کرنے کی بشارت دی تھی۔ [خدا ہی بہتر جانتا ہے۔]
یہ مزار شریف کلفٹن میں باغ ابنِ قاسم کے نزدیک، سطحِ زمین سے تقریباً ۸۰ میٹر اونچی ایک پہاڑی پر واقع اور تقریباً ایک ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر ۹۱۸ء میں ہوئی۔ مزار کے گنبد اور دیواروں پر سفید اور ہرے رنگ سے دھاریاں پینٹ کی ہوئی ہیں جو بہت خوشنما اور جاذب نظر دکھائی دیتی ہیں۔ پورے مزار کو رنگ برنگی جھنڈیوں اور جھنڈوں سے سجایا ہوا ہے۔
مزار شریف پر ہر وقت زائرین کا مجمع لگا رہتا ہے۔ آپ کے توسط سے منت مانگنے والے مزار کے چاروں جانب والی نقرئی ریلنگ کو چومنے اور اس پر پھولوں کے ہار چڑھانے کے لئے گھسٹ کر

چلتے ہیں۔

۲۔ ''مزارِ قائدِ اعظم'': یہ نوے فٹ اونچے پلیٹ فارم پر اور کراچی کی مصروف ترین شاہراہ، ایم۔اے۔ جناح روڈ پر واقع ہے۔ پلیٹ فارم کی لمبائی ۳۰۰ فٹ اور چوڑائی ۲۷۵ فٹ ہے۔ پلیٹ فارم سے مزار کے گنبد تک اونچائی ۱۰۶ فٹ اور ۶ انچ ہے۔ اس کی تکمیل ۱۳۹۰ھ (۱۹۷۰ء) میں ہوئی۔ [مسٹر جناح کا انتقال ۱۱ر ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہوا۔] مزار کا ڈیزائن ماہرِ تعمیرات (Architect)، یحییٰ مرچنٹ نے تیار کیا تھا۔ یہ ایک Massive Structure ہے۔ ہو سکتا ہے کہ صاحبِ مزار کی شخصیت کو ذہن میں رکھ کر اس کو ڈیزائن کیا گیا ہو۔ ویسے بحیثیت ایک انجینیر مجھے اس کا Elevation پسند نہیں آیا۔ البتہ Location بہت عمدہ ہے۔ مزار کے نزدیک ہی پاکستان کے پہلے وزیر اعظم، نواب زادہ لیاقت علی خاں؛ قائدِ اعظم کی ہمشیرہ، محترمہ فاطمہ جناح؛ سردار عبدالرب نشتر اور نور الامین کے بھی مزارات ہیں۔

۳۔ ''تین تلواریں'': یہ Monument کلفٹن میں واقع ہے جو سنگِ مرمر کا بنا ہے۔ کہتے ہیں کہ تین تلواروں سے مراد قائدِ اعظم کے تین اصول: اتحاد، یقینِ محکم اور نظم و ضبط سے ہے۔ اس کو ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی ''پاکستان پیپلس پارٹی'' کے منشور بطور تعمیر کرایا تھا۔ پہلے ان کو P.P.P [Pakistan People's Party]

کے پرچم کے تین رنگوں: کالا، ہرا اور لال میں پینٹ کرانے کی تجویز تھی لیکن بعد میں ان کو سفید ہی رہنے دیا گیا۔

۴۔ ''گورنر ہاؤس'': یہ تقریباً ۴۰ ایکڑ کے وسیع وعریض رقبہ پر سول لائن میں واقع ہے۔ اس کے اطراف کمشنر سیکریٹریٹ، کراچی جمخانہ، باغِ قائدِ اعظم (پولو گراؤنڈ) اور شمال مغرب میں ہیولاک روڈ واقع ہے جس پر اس کا مین گیٹ ہے۔ اس کو سر چارلس نپیئر، کمشنر سندھ نے بطور اپنی رہائش گاہ تعمیر کرایا تھا۔ پہلے یہ ایک منزلہ تھی لیکن بعد میں، (۱۸۵۶ء میں) اس میں بالائی منزل کا بھی اضافہ کر دیا گیا۔

۵۔ ''چیمبر آف کامرس'': یہ سندھ مدرسہ کے قریب فریئر روڈ پر واقع ہے۔ اس کی تعمیر کے لئے ۱۸۲۳ء میں قطعہ اراضی الاٹ کی گئی تھی۔ ۱۸۶۵ء میں اس کی افتتاحی تقریب انجام پائی۔

۶۔ ''میونسپل کارپوریشن'': یہ بندر روڈ پر واقع ہے۔ اس کا سنگِ بنیاد ۴ر دسمبر ۱۸۹۵ء کو بمبئی کے گورنر، لارڈ سینڈ ہرسٹ نے رکھا تھا۔ یہ مصری، اسلامی اور ہسپانوی فنِ تعمیر کے ملے جلے طرز پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس کی چھت پر چار خوشنما گنبد اور درمیان میں، سامنے کی جانب مرکزی دروازہ پر ۶۲ فٹ اونچا ٹاور ہے جس کے چاروں اطراف میں چار گھنٹے نصب ہیں۔ ۷ر جنوری ۱۹۳۲ء کو اس کی افتتاحی تقریب ہوئی تھی۔

۷۔ "کراچی پورٹ ٹرسٹ": یہ عمارت ۱۹۱۶ء میں تعمیر ہوئی اور افتتاحی تقریب ۵رجنوری ۱۹۱۶ء کو بمبئی کے گورنر، لارڈ لنگڈن کے ہاتھوں انجام پائی تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران اس کو اسپتال میں تبدیل کردیا گیا تھا لیکن پھر مئی ۱۹۱۹ء میں اسپتال کو ختم کردیا گیا۔

۸۔ "سندھ ہائی کورٹ": یہ سندھ اسمبلی کے سامنے واقع اور سنگِ سرخ سے مقامی اور رومن طرزِ تعمیر کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا تعمیراتی کام ۱۹۲۹ء میں مکمل ہوا اور اس پر اس وقت تین لاکھ روپیہ لاگت آئی تھی۔

۹۔ "فلیگ اسٹاف ہاؤس": یہ فاطمہ جناح روڈ پر واقع ہے۔ ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) میں اس عمارت کو قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اس کے مالک سہراب کٹرک سے خرید لیا تھا۔ اب حکومت نے اس کو قائدِ اعظم کی یادگار بطور اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔

۱۰۔ "ہندو جمخانہ": اس عمارت کو آرکیٹیکٹ آغا احمد حسین نے ڈیزائن کیا تھا۔ اس کا طرزِ تعمیر راجستھان کے شاندار محلات سے ملتا جلتا ہے جس میں مغل اور ہندو، دونوں کی ثقافت کی جھلک ملتی ہے۔ یہ "بزنس گارڈن" کے سامنے واقع ہے۔

۱۱۔ "پارسیوں کی عبادت گاہ": یہ فریئر اسٹریٹ صدر میں واقع ہے۔ اس کے آرکیٹیکٹ مسٹر مستری تھے۔ یہ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں تیار ہوئی۔

۱۲۔ ''موہاٹا پیلیس'': سنگِ سرخ کی یہ خوشنما عمارت کلفٹن کے پُر فضا مقام پر واقع ہے۔ اس کو کراچی کے ممتاز تاجر مسٹر شورتن موہاٹا نے تعمیر کرایا تھا۔ طرزِ تعمیر ہندو جمخانہ جیسی ہے۔ اس کے آرکیٹیکٹ بھی آغا احمد حسین تھے۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی زندگی کے آخری ایام اسی بلڈنگ میں گزارے۔ اسی لئے اس کا نام قصرِ فاطمہ بھی رکھ دیا گیا تھا۔ یہ عمارت کچھ عرصہ تک پاکستان کے دفتر خارجہ کے تصرف میں بھی رہی۔

۱۳۔ ''وکٹوریہ میوزیم'': یہ عمارت بطور میوزیم بنائی گئی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد اس کو بطور ''اسٹیٹ بینک آف پاکستان'' کے استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد اس میں کئی دیگر دفاتر رہے۔ اب پھر سے اس کو بطور میوزیم استعمال کرنے کے لئے خالی کرالیا گیا ہے۔

[۱۴] مختصراً کراچی میں ترقیاتی کام

۱۔ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۱ء) میں کراچی سے پہلا سرکاری اخبار شائع ہوا۔

۲۔ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں کراچی میونسپلٹی وجود میں آئی۔

۳۔ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۶ء) میں ریلوے اسٹیشن کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔

۴۔ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں امریکہ میں خانہ جنگی کی وجہ سے ہندوستانی کپاس کی بیرونی منڈیوں میں مانگ بڑھ گئی جس کی وجہ سے کراچی بندرگاہ سے

Export ہونے والے مال کی مالیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

۵۔ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) میں کینٹ ریلوے اسٹیشن تعمیر ہوا۔

۶۔ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء) میں کراچی گیہوں اور کپاس کی Export کرنے والا ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ ہوگیا۔

۷۔ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں ٹیلیفون سروس شروع ہوئی۔

۸۔ ۱۲۸۴ھ (۱۸۷۷ء) میں دنیا کا پہلا بیڈ منٹن میچ یہیں کھیلا گیا۔

۹۔ ۱۳۰۴ھ (۱۸۸۶ء) میں کراچی پورٹ ٹرسٹ قائم ہوا۔

۱۰۔ ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۷ء) میں کراچی پورٹ پر ایک مینار تعمیر کیا گیا جس کی روشنی ۲۹ کلومیٹر دور تک سمندر میں دیکھی جاسکتی تھی۔ ابتداء میں اس مینار کو ناریل کے تیل سے روشن کیا گیا تھا۔

۱۱۔ ۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء) میں پہلا پوسٹ آفس کھولا گیا۔

۱۲۔ ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں کراچی پورٹ پر انتہائی طاقتور روشنی والا مینار تعمیر ہوا جس کی روشنی ۱۱۲ سے ۱۲۸ کلومیٹر دور تک سمندر میں دیکھی جاسکتی تھی۔ اُس وقت یہ دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور روشنی کا مینار تھا۔

۱۳۔ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) میں کراچی میں بجلی کی ترسیل شروع ہوئی۔

۱۴۔ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۴ء) میں پہلی جنگِ عظیم کے دوران کراچی کو فوجی چھاؤنی بنایا گیا۔

۱۵۔ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں بس سروس شروع ہوئی۔

۱۶۔ ۱۳۷۰ء (۱۹۵۰ء) میں موجودہ جگہ پر ریڈیو پاکستان منتقل ہوا۔

۱۷۔ ۱۳۷۱ھ (۱۹۵۱ء) میں کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی۔

۱۸۔ ۱۳۸۴ھ (۱۹۶۴ء) میں لوکل ٹرین چلائی گئیں۔

۱۹۔ ۱۳۸۷ھ (۱۹۶۷ء) میں پاکستان ٹیلی ویژن کراچی سینٹر شروع ہوا۔

۲۰۔ ۱۴۰۱ھ (۱۹۸۰ء) میں برِ اعظم ایشیا میں مصنوعی گھاس کا پہلا میدان ''کلب آف پاکستان اسٹیڈیم'' کراچی گراؤنڈ میں لگایا گیا۔

۲۱۔ ۱۴۰۴ھ (۱۹۸۳ء) میں مدینۃ الحکمت کی تعمیر کا کام شروع ہوا جسے جناب حکیم محمد سعید، مالک ''ہمدرد دواخانہ'' پاکستان نے ہلکانی میں آباد کیا۔

۲۲۔ ۱۴۱۲ھ (۱۹۹۱ء) میں ''علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن'' نے ''سر سید یونیورسٹی آف انجینیر نگ اینڈ ٹیکنالوجی'' کی بنیاد رکھی۔

۲۳۔ ۱۴۱۴ھ (۱۹۹۳ء) میں کراچی کے جدید ''قائدِ اعظم انٹرنیشنل ایرپورٹ'' کا افتتاح ہوا۔

[۱۵] مختصراً کراچی کی اہمیت

۱۔ سکندرِ اعظم کے بحری کمانڈر، نیارکس کے بحری بیڑے نے ۸/ اکتوبر ۳۲۶ قبل مسیح کراچی کی بندرگاہ پر چوبیس گھنٹے کا قیام کیا تھا۔ اس وقت کراچی کو کروکالا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

۲۔ موجودہ کراچی کے قریب ہی ہندو و مسلمان، دونوں مذاہب کے اہم اور متبرک مقامات ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس مہادیو کے مندر کا ذکر رامائن میں ہے وہ یہیں تھا۔ رام باغ جہاں رام چندر جی اور سیتا جی نے بلوچستان میں واقع ھنگلاخ جاتے ہوئے ایک رات بسر کی تھی، وہ بھی یہیں تھا۔ دسویں صدی کے صوفی بزرگ، عبداللہ شاہؒ اور ان کے بھائی یوسف شاہؒ کے مزارات اور بارہویں صدی کے منگھو پیر کا مزار یہیں واقع ہیں۔ اس کے علاوہ باتھ جزیرے پر،

گورنمنٹ عمارات کے نیچے راجہ دیبورائے کی سولہویں صدی کے دار الخلافہ کے کھنڈرات (Remains) بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔

۳۔ مغل شہنشاہ، جلال الدین محمد اکبر اور اس کے جنرل عبدالرحیم خانِ خاناں نے ٹھٹہ کے بعد یہیں منوڑا میں قیام کیا تھا۔

۴۔ مولانا محمد علی جوہر، ان کے بھائی مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد مدنیؒ وغیرہ کو خلافت تحریک کی پاداش میں ستمبر ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء) میں گرفتار کر کے یہیں ان پر خالق دینا ہال میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔

۵۔ یہیں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' کا ۱۳۲۵ھ (۱۹۰۷ء) میں پہلا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔

۶۔ ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں نادر شاہ درّانی کے ایک اعلیٰ فوجی کمانڈر، مظفر علی خاں نے یہیں سے ٹھٹہ کا سفر کیا تھا۔

۷۔ یہ ہندوستان کا وہ پہلا شہر ہے جس پر ملکہ وکٹوریہ کے دورِ حکومت کے ساتھ ہی قبضہ ہوا۔

۸۔ خطوطِ غالب میں بھی اس شہر کا تذکرہ ہے اور مولانا الطاف حسین حالیؔ بھی یہاں تشریف لا چکے ہیں۔

۹۔ یہیں پاکستان کے بانی، قائدِ اعظم محمد علی جناح ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) میں پیدا ہوئے تھے۔ یہیں انھوں نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدہ کا حلف اٹھایا اور یہیں ۱۱ ستمبر ۱۳۶۸ھ (۱۹۴۸ء) کو سپردِ خاک کیے گئے۔

۱۰۔ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں یہاں بھی انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی لیکن وہ کچل دی گئی اور آزادی کے متوالوں کو توپوں سے اڑا دیا گیا۔

[۱۶] کراچی میں میری مصروفیات

مجھے پاکستان میں محض ایک ماہ قیام کا ویزا منظور ہوا تھا لیکن اُسی ماہ کے عرصہ میں ۱۳/ مارچ (صبح کے دو بجے) کو میرے ایک نوجوان (سنہ پیدائش ۱۹۴۷ء) بھتیجے کا اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے سے کراچی میں ہی انتقال ہو گیا۔ ہوا یہ کہ اس کی لڑکی کی رخصتی تھی۔ ہم سب خوشی خوشی اس میں شریک ہوئے۔ لڑکی رخصت کر دی گئی۔ اس کے تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہی جب وہ اپنے فلیٹ پر چڑھ رہا تھا تو گر گیا۔ فوراً اسپتال لے جایا گیا جہاں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اس سانحہ کی وجہ سے مجھے ایک ماہ مزید کی اپنے ویزا میں توسیع کرانی پڑی۔

میں کراچی میں حالانکہ دو مہینے رہا لیکن اس تیزی سے دن گزرے کہ پتہ ہی نہ چلا۔ ایک تشنگی رہی۔ نہ تو میرا جی بھر سکا اور نہ ہی عزیز و اقارب کی تشفی ہو سکی۔ وہاں جانکار، عزیزوں کے علاوہ متعدد گم گشتہ اعزاء، دیرینہ ہم وطنوں، بچپن کے ساتھیوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ الحمد للہ سب خوشحال ہیں۔ خوب ہنسی مذاق رہی، بچپن کی یادوں کے تذکرے رہے، بزرگوں کے قصے کہانیاں سنیں، گاؤں بستی کے واقعات دہرائے، ادبی محفلیں سجیں وغیرہ وغیرہ۔ دعوتوں کا تو یہ عالم تھا کہ ایک ایک وقت میں کئی کئی جگہوں سے اصرار ہوتا۔ کبھی کبھی تو قرعہ اندازی تک کی نوبت آجاتی۔ افسوس کہ اگر دعوتیں بیچی جا سکتیں تو زرِ مبادلہ کمانے کا یہ سنہرا موقع تھا۔

یہ قابلِ ذکر ہے کہ نہ معلوم کیوں، جمعرات کی شب کی کوئی دعوت نہیں کر رہا تھا۔ مجھے ایک دن ایک تقریب میں با آوازِ بلند یہ اعلان کرنا پڑا "ہے کوئی خدا کا بندہ جو جمعرات کی شب میں اس غریب الوطن اور تعلیم یافتہ فقیر کی دعوت کرے اور ثوابِ دارین حاصل کرے۔" یہ سُن کر تمام مجمع زعفران زار ہو اٹھا اور اس دن کے بعد سے جمعراتوں کا بھی وہی عالم ہو گیا جو دیگر دنوں کا تھا۔ جب دعوتوں کا یہ عالم ہو تو بآسانی یہ اندازہ لگایا جا سکتا

ہے کہ پیٹ غریب پر کیا گزری ہوگی۔ آخر کار وہ بیچارہ جواب دے ہی گیا اور پھر ہم آ گئے اپنی اصلیت پر، یعنی مونگ کی دال کی کھچڑی پر اور ہو گئے Non-vegetarian سے پکّے Vegetarian۔ یہاں اس حقیقت سے بھی پردہ اٹھانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہاں کھایا جاتا ہے مرغا اور وہاں کھانے کو ملی مرغی۔ ویسے بھی ہم عادی تھے روٹی کے اور وہاں ملا کھانا، وہ بھی مرغن، تو پھر پیٹ کا یہ انجام تو ہونا ہی تھا۔

میں نے ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' کے نام سے تصوف پر ایک کتاب لکھی ہے جو تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں اپنے خانوادے کا شجرہ بھی شامل کیا ہے۔ پاکستان کے سفر سے شجرے کی متعدد کڑیوں کو جوڑنے میں بھی بے حد مدد ملی۔

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں
کمال صدق و مروّت ہے زندگی ان کی
معاف کرتی ہے فطرت بھی انکی تقصیریں

(علامہ اقبالؔ)

[۱۷] کراچی تصاویر کے عکس میں
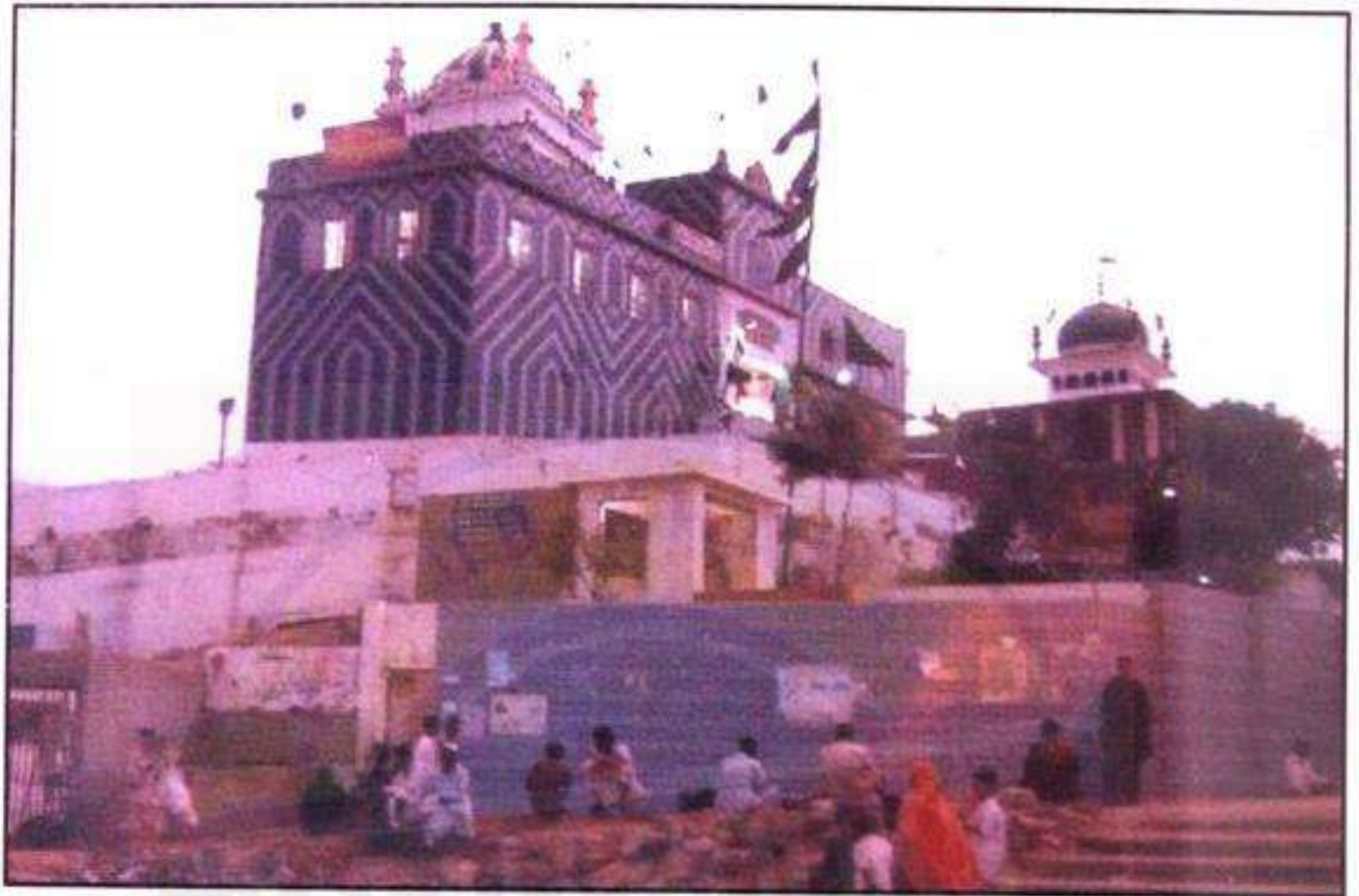
مزارِ مبارک حضرت شیخ عبداللہ شاہ غازیؒ، کراچی
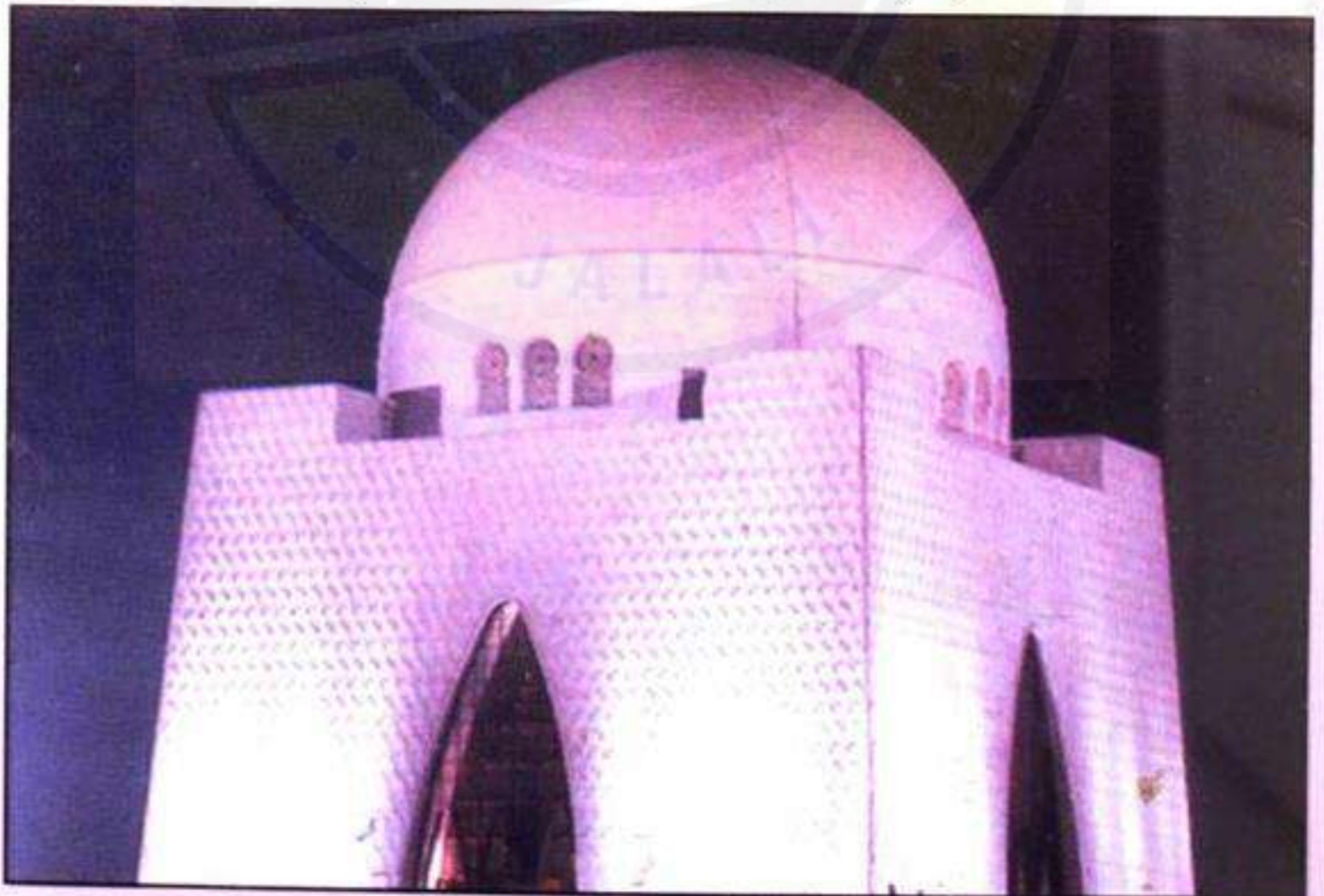
مزارِ قائد اعظم محمد علی جناح، کراچی
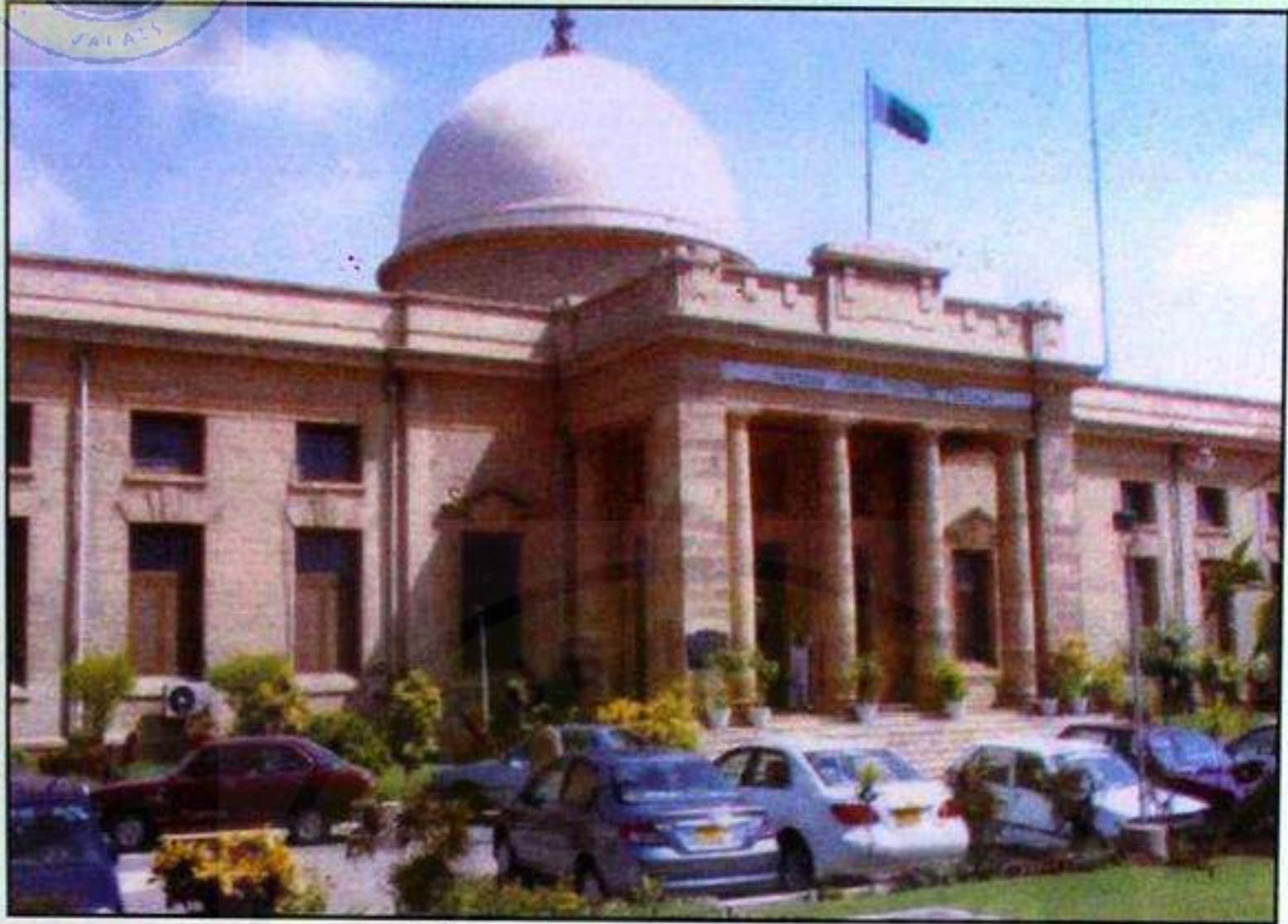
سپریم کورٹ کی کراچی بینچ، کراچی

تین تلواریں، کراچی

جناح ائیر پورٹ، کراچی

کراچی پورٹ ٹرسٹ بلڈنگ، کراچی
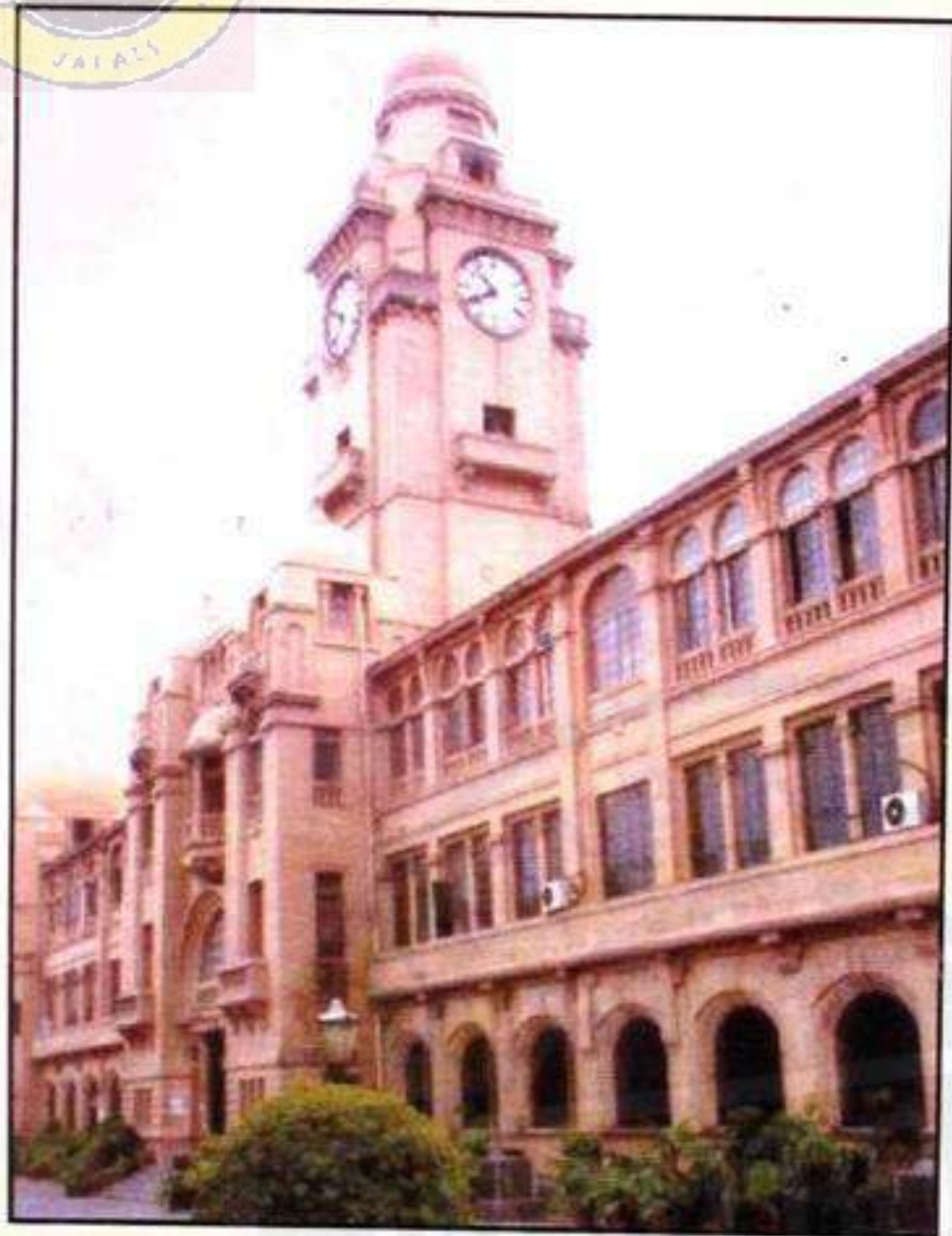
کراچی میونسپل کارپوریشن
بلڈنگ، کراچی

سجی، دھجی اور دلکش پٹھانی بس
کے سامنے کا منظر، کراچی
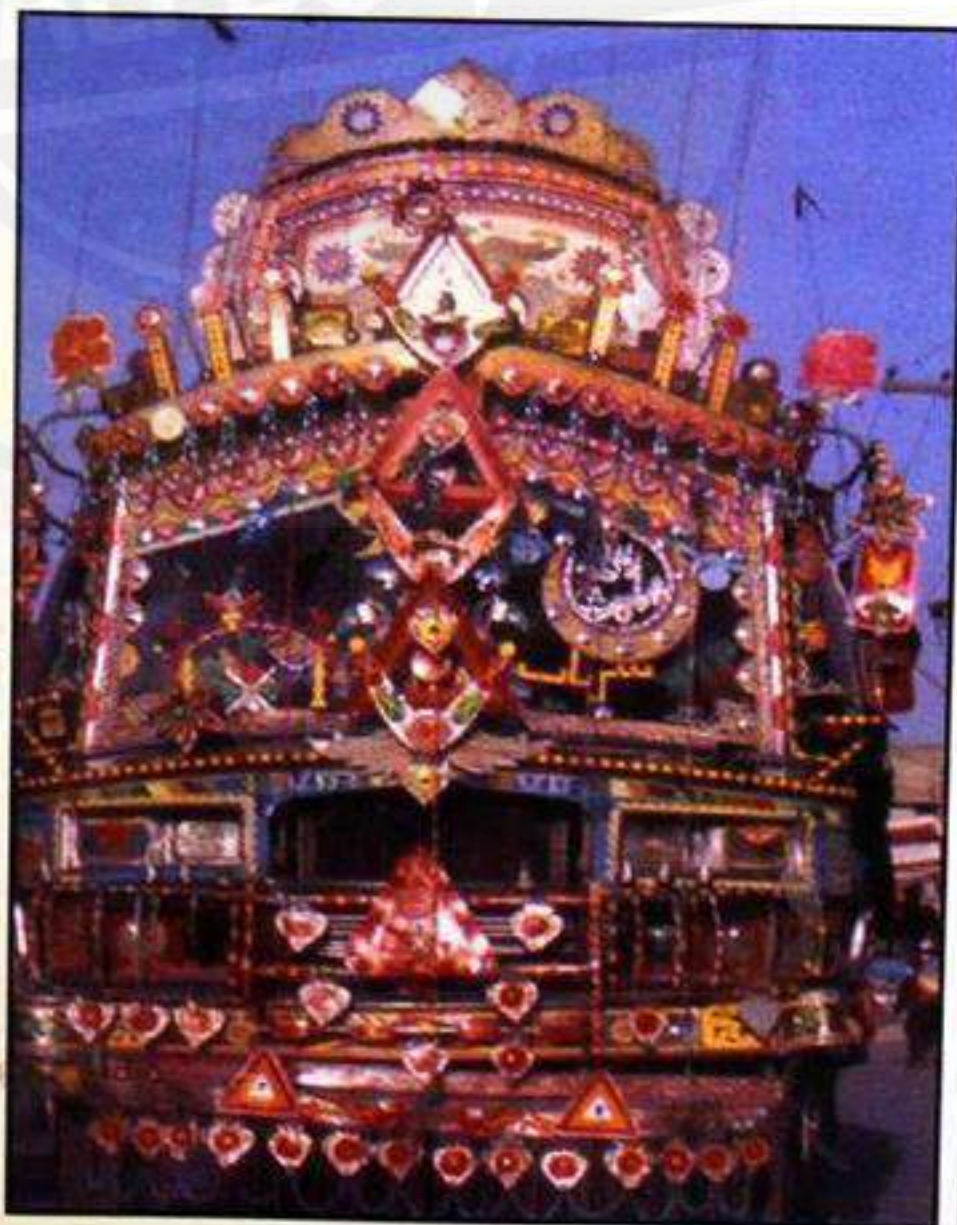
اس خاک کے ذرّوں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہیں وہ صاحبِ اسرار
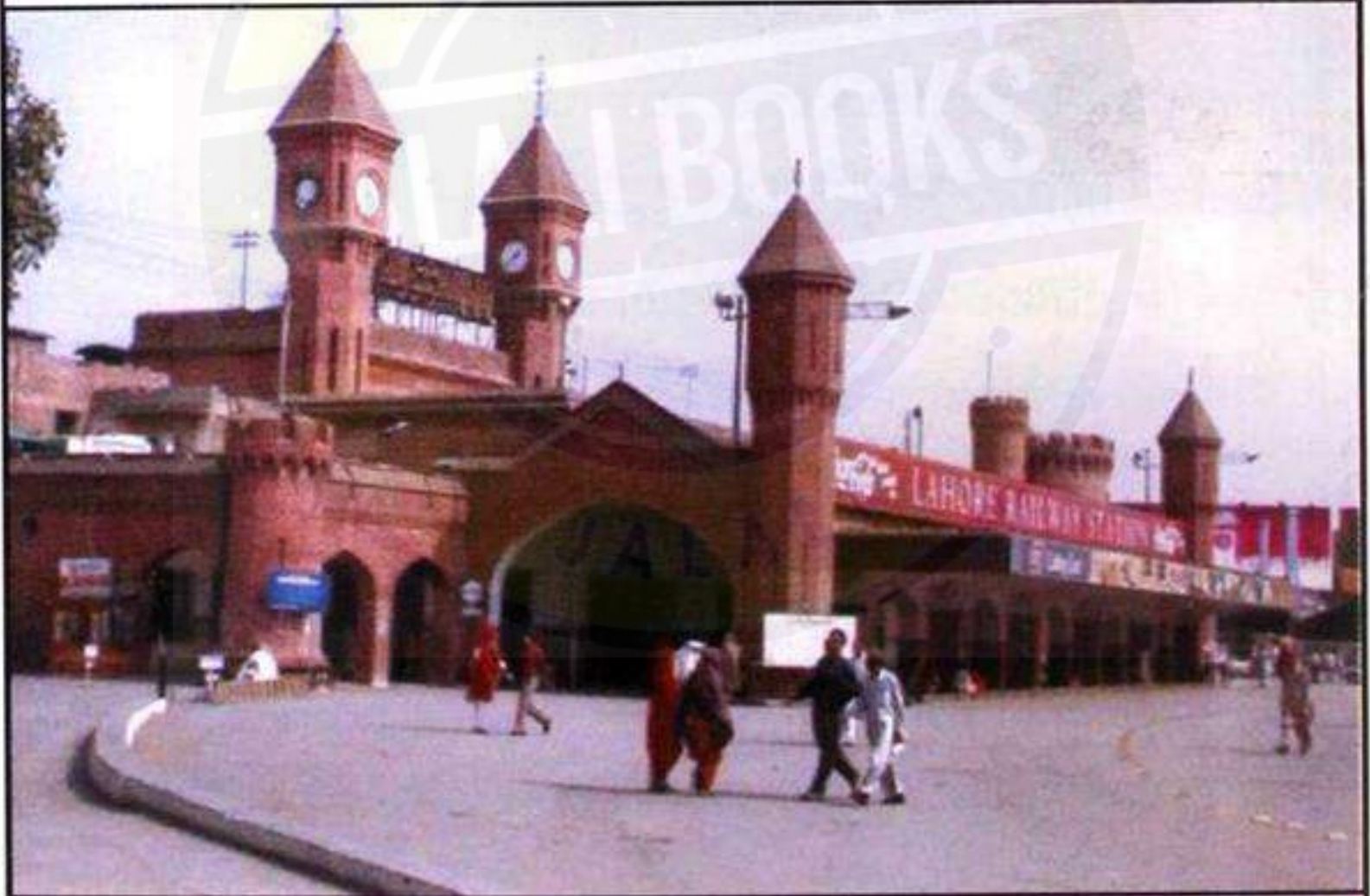
لاہور

ریلوے اسٹیشن، لاہور

[۱] حقیقت کے آئینہ میں

لاھور دریائے راوی کے بائیں کنارے پر واقع، انڈیا۔ پاکستان سرحد سے متصل نیز پاکستان کا دوسرا (کراچی کے بعد)، جنوبی ایشیا کا پانچواں اور دنیا کا ۲۳واں سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے (۱)۔ اس کا عرض البلد ۳۱ درجہ ۵۰ دقیقہ شمال اور طول البلد ۱۰۹ درجہ ۲۲ دقیقہ مشرق ہے۔

کہتے ہیں کہ اس کو رام چندر جی کے لڑکے، لوو (Lao) (۲) نے آباد کیا تھا اور انھیں کے نام پر اس کا نام بگڑتے بگڑتے لاہور ہو گیا۔ امیر خسروؒ نے اس کو لھانور لکھا ہے۔

ایک ماہرِ فلکیات (Astronomer) اور جغرافیہ داں، پولیمی (Ptolemy) نے اپنی جغرافیہ کی کتاب میں لکھا ہے ''ایک شہر، لاہوکلا (Lahokla) جو دریائے سندھ اور پالیبوتھر (Palibothra) یا پٹالی پتر (Pataliputra) (پٹنہ) کے بیچ واقع کاشپریہ (کشمیر) کے علاقے [جو دریائے Pidastes یا Vitasta (جہلم)، دریائے سنڈابل یا چندرابھاگا (چناب) اور دریائے ادرِس یا اراوتی (راوی) کے سہارے پھیلا ہے] میں واقعہ ہے، ہی قدیم لاہور ہو سکتا ہے۔''

''حدودِ عالم'' جو ۹۸۲ء میں لکھی گئی اور جس کا انگریزی میں ولادیمیر فیدرووچ مینوسکی (Vladimir Fedorovich Minorsky) نے ترجمہ کیا اور جو ۱۹۲۷ء میں لاہور میں شائع ہوا، میں لکھا ہے ''لاہور ایک چھوٹا سا شہر ہے جس میں بہت خوبصورت مندر، بڑے بڑے بازار اور لمبے چوڑے باغات ہیں۔'' مزید لکھا ہے ''دو بازاروں کے اطراف میں مکان واقع ہیں جن کو کچی دیواروں سے گھیر کر ایک کیا ہوا ہے۔'' کہتے ہیں کہ

اس کتاب کا اصل نسخہ ''برٹش میوزیم'' میں محفوظ ہے۔

اس کے علاوہ مختلف ادوار میں اس کو مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ کچھ محققین اس شہر کی ابتداء چار ہزار سال تک پرانی بتاتے ہیں (واللہ عالم بالصواب)۔ غرضیکہ لاہور کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جو بھی ہو؛ یہ ایک قدیم، تاریخی اور اہم شہر رہا ہے۔ ماضی میں افغانستان کی سمت سے دلّی کی طرف جو بھی لشکر آئے [مغل، ترک، پٹھان وغیرہ۔] ان میں سے زیادہ تر لاہور کو روندتے ہوئے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ اسی طرح کابل کو دلّی کے زیرِ نگیں رکھنے کے لئے بھی عسکری اعتبار سے لاہور کی اپنی ایک خاص اہمیت رہی ہے۔ ویسے دلّی کی بنسبت اس کا زیادہ تر تعلق کابل سے رہا ہے۔ موجودہ دور میں بھی سرحد سے لگا شہر ہونے کی وجہ سے اس کی ایک خاص اہمیت ہے۔ غرضیکہ لاہور کی پوری تاریخ نشیب وفراز سے پُر ہے۔

چنگیزی بربریت اور ہند میں مسلم حکمرانوں، بالخصوص مغل بادشاہوں کی قدردانی کے سبب جو بھی علماء، فضلاء، صوفیاء کرام، دانشور، ماہر ہنرمند، نامور شجاع اسلامی دنیا کے گوشے گوشے سے کھنچ کر ہندوستان وارد ہوئے ان میں سے زیادہ تر کا پڑاؤ پہلے یا آخر کار لاہور میں رہا۔

موجودہ عہد میں اس کو اس کی تاریخی، ثقافتی، تعلیمی، عسکری اور سیاسی حیثیت کی بنا پر ''پاکستان کا دل'' کہا جاتا ہے۔ یہیں ۲۳؍ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس میں سب سے پہلے تاریخ ساز ''قراردادِ پاکستان'' اور ۹؍ اپریل ۱۹۴۶ء کو اس قرارداد کا متن منظور کیا گیا۔

برِ صغیر میں ملتان اور سندھ کے بعد سب سے پہلے یہیں ہدایت کا سر چشمہ پھوٹا، بلکہ سندھ اور ملتان پر ''قرامطہ'' (۳) کے قابض ہو جانے اور کئی صدیوں تک ان کا وہاں اثر باقی رہنے کی بنا پر اگر یہ کہا جائے کہ لاہور کو سندھ اور ملتان پر بھی فوقیت حاصل رہی ہے،

تو بے جانہ ہوگا۔ اسی لئے لاہور کو ''دارالاسلام'' کا نام دیا گیا ہے۔

۴۱۲ھ (۱۰۲۱ء) اور ۴۱۴ھ (۱۰۲۳ء) میں سلطان محمود غزنوی نے لاہور کا محاصرہ کر کے ایک خونریز جنگ کے بعد اس کو فتح کیا اور اس کو سلطنتِ غزنویہ میں شامل کرتے ہوئے ملک ایاز کو یہاں کا حاکم مقرر کیا۔ جنگ کی وجہ سے شہر کی آبادی بہت کم ہو گئی تھی۔ ایاز نے اس کو پھر سے آباد کیا اور تباہ شدہ قلعہ کی جگہ پر دوبارہ قلعہ تعمیر کرایا۔ موجودہ قلعہ اسی جگہ پر واقع بتایا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں لاہور ایک ثقافتی اور تعلیمی مرکز بن کر ابھرا۔

۵۴۷ھ (۱۱۵۲ء) میں معز الدولہ خسرو شاہ نے لاہور کو خاندانِ غزنویہ کا دارالخلافہ بنایا لیکن ۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں شہاب الدین محمد غوری نے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس طرح لاہور ۱۱۸۶ء میں خاندانِ غزنویہ سے خاندانِ غور کے قبضے میں چلا گیا۔

خاندانِ غور کے بعد اس پر سلاطینِ دلّی کے کئی مسلم خاندانوں، جیسے مملوک سلاطین [غلام سلاطین]، خلجی، تغلق، سید، لودی اور سوری وغیرہ بادشاہوں نے حکومت کی۔ قطب الدین ایبک کے ۱۲۰۶ء میں تخت نشین ہونے کے بعد سے یہ پہلی بار اس برِصغیر کے کسی مسلم حکمراں کے زیرِ نگیں ہوا۔

۹۳۱ھ (۱۵۲۴ء) میں بابر نے لاہور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد ۱۵۲۴ء سے ۱۷۵۲ء تک یہ مغل سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ ۱۵۸۴ء سے ۱۵۹۸ء، یعنی دورِ اکبری اور دورِ جہانگیری میں یہ مغل سلطنت کا دارالخلافہ بھی رہا۔ مغلوں کے دورِ حکومت میں Architecturally اور ثقافتی اعتبار سے یہ عروج پر رہا۔ اس میں متعدد عمدہ قسم کے باغات لگائے گئے اور کئی عظیم الشان اور یادگاری عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ اُس دور کی اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر انگلش شاعر، جون ملٹن نے ۱۶۷۰ء میں "Agra & Lahore the Seat of Great Mughals" کے نام سے ایک نظم

بھی لکھی۔

مغل دورِ حکومت میں پنجاب، بالخصوص اس کے شہر لاہور نے جو ترقی کی اس کی حیثیت اور خوشحالی کی بابت ایک انگریز محقق، ٹیری نے لکھا ہے "یہ ایک بہت بڑا اور زرخیز صوبہ ہے۔ لاہور اس کا خاص شہر ہے۔ اس شہر میں آدمیوں اور دولت، دونوں کی فراوانی ہے۔ یہ پورے ہندوستان میں تجارت کے لحاظ سے اہم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔"

اکبر کے عہد [۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء] میں غلیچہ اور شال بننے کے کاروبار نے لاہور میں بہت ترقی کی۔ ایک انگریز محقق، مونسٹر کے بقول "۱۵۸۱ء میں لاہور ایشیا، یورپ کے کسی بھی اہم شہر سے کسی بھی معنیٰ میں کم نہیں تھا۔"

اٹھارہویں صدی عیسوی میں مغل سلطنت کی اس پر سے گرفت کمزور پڑ گئی۔ اس پر متعدد حملے ہوئے۔ ۱۷۵۱ء میں والیِ کابل، احمد شاہ ابدالی نے حملہ کر کے اس کو اپنی سلطنت کے زیرِ نگیں کر لیا۔ ۱۷۴۵ء سے ۱۷۵۶ء کے عرصے میں یہ زبردست بحران سے دوچار رہا۔ اس پر مختلف نوصوبیداروں نے حکومت کی۔ اس کا بھرپور فائدہ جنگجو سکھ قوم نے اٹھایا اور اس کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۹۹ء میں تمام سکھ "مثلوں" (۴) نے متحد ہو کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قیادت میں اس پر قبضہ کرتے ہوئے ایک آزاد سکھ ریاست قائم کر لی۔

کیوں کہ ۱۰۲۱ء سے ۱۷۹۹ء تک لاہور پر مسلمان حکمران قابض رہے تھے اور سکھوں نے انھیں سے جنگ کر کے حکومت حاصل کی تھی، اس لئے سکھوں کے عہدِ حکومت میں، خاص کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں پوری مسلمان قوم کو نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ یہاں یہ ذکر کر دینا نہایت اہم ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ۱۷۹۸ء میں احمد شاہ ابدالی کے پوتے، سلطان زمان شاہ [ص ۵۸ املاحظہ فرمائیں]، والیِ کابل نے ہی راجہ کے خطاب سے نوازتے ہوئے صوبیدار لاہور مقرر کیا تھا۔ پھر بھی مسلمانوں کی جانیں

تلف ہوئیں، املاک لوٹی گئیں، حتیٰ کہ مزارات، خانقاہیں، مقابر اور مساجد کو بھی نشانہ بنایا گیا، ان کی بے حرمتی کی گئی، ان پر سے قیمتی پتھر اور زر و جواہرات اتار کر امرتسر بھیج دیئے گئے۔ منقول ہے کہ ایک دن جب مہاراجہ رنجیت سنگھ حسبِ عادت پتھر اتروانے کے لئے میاں میرؒ [تفصیلات ص **۲۰۱** پر ملاحظہ فرمائیں۔] کے مزار پر گیا اور معماروں کو حکم دیا تو دفعتاً اس کا گھوڑا بگڑا جس سے مہاراجہ زمین پر آ گرا۔ وہ اٹھا اور ہنس کر بولا کہ یہ بادشاہوں کے پیر (۵) کا مقبرہ ہے، اسے نہ چھیڑو۔

"ہر کمال را زوال" کے مقولے کے مصداق مہاراجہ رنجیت سنگھ (م ۱۸۳۹ء) کے بعد سکھوں کی حکومت بھی خلفشار کا شکار ہو گئی۔ ۱۸۳۹ء سے ۱۸۴۹ء تک پانچ سکھ حکمراں برسرِ اقتدار رہے۔ [تفصیل ص **۱۱۶** پر ملاحظہ فرمائیں۔] بالآخر ۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں "ایسٹ انڈیا کمپنی" نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لڑکے، راجہ دلیپ سنگھ کو تخت و تاج سے محروم کر کے لاہور پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔ (۶)

انگریزی دورِ حکومت، یعنی عہدِ غلامی (۱۸۴۹ء سے ۱۹۴۷ء) میں لاہور کو بظاہر قدرے سکون نصیب ہوا۔ اس عرصے میں شہر میں کئی اہم تعمیراتی کام کرائے گئے؛ جیسے: جنرل پوسٹ آفس، ہائی کورٹ، گورنمنٹ کالج، عجائب گھر، نیشنل کالج آف آرٹ، منٹگمری ہال، پنجاب یونیورسٹی، صوبائی اسمبلی وغیرہ وغیرہ کی عمارتیں۔ مال روڈ پر جو گوتھک (Gothic) اور وکٹورین (Victorian) طرزِ تعمیر کی عمارتیں تعمیر کرائی گئی تھیں، وہ ابھی تک موجود ہیں۔ اسی مال روڈ کے ایک کنارے پر پنجاب یونیورسٹی کی عمارت واقع ہے۔ انگریزی دورِ حکومت میں ہی ۱۹۲۴ء میں "لاہور ریس کلب" عالمِ وجود میں آیا تھا۔

یہیں سے ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹ء) میں "انجمن حمایتِ اسلام" کے سالانہ جلسے میں "نالۂ یتیم" کے نام سے نظم پڑھنے پر علامہ اقبال کی شہرت کی ابتدا ہوئی۔

آزادی کی لڑائی میں بھی یہ شہر ملک کے کسی دوسرے شہر سے پیچھے نہیں رہا۔

۱۹۲۹ء میں یہاں ''کانگریس'' سیشن کا انعقاد ہوا۔ اسی سیشن میں پنڈت جواہر لال نہرو نے آزادی سے متعلق ایک قرارداد پیش کی جو اتفاقِ رائے سے منظور کر لی گئی۔ اسی اجلاس کے موقع پر ترنگا جھنڈا پھیرایا گیا جس کو ہزاروں لوگوں نے سلامی دی۔ یہیں کی جیل میں آزادی کے متوالے، جتن داس نے سیاسی قیدیوں کے ساتھ انگریزوں کے ناروا سلوک کی وجہ سے ۶۳ دنوں تک بھوک ہڑتال کی۔ یہیں کی جیل میں مجاہدِ آزادی، سردار بھگت سنگھ کو تختِ دار پر چڑھایا گیا۔

یہیں ''آل انڈیا مسلم لیگ'' (بعد میں ''پاکستان مسلم لیگ'') کا ۱۹۴۰ء میں ایک اہم اجلاس ہوا جس میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی سربراہی میں برِصغیر کے مسلمانوں (''مسلم لیگ'' کے بقول) کے لئے ایک علیحدہ آزاد مملکت کی مانگ کی گئی۔ یہ ''لاہور قرارداد'' یا ''پاکستان قرارداد'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اسی اجلاس میں ''مسلم لیگ'' کے قائد، جناب محمد علی جناح نے پہلی بار ''دو قومی نظریہ'' (Two Nation Theory) پیش کیا۔

۱۹۴۷ء میں آزادی کے بعد ایک بار پھر سے لاہور نے تباہی کا منظر دیکھا۔ ہندو۔ مسلم۔ سکھ فسادات کی آگ نے شہر کو اپنے نرغے میں لے لیا جس سے لاہور کے قلعہ، بادشاہی مسجد، دیگر سرکاری عمارتوں، نجی املاک اور انسانی جانوں کو سخت نقصان پہونچا۔ کتنے ہی بوڑھے، بے سہارا؛ بچے، یتیم؛ عورتیں، بیوہ؛ نیز کھاتے پیتے، دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔

۱۹۶۵ء میں بدقسمتی سے دونوں ممالک [ہندوستان اور پاکستان] میں جنگ چھڑ گئی۔ (۷) ان دنوں پاکستان کے صدر، جناب جنرل ایوب خاں [۱۹۵۸ء سے فوج برسرِ اقتدار تھی۔] اور ہندوستان کے وزیرِ اعظم، جناب لال بہادر شاستری جی تھے۔ پاکستان نے جب ستمبر میں ''لائن آف کنٹرول'' کے اِس پار جمّو کے اکھنور سیکٹر میں دباؤ

بڑھایا تو ہندوستان کو بھی مجبوراً دیگر محاذ کھولنے پڑے۔ ۶ ستمبر کو ہندوستانی فوج نے لاہور سیکٹر میں بین الاقوامی سرحد کو عبور کرکے پیش قدمی کرتے ہوئے لاہور کے ٹھیک مشرق میں واقع موضع برکی کے پاس سے اِچھوگل کینال (B.R.B. Canal) کو پار کرلیا۔ اس وقت لاہور کا بین الاقوامی ہوائی اڈہ ہندوستانی فوج کی Range میں تھا۔ بظاہر سکوتِ لاہور یقینی ہوگیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جناب حافظ محمد ابراہیم (۸)، گورنر پنجاب کو لاہور کا بھی گورنر مقرر کردیئے جانے کا فیصلہ لیا جاچکا تھا۔ کراچی کے بعد لاہور پاکستان کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے۔ اگر لاہور پر ہندوستانی فوج کا قبضہ ہوجاتا تو ہندوستان، پاکستان سے اپنی شرائط منواسکتا تھا؛ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

ہم جہاں سانس لے رہے ہیں وہ دارالاسباب ہے۔ جو بھی واقعہ رونما ہوتا ہے اس کے دنیاوی اسباب ضرور ہوتے ہیں۔ لاہور پر ہندوستان کا قبضہ کیوں نہیں ہوسکا، اس کے بھی کچھ نہ کچھ دنیاوی اسباب ضرور رہے ہوں گے جس کی تفصیل میں جانا نہ تو ہر کسی کے بس کی بات ہے [یہ ایک دفاعی معاملہ ہے جس کو دفاعی امور سے وابستہ تجزیہ نگار ہی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔] اور نہ ہی یہ ہمارے احاطۂ تحریر میں شامل ہے۔ اگر ''رجال الغیب'' کے نظریہ (۹) سے سوچیں تو ایک دھندلی سی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے غالباً مندرجہ ذیل مثالیں کافی ہوں گی:۔

اورنگ زیب جیسا تجربہ کار جنرل آٹھ ماہ [فروری ۱۶۸۷ء سے ستمبر ۱۶۸۷ء] تک مسلسل گولکنڈہ جیسے چھوٹے سے قلعہ کا محاصرہ کئے رہا لیکن تب تک اس کو فتح نہ کرسکا جب تک قلعہ کی حفاظت پر مامور قطب الارض وہاں سے اللہ کے حکم پر چلے نہ گئے۔ (۱۰)

سلطان فیروز شاہ تغلق تب تک ٹھٹھہ کو فتح نہ کرسکا جب تک کہ اس کی حفاظت پر مامور ایک ولیہ حیات رہیں۔ (۱۱)

پنجاب (غیر منقسم) کا علاقہ جب مغل حملوں کی زد میں آنے کے سبب تباہ و

برباد ہونا ہوا تو وہاں سے اللہ کے حکم پر پہلے ہی سے اولیاء اللہ چلے گئے تھے۔ (۱۲)

۱۹۹۸ء میں ایٹمی دھماکوں کے بعد جب فروری ۱۹۹۹ء میں ہندوستان کے وزیر اعظم، جناب اٹل بہاری باجپئی خیر۔سگالی مشن پر لاہور تشریف لے گئے تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ ۲۱ رفروری کو ایک دوستانہ معاہدے ("Lahore Declaration") پر دستخط کیے بلکہ "مینارِ پاکستان" پر بھی تشریف لے جا کر رجسٹر میں اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ [باجپئی جی وہ پہلے ہندوستانی وزیر اعظم ہیں جو "مینارِ پاکستان" پر تشریف لے گئے۔] یہ واجپئی جی کا ایک بہت مدبرانہ، تاریخ ساز اور جرأت مندانہ (۱۳) قدم تھا۔ اس سے پاکستان کے اربابِ حل وعقد کی اس غلط فہمی اور غلط بیانی کا سدِ باب ہو جاتا ہے کہ ہندوستانی حکمرانوں نے ابھی تک دل سے پاکستان کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ اول تو اس میں کوئی سچائی نہیں ہے، کیونکہ بقول مولانا آزاد پاکستان کے قیام میں کانگریس کے بھی چند صفِ اول کے لیڈران کی مرضی کا دخل تھا [تفصیلات آگے ص ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔]؛ اور اگر ہے، تو وہ اُسی سخت گیر تنظیم (۱۴) کی طرف سے رہی ہوگی جس کا منشور بالکل واضح ہے اور جس کے باجپئی جی بھی ایک سینیر رکن ہیں۔ اب باجپئی جی کے "مینارِ پاکستان" پر تشریف لے جانے سے اس کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شری لال کرشن اڈوانی، جو "بھارتیہ جنتا پارٹی" (ہندو وادی تنظیم، ".R.S.S" کی ایک ذیلی سیاسی پارٹی) میں شری اٹل بہاری باجپئی سے بھی زیادہ سخت گیر موقف والے لیڈر مانے جاتے ہیں، نے تو باجپئی جی سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر کارنامہ انجام دیا۔ ۲۰ رمئی ۲۰۰۵ء کو جب موصوف اپنے ایک ہفتہ پاکستانی دورہ پر اسلام آباد، لاہور اور کراچی پہنچے تو کراچی میں انھوں نے نہ صرف یہ کہ بابائے پاکستانی قوم، مسٹر محمد علی جناح کے مزار پر حاضری دی اور گلپوشی کی بلکہ ان کی تعریف میں قصیدے بھی پڑھے، اور جب ان کے بیان کو ہندوستان میں ہدفِ تنقید بنایا گیا تو بھی وہ اپنے موقف پر بدستور قائم رہے۔ سیاسی حلقوں میں

مسٹر جناح کی تعریف کرنے سے یہ تاثر لیا گیا کہ اڈوانی جی بھی ماضی میں سردار پٹیل کی طرح مسٹر جناح کے نظریات سے اتفاق کرنے لگے ہیں۔ [''دوقومی نظریہ'' جو پاکستان کی بنیاد بنا، مسٹر جناح ہی نے تو پیش کیا تھا۔] پہلے باجپئی جی کا ''مینارِ پاکستان'' [''قراردادِ پاکستان'' کی یاد میں تعمیر کرایا گیا۔] پر جانا اور پھر اڈوانی جی کا مسٹر جناح کے مزار پر جانا، ایسا لگتا ہے کہ شاید سخت گیر ہندو تنظیمیں اب اپنی Strategy تبدیل کر رہی ہیں۔ باجپئی جی کے اس عمل کو دونوں ممالک کے عوام نے ستائش کی نگاہ سے دیکھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر دو جانب کے چند سرپھروں نے اس پر نکتہ چینی بھی کی۔ چند تنگ نظر پاکستانیوں نے تو اُس مقام کو عرقِ گلاب سے دھویا تک بھی۔

حواشی

(۱) ۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے لحاظ سے اُس وقت اس کی آبادی تقریباً ۷ ملین تھی۔ [One million = ten lakhs]

(۲) سیتا جی کے بطن سے رام چندر جی کے دولڑکے لَوو (Lao) اور کُش (Kush) پیدا ہوئے بتائے جاتے ہیں۔ لاہور کے قلعہ میں کہتے ہیں کہ آج بھی لَوو کے نام پر ایک مندر موجود ہے۔ لَوو (Lao/Lava) کا تلفظ لوح (Loh) بتایا جاتا ہے اور ''لوح کا قلعہ'' (Awar) کے حوالے سے آبادی کا نام ''لوح۔اَوَر'' (Loh-Awar) بتایا گیا ہے جو بگڑتے بگڑتے کہتے ہیں کہ موجودہ نام، لاہور (Lahore) ہو گیا۔

(۳) ''قرامطہ'' = ''قرامطہ'' کے بارے میں جاننے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ملتان کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں فتح ہوتے ہی ملتان عربوں کے قبضے میں آ گیا اور پھر غزنوی دور تک اس پر مسلمانوں کا مسلسل قبضہ رہا لیکن ۱۱۱ھ (۷۲۹ء) میں ملتان سندھ سے الگ ہو گیا۔ نتیجتاً ملتانی زبان بھی سندھی زبان سے علیحدہ ہو کر آزادانہ طور پر

ارتقاء پانے لگی۔

ملتان پر پہلے ۱۳۲ھ (۷۴۹ء) تک ''بنی امیہ'' کا قبضہ رہا۔ اس کے بعد یہ ''بنو عباس'' کی حکومت کے زیرِ نگیں ہو گیا۔ بعد ازاں صورتِ حال تقریباً غیر واضح رہی۔ کبھی یہ مرکزی حکومت کے تحت رہا تو کبھی مقامی خود مختار حکمرانوں کے قبضے میں۔ ۲۹۰ھ (۹۰۲ء) میں اس کے ''بنو سامہ'' کے زیرِ اقتدار رہنے کا پتہ چلتا ہے۔ [''بنو سامہ'' خالصتاً عربی النسل تھے جن کا سلسلۂ نسب لوئی بن غالب سے ملتا ہے جو قریش کے اجداد میں سے تھے۔ لوئی کی اولاد میں سے ایک کا نام سامہ تھا۔ لہٰذا اسی کی نسبت سے اس کی اولاد ''بنو سامہ'' کہلائی اور ''بنو منبہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ سنّی العقیدہ تھے۔] ''بنو سامہ'' کے بعد ۳۷۳ھ (۹۸۳ء) میں یہاں کا حاکم جلم بن شیبان ہوا جو اسماعیلیہ فرقے سے تعلق رکھنے کے سبب شیعہ العقیدہ تھا۔ [جلم بن شیبان کو اسماعیلی امام العزیز باللہ (م ۳۸۶ھ لغایتہ ۹۹۶ء قاہرہ) نے ۳۷۲ھ (۹۸۲ء) میں فوجی مدد کے ساتھ سندھ بھیجا تھا۔ کہتے ہیں کہ جلم بن شیبان باہر سے حملہ آور نہ ہو کر اندرونِ شہر بغاوت کرا کر برسرِ اقتدار آیا تھا۔] جلم بن شیبان نے ملتان پر قابض ہوتے ہی سب سے پہلے وہاں فاطمی سکہ رائج کرانے کے ساتھ ساتھ ان کے نام کا خطبہ جاری کرایا اور محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد کو ''بنو امیہ'' کی یادگار سمجھ کر بند کرا دیا۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے عقائد (**قرامطی** عقائد) کی بھرپور طریقے سے تبلیغ کرتے ہوئے اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کی غرض سے مقامی ہندو راجاؤں سے معاہدے بھی کیے۔ جلم بن شیبان کے بعد شیخ حمید ملتان کا حاکم ہوا۔ وہ بھی اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ جب ۳۸۱ھ (۹۹۱ء) میں امیر ناصر الدین سبکتگین نے سندھ پر قبضہ کر لینے کے بعد ملتان کی جانب پیش قدمی کی تو شیخ حمید نے اس سے صلح کر کے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ ۳۸۷ھ (۹۹۷ء) میں امیر سبکتگین کی وفات کے بعد اس کا لڑکا محمود تخت نشین ہوا۔ ۳۹۵ھ (۱۰۰۴ء) میں محمود نے ملتان سے متصل ایک مضبوط قلعہ، بھاٹیہ (موجودہ نام بھیرہ) کے حاکم بجے رائے کو سبق سکھانے کے ارادہ سے اس پر حملہ کیا۔ [مذکورہ قلعہ لاہور کے تابع تھا لیکن بجے رائے اپنی فوج کی کثرت، ہاتھیوں کی تعداد پر اس درجہ مغرور تھا کہ خود کو خود مختار سمجھ کر لاہور کے حاکم، جے پال اور سبکتگین کے ہندوستانی نائبین کی کوئی پرواہ

نہیں کرتا تھا۔ بجے رائے نے اس حملے کی تاب نہ لا کر خود کشی کر لی تھی۔] ان دنوں ملتان کا حاکم شیخ حمید کا پوتا، شیخ ابوالفتح داؤد بن نصر تھا۔ اس نے محمود کی کوئی مدد نہیں کی جس سے محمود اس سے ناراض ہو گیا۔ چنانچہ محمود نے ۳۹۶ھ (۱۰۰۵ء) میں اس پر حملہ کر دیا۔ شیخ ابوالفتح داؤد نے مجبور ہو کر محمود سے صلح کر لی لیکن جب ۳۹۹ھ (۱۰۰۸ء) میں محمود نے آنند پال پر حملہ کیا تو ابوالفتح نے غداری کرتے ہوئے آنند پال کا ساتھ دیا۔ اس سے محمود نے ۴۰۱ھ (۱۰۱۰ء) میں ملتان پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا اور ابوالفتح کو گرفتار کر کے غزنی لے گیا جہاں غور کے قلعہ میں دورانِ اسیری وہ مر گیا۔ اس طرح ملتان پر سلاطینِ غزنویہ کا کلی طور سے قبضہ ہو جانے کے ساتھ ساتھ ''قرامطیہ'' دور کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ جلم بن شیبان نے جو مسجد تعمیر کرائی تھی اس کو محمود نے بند کراتے ہوئے محمد بن قاسم کی بنوائی ہوئی مسجد جس کو جلم نے بند کرا دیا تھا، کو پھر سے کھلوا دیا گیا۔

حسن رضا گردیزی نے اپنی کتاب ''شاہ یوسف گردیز'' میں ملتان میں ''قرامطیوں'' کے ظلم وستم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''اس فرقے کی بدولت ہر طرف لوٹ کھسوٹ اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ بیچارے مسلمان جائے امن کی تلاش کرتے پھرتے تھے۔ ''قرامطہ'' یوں تو خود کو مسلمان ظاہر کرتے تھے لیکن انھیں اسلامی عقائد سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ وہ نہ فقط اسلامی عبادات کے منکر تھے بلکہ ان کی تمام تر سرگرمیاں عباسی حکومت کے خلاف ہوتے ہوئے ہر اس سلطنت کے خلاف ہو گئیں جو بنی فاطمی کے حق میں نہیں تھے۔''

''خطۂ پاک اوچ'' میں ''**الدولت العربیه الکبری لحود کامل المحاصی**'' کے حوالے سے لکھا ہے ''قرامطہ فرقہ باطنیہ ہی کی ایک شاخ تھی جن کا بانی مبانی عبداللہ بن سبا نام کا ایک یہودی تھا جو بظاہر مسلمان اور بباطن اسلام کا زبردست دشمن تھا۔ اس کی شورش انگیزیوں نے خلیفہ ثالث، حضرت عثمان بن عفانؓ کے خلاف لوگوں کو ابھارا۔

اس کی تمام ہنگامہ آرائیوں کا مقصد اسلام کو سبوتاژ کرنا تھا۔ ''قرامطہ'' کا ہیڈ کوارٹر کوفہ کے نواح میں ایک بستی تھی جس کا نام انھوں نے ''دارالہجرت'' رکھا ہوا تھا۔ یہیں سے ان کی جماعتیں قتل و غارت گری کے منظم منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نکلتیں اور سلطنتِ اسلامیہ کے مختلف علاقوں کو تاخت و تاراج کرتیں۔''

''فرشتہ'' نے ''قرامطیوں'' کو بے دین لکھا ہے۔ الغرض ''قرامطیوں'' کے نظریات کی تبلیغ و ترویج کی وجہ سے لوگوں کے عقائد راسخ العقیدہ مسلمانوں جیسے نہ رہے تھے۔ ایک طرف تو داخلی طور پر لوگ ان نظریات کی یلغار کے سبب گم کردہ راہ ہو رہے تھے اور دوسری طرف ملتان بیرونی حملہ آوروں کی مسلسل فوج کشی اور کشت وخوں کی بدولت بے چینی اور بے سکونی کی زد میں تھا۔ [''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اول ص ۸۷۔۱۱۳؛ ''ملتان کی ادبی وتہذیبی زندگی میں صوفیاء کرام کا حصہ'' ص ۴۲۔۹۷]

(۴) **مِثل** = یہ فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی ایک جیسے کے ہیں [جو سب صفتوں میں مساوی ہو] [Equivalent]۔ File کے لئے بھی اس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ سکھوں نے اس کو آخر الذکر کے معنی میں استعمال کیا تھا۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اور ۱۷۴۸ء سے ۱۷۶۷ء کے درمیانی عرصے میں احمد شاہ ابدالی کے پے در پے سات بار حملوں کی وجہ سے دلّی کے مغل بادشاہ اس قابل نہ رہے تھے کہ وہ سلطنت میں ہونے والی بغاوتوں کا قلع قمع کر سکیں۔ چنانچہ پنجاب میں اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جنگجو سکھوں نے بھی مختلف سرداروں کی سربراہی میں جتھے بنانے شروع کر دیئے تھے۔ ان جتھوں کو ''مِثل'' کا نام دیا گیا تھا۔ ''مثلوں'' کے نام کسی خاص مقام، موضع یا سربراہ کے نام پر ہوتے تھے اور ان کے الگ الگ نام، نشان اور پرچم ہوتے تھے۔ شروع میں ان کی تعداد ۶۵ تھی جو آہستہ آہستہ آپس میں ضم ہو کر بارہ رہ گئی تھی۔ ۱۷۶۷ء سے ۱۷۹۹ء تک پنجاب ان ''مثلوں'' میں بٹا رہا اور پھر رنجیت سنگھ کے برسرِ اقتدار آنے پر یہ سب ایک ہو گئے تھے۔

(۵) "Sikhism" میں حضرت میاں میر کا بہت بلند مقام ہے۔ جب امرتسر میں سکھوں کے پانچویں گرو، گرو ارجن سنگھ جی [۱۵۸۱ء۔۱۶۰۶ء] نے ''ہرمندر صاحب'' کا سنگِ بنیاد رکھا تو میاں میرؒ ان کی دعوت پر وہیں موجود تھے۔ گرو جی جب بھی اپنے والد اور چوتھے گرو، گرو رام داس جی کی جائے پیدائش، لاہور آتے تو وہ میاں میرؒ سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ ۱۶۰۶ء میں گرو جی نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں میاں میرؒ سے اپنے فرزند، گرو ہر گووند سنگھ جی کے حق میں دعا کرنے کو کہا۔ گرو ارجن سنگھ جی کی وفات کے چند سالوں بعد، ان کے صاحبزادے اور چھٹے گرو، گرو ہر گووند سنگھ جی [۱۶۰۶ء۔۱۶۴۵ء] نے، جب

ان کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی، تو لاہور میں میاں میرؒ سے ملاقات بھی کی۔

(۶) ۲۷ جون ۱۸۳۹ء کو مہاراجہ رنجیت سنگھ [۱۷۷۹ء میں سکھوں کے لیڈر کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ زمان شاہ، والی کابل نے ۱۷۹۹ء میں لاہور کا حکمراں بنایا۔ اس کی چار رانیاں اور سات کنیزیں اس کی چتا پر جل کر مریں۔] کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا لڑکا، کھڑک سنگھ جانشین ہوا۔ وہ ایک سال چار ماہ حکومت کرنے کے بعد ۴۶ سال کی عمر میں ۵ نومبر ۱۸۴۰ء کو فوت ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا لڑکا، نونہال سنگھ تخت نشین ہوا۔ نونہال سنگھ اپنے باپ کی آخری رسومات ادا کر کے واپس لوٹ رہا تھا کہ اتفاقاً ۱۷ نومبر ۱۸۴۰ء کو لاہوری دروازہ کے قریب ایک عمارت پھٹ کر اس پر گر گئی جس سے وہ ہلاک ہوگیا۔ اس کے بعد ریاست کا انتظام رانی چاند کنور نے اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن دو ماہ بعد ہی اس کے دوسرے لڑکے، شیر سنگھ نے اسے معزول کر کے خود راجہ بن بیٹھا۔ شیر سنگھ کو حکمراں ہوئے ابھی پورے تین سال بھی نہ ہوئے تھے کہ ۱۳ ستمبر ۱۸۴۳ء کو سردار اجیت سنگھ [ایک سکھ سردار اور مہاراجہ شیر سنگھ کا قاتل جس نے سردار دھیان سنگھ کو بھی قتل کیا تھا نتیجتاً بعد میں اس کو بھی دھیان سنگھ کے لڑکے، ہیرا سنگھ نے مع اس کے گروہ کے ہلاک کر دیا تھا۔] کی فوج نے شاہی محل پر قبضہ کر لیا اور زبردست لڑائی کے بعد شیر سنگھ اور اس کے لڑکے، پرتاپ سنگھ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، حتیٰ کہ محل کی عورتوں اور ان کے نوزائدہ بچوں تک کو بھی نہیں بخشا گیا۔ اس کے بعد مہاراجہ رنجیت سنگھ کا سب سے چھوٹا بیٹا، دلیپ سنگھ جو اس وقت دو سال کا تھا، تخت نشین ہوا۔ سکھوں کے اس اندرونی خلفشار کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا۔ سکھوں نے انگریزوں سے چار مقابلے کیے لیکن ہر بار ہزیمت اٹھانی پڑی۔ مجبوراً ۱۸۴۶ء کے عہد نامے کی رو سے دریائے بیاس تک کا علاقہ انگریزوں کو دے دیا گیا اور اسی عہد نامے کی رو سے پہلی بار انگریزی ریزیڈنٹ اور فوج لاہور میں رہنے لگی اور پھر بالآخر لارڈ ڈلہوزی کے آخری فیصلہ کن جنگ کے بعد، ۱۸۴۹ء میں پنجاب انگریزی مقبوضات میں شامل ہوگیا اور دس سالہ راجہ دلیپ سنگھ کو تخت سے اتار کر اور ۱۲ ہزار پونڈ سالانہ وظیفہ مقرر کرتے ہوئے اس کو ولایت بھیج دیا گیا اور اس کی تمام ذاتی املاک، محلات و قیمتی ساز و سامان وغیرہ سب کچھ ضبط کر لیا گیا۔ [اس میں ''کوہ نور'' ہیرا بھی شامل تھا۔] دلیپ سنگھ نے انگلستان کے ماحول سے متاثر ہو کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا اور وہیں شادی بھی کر لی تھی جسکے بطن سے ایک لڑکا، وکٹر دلیپ سنگھ اور دو لڑکیاں، صوفیا اور ریمبا پیدا ہوئیں۔ لڑکیاں تو پنجاب آگئی تھیں جن میں سے ایک کی شادی انگریز سے ہوگئی تھی جبکہ دوسری کنواری ہی رہی لیکن لڑکا جون ۱۹۱۸ء میں جزیرہ مانٹی کارلوس میں مرا۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد اوّل و دوم ص ۲۴۷]

(۷) ۱۹۶۵ء کی لڑائی کی شروعات ''رن آف کچھ'' کے اُس علاقے سے ہوئی جو ریاست جونا گڑھ کی سرحد کے مغرب میں واقع اور دلدلی تھا۔ ۲۰ رمارچ اور اس کے بعد اپریل ۱۹۶۵ء میں پہلے تو دونوں ممالک کی سرحدی پولس کے درمیان اکا دکا جھڑپیں ہوئیں جو بعد میں دونوں کی افواج کے مابین جھڑپوں میں تبدیل ہوگئیں۔ تب جون ۱۹۶۵ء میں برٹش وزیرِ اعظم، جناب ہیرالڈ ولسن نے مصالحتی کوششوں سے فریقین کو ایک ٹریبونل (Tribunal) کے سپرد معاملہ کردینے پر راضی کرلیا۔ [اس ٹریبونل کا فیصلہ ۱۹۶۸ء میں آیا جس کی رو سے ''رن آف کچھ'' کا ۳۵۰ مربع میل (۹۰۰ مربع کلومیٹر) کا علاقہ پاکستان کو Award ہوگیا جب کہ اس کا Claim ۳،۵۰۰ مربع میل کا تھا۔]

''رن آف کچھ'' کے بعد پاکستان نے ''آپریشن جبرالٹر'' (Operation Gibraltor) کے نام سے کشمیر میں ''لائن آف کنٹرول'' کے اِس پار Infiltrators بھیجے۔ اس کا خیال تھا کہ کشمیری عوام ہندوستان سے برگشتہ ہیں اور وہ Infiltrators کا ساتھ دیں گے لیکن ـــ

جو کچھ کہ دیکھا خواب تھا

اور جو سنا افسانہ تھا

نتیجتاً مذکورہ آپریشن ناکام رہا۔ ۱۵ راگست ۱۹۶۵ء کو ہندوستانی فوج نے "Ceasefire Line" عبور کرکے کشمیر کے اُس طرف کے علاقے پر حملہ کردیا۔ شروع میں تو ہندوستانی فوج کو کامیابی ملی اور اس نے تین اہم پہاڑی چوٹیوں پر قبضہ کرلیا لیکن اس کے بعد پاکستانی فوج نے بھی پیش قدمی کرتے ہوئے تنوآل، اوری (Uri) اور پونچھ کے کچھ علاقوں پر قبضہ کرلیا جب کہ ہندوستانی فوج نے ''لائن آف کنٹرول'' سے آٹھ کلومیٹر اندر واقع درۂ حاجی پیر پر قبضہ کرلیا۔ اس کے جواب میں یکم ستمبر ۱۹۶۵ء کو "Operation Grand Slam" کے نام سے پاکستان نے جموں سیکٹر میں واقع اکھنور پر قبضہ کرنے کے لئے حملہ کیا تاکہ ہندوستانی فوج کی لائن آف Communication & Supply کو مفلوج کیا جاسکے لیکن وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ ہندوستان نے کشمیر کے محاذ پر دباؤ کم کرنے کی غرض سے ۶ رستمبر کو بین الاقوامی سرحد کو عبور کرکے پنجاب کے بارڈر پر حملہ

کر دیا اور لاہور کے مشرق میں واقع برکی کے قریب سے اچھوگل کینال کو بھی پار کر لیا۔ یہاں سے لاہور کا ہوائی اڈہ ہندوستانی گولہ باری کی range میں تھا۔ باٹا پور بھی ہندوستانی فوج کے کنٹرول میں چلا گیا تھا لیکن بعد میں اس کو خالی کرنا پڑا۔ اس کے بعد سیالکوٹ سیکٹر میں ٹینکوں کی زبردست لڑائی ہوئی۔ غرضیکہ ہندوستانی فوج نے پاکستان کے ۷۱۰ مربہ میل (۱۸۴۰ مربہ کلومیٹر) علاقے پر اور پاکستانی فوج نے ہندوستان کے ۲۱۰ مربہ میل (۵۴۵ مربہ کلومیٹر) علاقے پر قبضہ کر لیا۔

۲۲ ستمبر کو اقوام متحدہ کی Security Council نے متفقہ طور سے ایک قرارداد منظور کی جس کے ذریعہ فریقین سے غیر مشروط جنگ بندی کی اپیل کی گئی تھی۔ چنانچہ اگلے ہی دن سے جنگ بند ہوگئی۔

اس کے بعد سوویت یونین (اس وقت کے) کے وزیر اعظم، جناب الیکزی کوسیجن کی دعوت پر ہندوستانی وزیر اعظم، جناب لال بہادر شاستری اور پاکستانی صدر، جناب جنرل ایوب خاں نے تاشقند (اب ازبکستان میں ہے) میں ملاقات کی اور ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کو ''تاشقند معاہدہ'' ("Tashkent Declaration") کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کی رو سے فریقین کو ۲۵ فروری ۱۹۶۶ء تک اپنی افواج اگست سے پہلے کی پوزیشن تک ہٹا لینی تھیں۔ اس پر عمل تو کیا گیا لیکن ہندوستان کو اس کی قیمت اپنے ہر دلعزیز، پستہ قد مگر بلند ارادوں والے، معصوم صورت مگر آہنی دل والے اور قوم کو ''جے جوان۔ جے کسان'' کا نعرہ دینے والے وزیر اعظم کی شکل میں ادا کرنی پڑی۔ ۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء کو ہندوستانی وقت کے مطابق شب کے ایک بج کر بتیس منٹ پر تاشقند میں شاستری جی کا دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ جنرل ایوب خاں جو کچھ دنوں پہلے تک برسر پیکار تھے، نے شاستری جی کی میت کو کاندھا دیا؛ اور پھر بالآخر میت دہلی لا کر اس کی آخری رسومات ادا کر دی گئیں۔ اُدھر پاکستان میں بھی جنرل ایوب خاں کو اپنی کرسی سے ۱۹۶۹ء میں دست بردار ہونا پڑا۔

(۸) **حافظ محمد ابراہیمؒ** = سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد سے، قصبہ نگینہ (بجنور) کے رہنے والے اور ضلع کے نامور وکلاء میں سے تھے۔ ابتداً ۳۷-۱۹۳۶ء میں ''مسلم لیگ'' کے ٹکٹ

پر اسمبلی کا الیکشن جیتا لیکن بعد میں مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہارویؒ جو آپ کے حقیقی خالہ زاد بھائی اور برادرِ نسبتی ہوتے تھے [احقر کی حقیقی نانی مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہارویؒ کے خاندان سے تھیں۔ اس کے علاوہ حافظ محمد ابراھیم یا مولانا حفظ الرحمنؒ کے ایک اور خالہ زاد بھائی، ڈاکٹر عبدالقدیرؒ سے احقر کی تائے زاد بہن منسوب ہوئیں۔]، کے اثر سے ''کانگریس'' میں آ گئے تھے۔

۵ ابتدا ہی سے آپ یو۔ پی کابینہ میں اہم وزارتوں کے وزیر رہے۔ پنڈت گوبند بلبھ پنت آپ کے بہت مداحوں میں سے تھے۔ چنانچہ جب پنڈت جی صوبہ سے مرکز میں آ کر وزیر داخلہ ہوئے تو آپ کو مرکزی کابینہ میں لیتے ہوئے وزیر برائے ''آبی ذرائع'' بنا دیا گیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ندیوں کے پانی کی تقسیم سے متعلق ۱۹۶۰ء میں ''سندھ طاس آبی معاہدہ'' کرانے کا سہرا در اصل آپ ہی کے سر ہے۔ مرکز میں آنے کے بعد جب آپ نے ۶۳-۱۹۶۲ء میں امروہہ (مراد آباد) پارلیمینٹری سیٹ سے ضمنی انتخاب لڑا تو آچاریہ کرپلانی کے مقابلے میں مات کھا گئے۔ [اس سیٹ سے مولانا حفظ الرحمن منتخب ہوئے تھے جنکا کینسر کے موذی مرض میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس الیکشن میں آپ کو ہرانے میں درپردہ "کانگریس پارٹی" کا بھی ہاتھ رہا تھا۔ (ان دنوں صوبے میں "کانگریس پارٹی" کی حکومت تھی اور وزیر اعلیٰ آچاریہ کرپلانی کی اہلیہ، سچیتا کرپلانی تھیں)] مذکورہ الیکشن ہار جانے کے بعد آپ کو پنجاب کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ کے دوران آپ پنجاب کے گورنر تھے۔

آپ ایک مثالی ایماندار (خاص کر آج کل کے نیتاؤں کے لیے) اور سادہ لوح انسان تھے۔ آپ کا دستر خوان بہت وسیع تھا۔ کھانے کے وقت کوئی بھی شخص آپ کے یہاں سے بنا کھانا کھائے نہیں جا سکتا تھا۔ ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ جب انتقال ہوا تو مقروض تھے۔ ["All India Institute of Medical Sciences" نئی دہلی میں انتقال ہوا۔ جب وزیر اعظم، محترمہ اندرا گاندھی آپ کی وفات کی خبر سن کر انسٹی ٹیوٹ پہنچیں تو آپ کے پسماندگان نے ان سے درخواست کی کہ یہاں سے نگینہ میت لے جانے کے لئے ایک گاڑی کا بندوبست کرا دیں لیکن محترمہ سنی ان سنی کر کے وہاں سے چلی آئیں تب وہاں موجود سعودی عربیہ کے سفیر نے گاڑی کا انتظام کرایا۔]

۵ [۱۸۸۷ - ۱۹۶۱ء]

آخیر عمر میں آپ کو مالیخولیہ کا مرض ہوگیا تھا۔ لکھنؤ میں MLAs کی رہائش گاہ کا نام ''دار الشفاء'' آپ ہی کا تجویز کردہ ہے۔

آج بھی ضلع کی سیاست میں آپ کے خاندان کو عزت واحترام کا مقام حاصل ہے۔

(۹) ہر بستی، ہر قریہ (خواہ اس میں آبادی کتنی ہی لوگوں کی کیوں نہ ہو۔) کی حفاظت پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے کم سے کم ایک ولی اللہ تعینات کیا ہوا ہے۔ بنا اس کی مرضی کے اس بستی یا علاقے میں کچھ نہیں ہوسکتا۔ جب اللہ بزرگ و برتر کی مرضی سے کسی علاقے یا بستی میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آنا ہوتا ہے تو وہ (اللہ) متعلقہ ولی اللہ یا اولیاء اللہ کو وہاں سے ہٹا دیتا ہے۔ [ان کا وصال ہوجاتا ہے یا پھر وہ کہیں اور چلے جاتے ہیں۔]

(۱۰) جب ۱۶۸۷ء میں آٹھ ماہ مسلسل شہنشاہ اورنگ زیب گولکنڈہ کے قلعہ کا محاصرہ کیے رہا تو اس کو تشویش ہوئی۔ اسی دوران بادوباراں سے موسیٰ ندی میں زبردست طغیانی بھی آگئی جس سے مغل لشکر منتشر اور اس کے مورچے منہدم ہونے لگے۔ ان شدید نامساعد حالات میں ایک رات اورنگ زیب نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا جو فرما رہے تھے ''اے بادشاہ! تیری فوج میں دو گوہر نایاب ہیں، جب تک وہ نہ چاہیں گے تجھے فتح نصیب نہیں ہو سکتی اور ان کی شناخت یہ ہے کہ طوفان نہ تو ان کے خیموں کو اکھاڑ سکتا ہے اور نہ ہی ان کے چراغ گل کرسکتا ہے۔'' (۱۵) آنکھ کھلی تو اورنگ زیب نے دیکھا کہ موسلا دھار بارش ہورہی ہے، ہر جانب طوفان برپا ہے اور چاروں سمت گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہے لیکن دور ایک مقام سے چراغ کی مدھم سی روشنی آرہی ہے۔ وہ فوراً اس سمت لپکا۔ دیکھا کہ دو سپاہی قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ اورنگ زیب کو دیکھتے ہی وہ دونوں کھڑے ہوگئے۔ اورنگ زیب نے ان سے کہا کہ آپ جیسے بزرگ لشکر میں موجود ہوں اور فتح نصیب نہ ہو، یہ تو تعجب کی بات ہے! ان دونوں بزرگوں نے یک زبان ہوکر فرمایا کہ ظلِ سبحانی! جہاں فریقین مسلمان ہوں وہاں سکوت ہی بہتر ہے۔ لیکن ان کے اس جواب سے بادشاہ مطمئن نہیں ہوا۔ تب ان میں سے ایک نے ایک ٹھیکری پر کچھ لکھ کر بادشاہ کو دیتے ہوئے فرمایا کہ لنگر حوض کے کنارے ایک موچی مقیم ہے، یہ ٹھیکری اس کو دے کر جواب لے آئیں۔ بادشاہ جب اس موچی تک پہنچا تو موچی نے ٹھیکری لے کر بادشاہ کو قہر

آلود نگاہوں سے دیکھا اور پھر اس ٹھیکری کے دوسری جانب کچھ لکھ کر وہ بادشاہ کو لوٹا دی۔
جب بادشاہ نے وہ ٹھیکری ان دونوں بزرگوں کو واپس لاکر دی تو انھوں نے تحریر پڑھ کر کچھ توقف کے بعد فرمایا کہ قلعہ کی تسخیر مشکل ہے، بڑی بڑی ہستیاں سلطان ابوالحسن (والیٔ قلعہ) کی طرفدار ہیں۔ بادشاہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا کہ کیا میری طرف کوئی بزرگ نہیں؟، اور پھر ان بزرگوں کو دوبارہ کوشش کرنے پر مجبور کردیا۔ مجبوراً ان دونوں بزرگوں نے اسی ٹھیکری پر دوبارہ کچھ لکھ کر بادشاہ کے ذریعہ اسی موچی کے پاس بھیج دی۔ اسی دوڑ دھوپ میں سحر کے آثار نمودار ہو چلے تھے۔ اس بار موچی اس ٹھیکری کو بہت دیر تک گھورتا رہا۔ بادشاہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چلا تھا۔ اس نے کہا کہ حضرت! جلدی کیجئے مجھے واپس جاکر فجر کی نماز بھی ادا کرنی ہے۔ غیض وغضب کے عالم میں موچی کے ہاتھ سے وہ ٹھیکری نیچے گرگئی۔ اس نے اپنے جسم پر پڑے ہوئے چمڑے اور اطراف میں پڑے ہوئے جوتے بٹورے اور دامن جھٹک کر کھڑا ہو گیا اور ایک سرد آہ بھر کر فرمایا ''مشیت ایزدی یہی تھی؛ میں پچاس سال سے اس قلعہ کے دامن میں گوشہ گیر تھا؛ آخر جیتے جی یہاں سے اٹھنا پڑا؛ جاؤ ان سے کہہ دینا کہ وہ چلا گیا۔''
جب اورنگ زیب نے واپس جاکر ان بزرگوں کو حالات سے آگاہ کیا تو انھوں نے فتح کی مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ اب ہماری فوجیں قلعہ میں داخل ہو سکتی ہیں، اور پوچھنے پر یہ بھی بتایا کہ وہ حقیقت میں موچی نہیں بلکہ اس خطۂ ارض کے قطبؔ تھے جو پچاس سال سے اس قلعہ کے معاون ومحافظ تھے۔ اس طرح ۲ر ستمبر کو مذکورہ قلعہ ایک ہی یلغار میں فتح ہو گیا۔ وہ دونوں بزرگ حضرت سیّد یوسفؒ اور حضرت سیّد شریفؒ تھے جو دونوں اپنے وقت کے قطبؔ ہوئے ہیں۔ [تفصیلات احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' کی جلد چہارم ''تذکرۂ جہانیاں'' میں ملاحظہ فرمائیں۔]

(۱۱) منقول ہے کہ ۶۴ ےھ (۱۳۶۲ء) میں سلطان فیروز شاہ تغلقؔ (م ۱۳۸۸ء) نے دوسری بار ٹھٹہؔ پر حملہ کیا اور پل توڑ کر معہ لشکر سندھ میں داخل ہو گیا۔ ٹھٹہؔ کا حکمراں، جام بابینہ قلعہ بند ہو گیا اور سندھی فوجیں قلعہ سے باہر نکل کر بڑی بہادری سے فیروز شاہی لشکر کا مقابلہ کرتی رہیں بالآخر فیروز شاہ کو یہ یقین ہو چلا کہ اس کی فتح ناممکن ہے۔ اسی اثناء میں مخدوم جہانیاں

جہاں گشتؒ (م ۱۳۸۳ء) بھی اوچ سے ٹھٹھہ کے قریب آپہنچے۔ فیروز شاہ معہ لشکر ان کے استقبال کے لئے حاضر ہوا اور دعا کی درخواست کی۔ [سلطان فیروز شاہ تغلق، مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ سے بیعت تھا۔] انھوں نے فرمایا کہ عنقریب تمھاری فتح ہو جائے گی کیوں کہ ٹھٹھہ میں جو ولیہ رہتی تھیں اور جن کی وجہ سے ٹھٹھہ فتح نہیں ہو پا رہا تھا، اب کچھ ہی روز پہلے ان کا وصال ہو چکا ہے۔ چنانچہ جب فیروز شاہ نے حملہ کیا تو اس بار قلعہ بآسانی فتح ہو گیا۔

(۱۲) ایک بار حضرت شیخ احمد عبدالحق ردولویؒ [م ۱۴۳۲ء] قصبہ سنام [صوبہ پنجاب میں سرہند کے قریب واقع ہے] میں ایک ضعیفہ، فاطمہؒ کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ وہیں ان کی ایک مجذوب سے بھی دوستی ہو گئی جو مسجد میں پڑے رہتے تھے۔ بہت سے مجاذیب اور بے شمار لوگ ان سے نیاز مندی کرتے تھے۔ ایک دن ایک دراز قد مجذوب ولایتِ خراسان سے آیا اور سنامی مجذوب سے کہنے لگا کہ تم میری ولایت خراب کر کے آئے ہو، اب میں تمھاری ولایت خراب کر دوں گا۔ دوسرے دن فاطمہؒ جو بہت صالح اور ولیہ صفت خاتون تھیں، نے خواب میں دیکھا کہ حوض میں سے کچھ لوگ مچھلیاں مار رہے ہیں۔ انھوں نے صبح کو حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے، اور پھر فرمایا کہ تمہارے خواب کی تعبیر تو یہ ہے کہ سنام خراب ہو جائے گا، اور میرے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ دلّی تباہ ہو جائے گی۔ [ان ہی ایام میں مغلوں کا لشکر حملہ آور ہوا جس سے علاقہ تہ و بالا ہو گیا۔] شیخ عبدالحقؒ نے جب سنامی مجذوب کے پاس جا کر پوچھا کہ کیا کرنا چاہیے تو انھوں نے فرمایا کہ قہرِ حق نازل ہو چکا ہے، یہاں سے چلے جاؤ، ہم بھی یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد شیخ عبدالحقؒ اپنے پیر مرشد، شیخ جلال الدین کبیر اولیاءؒ (م ۱۳۶۳ء) کے پاس پانی پت چلے گئے۔ وہاں بھی دیکھا کہ شیخ جلالؒ کوہِ شمال کی جانب جانے کی تیاری میں مصروف ہیں۔ انھوں نے شیخ عبدالحقؒ کو دیکھ کر فرمایا ''بابا احمد! قہرِ حق نازل ہو چکا ہے، جاؤ تمہیں اللہ کے سپرد کیا''۔ اس کے بعد شیخ عبدالحقؒ، بدایوں کی طرف تشریف لے گئے۔

[''مرآۃ الاسرار'' (اردو ترجمہ) ص ۱۰۴۰، ۱۰۴۱؛ ''تذکرہ اولیائے پاک و ہند'' ص ۱۹۰، ۱۹۱]

اسی طرح جب اللہ تبارک وتعالیٰ کو گولکنڈہ کا قلعہ تسخیر کرنا منظور ہوا (ظاہر ہے کہ جب بھی مخالف فوجیں کسی بھی علاقے میں داخل ہوتی ہیں تو علاقے میں قتل و غارت گری اور تباہی مچتی ہی ہے۔) تو اس نے پچاس سال سے قلعہ کی محافظت کرنے والے قطب الارض کو وہاں سے ہٹا دیا۔ [تفصیل (۱۰) میں ملاحظہ فرمائیں۔]

(۱۳) اٹل جی کا ''مینارِ پاکستان'' پر جانا اس لئے ان کا ایک جرأت مندانہ فعل اور حیرت انگیز کارنامہ کہا جا سکتا ہے کیوں کہ ان کا تعلق ایک ایسی تنظیم کی شاخ سے ہے جس کا منشور جگ روشن اور اندازِ فکر بالکل واضح ہے اور جو اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کی کھلے بندوں مخالف رہی ہے۔ جس کا اقلیتی افراد، بالخصوص مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی اور انھیں مسمار کرنے سے سیدھا تعلق رہا ہے۔ جس کا مسلم کش فسادات سے دامن تار تار اور خوں آلود رہا ہے۔

ماضی میں انھوں نے مسلم کش فسادات کرا کر دیکھ لئے۔ [یہ قابلِ ذکر ہے کہ یہ فسادات انھیں شہروں میں کرائے گئے جہاں مسلمانوں کی Small Scale Industries قائم تھیں۔] مقصد صاف تھا، مسلمانوں کو بے دست و پا اور اقتصادی اعتبار سے مفلوج کر کے رکھ دینا نیز ان کی آبادی پر روک لگا دینا یا پھر ان کے دماغ (پڑھا لکھا اور سرمایہ دار طبقہ) کو اسپین کی طرح نقلِ مکانی کرنے پر مجبور کر دینا وگرنہ ان کو اس مقام پر لے آنا جہاں انھوں نے ماضی میں دوسرے طبقات کو رکھا اور جن کو اب سرکار اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ [سوسائٹی کا کوئی کام بند نہیں ہوتا، خدمتی کام کمزور طبقہ ہی انجام دیتا ہے۔] لیکن مسلم نئی نسل نے انھیں اُن کے اِن مقاصد میں کامیاب نہیں ہونے دیا۔

[نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور   موت کیا شے ہے، فقط عالمِ معنیٰ کا سفر!]

پاکستان کے بننے سے ہندی مسلمانوں کا جو Brain Drain ہو گیا تھا، اس کو نئی نسل نے بخوبی پُر کرنے کی سعی کی۔ جب ان (.R.S.S اور اس کی ذیلی تنظیموں) کی پہلی حکمت عملی کارگر نہ ہوئی تو اب انھوں نے اسرائیل کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی Strategy تبدیل کر دی ہے۔ اب ان کے نشانے پر تعلیم یافتہ مسلم نوجوان ہیں جنھیں منظم اور دہشت گردانہ طریقے سے اغوا کر کے اور مبینہ طور پر دہشت گرد قرار دیتے ہوئے انکا فرضی

Encounter کیا جا رہا ہے۔ [کیوں کہ جن بے قصور مسلم نوجوانوں کو وہ پکڑتے ہیں انھیں عدالت سے انصاف مل جاتا ہے۔] ستم ظریفی تو یہ ہے کہ یہ کام اس ایجنسی سے انجام دلایا جا رہا ہے، جس سے ایسی توقع نہیں کی جا سکتی کیوں کہ ان کا بنیادی مقصد ظلم وزیادتی کا سدِ باب کرنا ہے، نہ کہ اس میں ملوث ہو جانا۔ (۱۶) شاید سرکاری مشینری میں یہ وہی پرزے ہیں جن کو فٹ (Fit) مذکورہ تنظیم نے اپنے دورِ اقتدار میں کیا تھا۔ پہلے سہارا ''لشکرِ طیبہ'' کے نام کا لیا جاتا تھا، اب سیمی (SIMI) اور ''انڈین مجاہدین'' کے نام ایجاد کرتے گئے ہیں۔ [حالانکہ ۲۵؍ اگست ۲۰۰۸ء کو کانپور (بھوپیندر چوپڑا اور راجیو مشرا) اور اپریل ۲۰۰۶ء میں نانڈیڑ (نریش اور ہمانشو پانسے) میں بم بناتے ہوئے ہر دو جگہوں پر جو دو دو اشخاص ہلاک ہوئے تھے، ان سب کا تعلق ''بجرنگ دل'' سے تھا۔ اسی طرح ۲۰۰۳ء میں پربھنی کی مسجد میں جو بم پھٹا اس میں بھی اسی تنظیم کا ہاتھ بتایا گیا ہے۔ (بشکریہ ''ہندوستان ٹائمس''، مورخہ ۱۷؍۱۰؍اکتوبر ۲۰۰۸ء، ص ۶)] دراصل صیہونی طاقتوں کے مقاصد تین ہیں: اول یہ کہ مسلم Community کو اتنا خوف زدہ کر دیا جائے [تو پھر سوچیں کہ دہشت گرد کون ہوا؟] کہ والدین اپنے بچوں کو اعلیٰ اور مناسب تعلیم دلانے کی غرض سے باہر کسی معیاری درس گاہ میں نہ بھیجنے پائیں؛ دوئم یہ کہ نجی ادارے، بالخصوص Multinational Companies ان کے لئے اپنے دروازے بند کر دیں [سرکاری ملازمتوں میں تو ان کا تناسب لگ بھگ صفر کیا ہی جا چکا ہے]؛ سوئم یہ کہ کھلے ذہن، انصاف پسند غیر مسلموں کے ذہنوں کو پراگندہ کرتے ہوئے انھیں ان کے اِن اوصاف سے محروم کر دیا جائے تاکہ وہ مسلمانوں کو اچھوت سمجھنے لگیں۔ لیکن انشاءاللہ ان کا یہ حربہ بھی کارگر نہ ہو سکے گا کیوں کہ اس نانک، چشتی اور گاندھی کے دیش میں ابھی انصاف پسند اور سلجھے ذہن برادرانِ وطن اتنے بھی بے وزن نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ اب ستم زدوں نے بھی آنسو کی بجائے پسینہ بہانا سیکھ لیا ہے۔ ہر تاریکی میں صبحِ نو کا راز مضمر ہے۔ ہر خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے کاروانِ بہار دیکھا ہے

ویسے بھی یہ قدرت کا نظام ہے کہ جس قوم کو جتنا دبایا جاتا ہے، اس کی تخلیقی صلاحیت میں اتنا ہی اضافہ بھی ہوتا ہے؛ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پاسباں مل جائیں کعبہ کو صنم خانے سے۔

لیکن اس آزمائش کی گھڑی میں یہ بھی ضروری ہے کہ ہم بھی اپنا محاسبہ کریں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اس دور میں، اسی ملک میں جب کہ گاؤں گاؤں میں مدن موہن مالویہ پیدا ہورہے ہیں اور جگہ جگہ نجی سیکٹر میں M.B.A، انجینیرنگ اور میڈیکل کالج کھل رہے ہیں تو ہمارے یہاں سرسید احمد خاںؒ کیوں نہیں پیدا ہورہے؟ آخر ہم کب تک تعلیم سے بھاگتے رہیں گے؟۔ ایک بار مدن موہن جی نے فرمایا کہ سرسیدؔ کو مجمع جمع کرنے کی ضرورت ہی نہیں، مسجد میں ہی سب مل جاتے ہیں، لیکن اب بقول اکبرالہ آبادی حال یہ ہے ؎

گرجا میں ''لاٹ'' صاحب مسجد میں فقط جمنؔ

ہمارا الیکٹرونک میڈیا، ہمارا اپنا پرنٹ میڈیا کیوں نہیں؟۔ کیا ہمارے پاس سرمائے کی کمی ہے؟، کیا ہمارے پاس باصلاحیت افراد کا فقدان ہے؟ نہیں، بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر کمی ہے تو اتحاد واتفاق کی، اگر کمی ہے تو تنظیم کی۔ آج ہم شور مچاتے ہیں کہ سرکاری ملازمتوں میں ہمارا تناسب صفر رہ گیا ہے۔ کیا ہم نے یہ دیکھا کہ جس مقام پر ہمارا جتنا تناسب ہے وہاں کے تعلیمی اداروں میں بھی ہمارا اتنا ہی تناسب ہے؟ آخر اس کا ذمہ دار کون ہے؟۔ کیا سرکار ہمارے گھر سے بچوں کو اسکول لے جانے کے لئے آئے گی؟ بقول علامہ اقبال ؎

آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں ''حَرفِ لا تَدعُ مع اللّٰہ الٰہا آخر''

ہم اپنے گھروں میں دروازے تو لگاتے نہیں اور رہزن سے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ ہمارے گھر کی رکھوالی کرے!؟ ؎

لوگ ناخوں سے بناتے ہیں چٹانوں میں کنواں اور امید یہ کرتے ہیں کہ پانی نکلے!!

یہ کہاں کا منطق ہے؟۔ آج ہم ''بجرنگ دل'' پر تو پابندی عائد کرنے کی بات کرتے ہیں لیکن کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کی پشت پر کتنی زبردست تنظیم (۱۴) ہے۔ حال ہی میں ''ہندوستان ٹائمس'' میں اس تنظیم کا ایک مختصر سا خاکہ شائع کیا گیا ہے۔ آپ بھی اس کو ملاحظہ فرمالیں۔ افسوس! ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنے بھی چہرے کو بگاڑ!
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے!!

ایک بار کسی نے کسی مفکرّ (غالباً روسی مفکر، ٹالسٹائی) سے پوچھا کہ دنیا میں سب سے اچھی چیز کیا ہے اور سب سے بری چیز کیا ہے؟۔ اس نے جواب دیا کہ سب سے اچھی چیز مذہب اسلام ہے اور سب سے بری چیز آج کل کے مسلمان ہیں۔ جب سوالی نے وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ حالتِ نماز میں اسلام کی Discipline اور مسجد سے باہر نکلتے وقت مسلمانوں کی افراتفری کا عالم خود دیکھ لو۔

صد افسوس!! ایک وہ وقت تھا جب کسی بھی مومن کو دیکھ کو باہم دست و گریباں کفار یہ سمجھ جاتے تھے کہ اب تصفیہ ہو جائے گا؛ ایک یہ دور ہے کہ ہم خود دست و گریباں ہیں، ہماری موجودگی الٹے شعلے بھڑ کانے کا سبب بن جاتی ہے۔ آج ہم یہ بھول گئے ہیں کہ ہم اس کے غلام ہیں جو رحمت اللعالمین بن کر تشریف لایا۔ غلامی کے نام پر ہم نفسِ امارہ کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔ آج ہمارے رہنما مصلحت کوشی، سرمائے دار آرام طلب اور masses کسی معجزے کے انتظار میں ہیں۔ ہم کمیشنوں سے تو امید رکھتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ یہ خواب آور خوشنما capsules سے زیادہ کچھ نہیں۔ کمیشن تو ہر سیاسی پارٹی کا ایک حربہ بھر ہوتا ہے۔ کپڑے تبدیل کر لئے جاتے ہیں لیکن جسم اور ذہن تبدیل نہیں ہوتے۔ افسوس کہ جو قوم "اَلصَّلٰوۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّوم" کی ایک صدا پر بسترِ استراحت سے الگ ہو جاتی تھی آج وہ گھوڑے بیچ کر سوئی ہوئی ہے۔ یاد رکھیں، بنا قربانی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آج اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہم صفوں میں اتحاد قائم رکھیں؛ نظم وضبط، صبر و تحمل سے کام لیں اور دہشت گردوں [جو یقیناً مسلمان نہیں ہو سکتے کیوں کہ اسلام تو اخوت و بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔ خودکشی اسلام میں حرام ہے؛ اور اسی لئے خودکشی کرنے والے کے لئے دعائے مغفرت بھی نہیں کی جا سکتی۔ جان اللہ کی ایک امانت ہے، امانت میں خیانت کا کسی کو کوئی حق نہیں۔ اس لئے ایسا کرنے والے اسلام کے دشمن ہی ہونگے۔ وہ مسلمان ہو ہی نہیں سکتے۔] کو اپنے منصوبوں میں کامیاب نہ ہونے دیں۔ بقول اکبر الہ آبادی ؎

نازک بہت ہے وقت، خموشی سے ربط کر
غصہ ہو، آہ ہو، کہ ہنسی، سب کو ضبط کر

یہ ضروری ہے کہ سرمائے دار وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ تعلیمی ادارے اور انڈسٹریز

قائم کریں: نوجوان تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں اور مقابلے جاتی امتحانات میں Top کریں [وہ یہ: ہن نشین کرلیں کہ کچھ مسلم دشمن قوتیں لکھنے پڑھنے والے نوجوانوں جن کا مستقبل الحمدللہ تابناک ہے، کو دہشت گرد بنانے کی مذموم کوشش کر رہی ہیں تا کہ وہ اپنے راستے سے بھٹک جائیں۔]سیاست داں مصلحت کوشی کے خول سے باہر نکل کر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک Charter of Demand مرتب کر کے جمہوریت نواز سیاسی پارٹیوں سے رابطہ قائم کریں [جمہوریت میں انسانوں کو تولا نہیں جاتا بلکہ ان کو گنا جاتا ہے۔] اور Masses کی رہنمائی فرمائیں۔ Masses کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بکھروں کی روش چھوڑ کر اپنے رہنماؤں کے فیصلے پر لبیک کہیں۔ یاد رکھیں! چاند کے نکلنے پر ستارے ماند پڑ جاتے ہیں؛ اور چاند، ستاروں کی دنیا میں تنہا ہوتا ہے، یعنی اقلیت میں ہوتا ہے۔ اپنے کردار سے فراق گورکھپوری کے اس قطعہ میں بیداری کی روح پھونک دیں۔

قرنوں کے مٹانے سے مٹے ہیں نہ مٹیں گے   آفاتِ زمانہ سے جھکے ہیں نہ جھکیں گے
ابھرے تو دبانے سے دبے ہیں نہ دبیں گے   ہم موت کے مارے بھی مرے ہیں نہ مریں گے
ہم زندہ تھے، ہم زندہ ہیں، ہم زندہ رہیں گے

(۱۴) راشٹریہ سونم سیوک سنگھ (R.S.S.) ؁

- وشو ہندو پریشد ۲ (V.H.P.)
  - سیوا بھارتی ۷ (S.B.)
  - وِدیا بھارتی ۸ (V.B)
  - بجرنگ دل ۹ (B.D.)
- ونواسی کلیان آشرم ۳ (V.K.A.)
- بھارتیہ مزدور سنگھ ۴ (B.M.S.)
- اکھل بھارتیہ ودھیارتھی پریشد ۵ (A.B.V.P)
- بھارتیہ جنتا پارٹی ۶ (B.J.P)
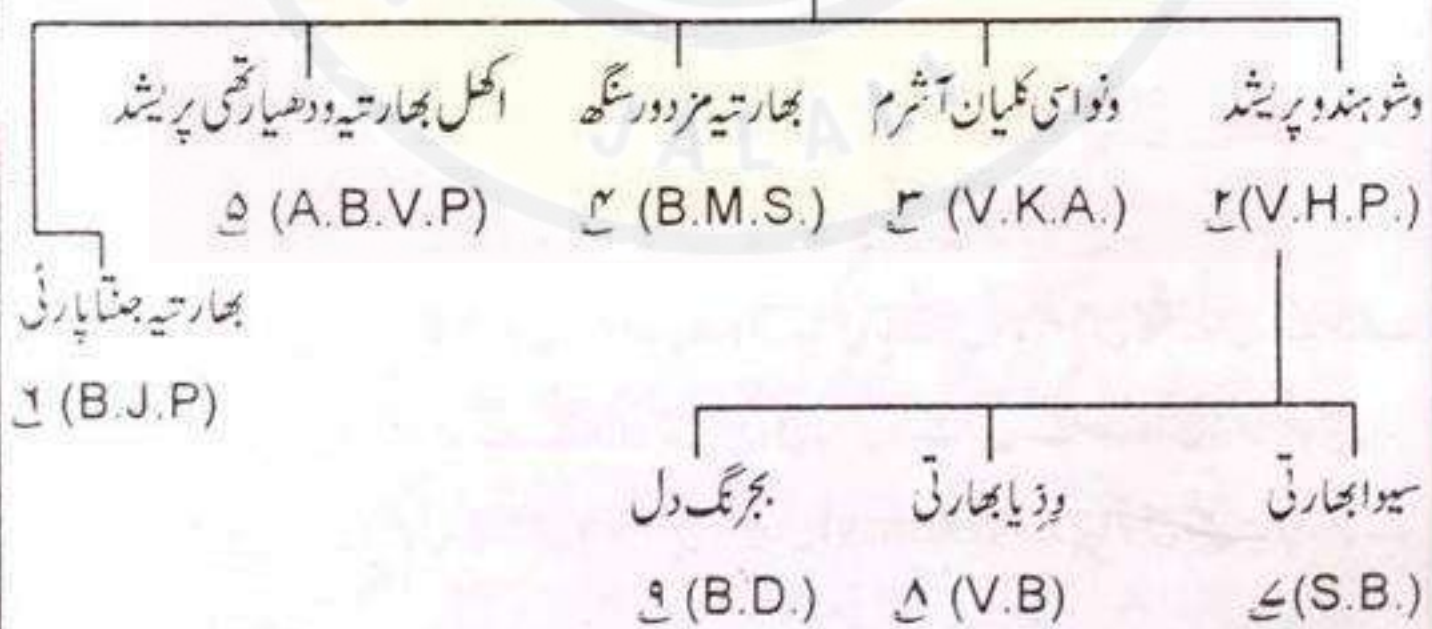
؁ یہ ایک مردانہ نیم فوجی تنظیم ہے جس کے جھنڈے کا رنگ بھگوا (گیرواں) ہے۔ اس کی تشکیل ۲۶/۱۹۲۵ء میں ہوئی تھی۔ ناگپور میں کانگریس سیشن کے موقع پر ایک کانگریسی

کارکن، ہیگوار (Hedgewar) نے پہلی مرتبہ رضا کاروں کی ایک تنظیم قائم کی جن کی وردی: خاکی نیکر، سفید قمیص اور کالی ٹوپی مقرر کی گئی تھی۔ اس کے پانچ سال بعد اس نے اسی تنظیم کو .R.S.S کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ اس وقت اس تنظیم کے تقریباً اٹھارہ لاکھ ممبران اور ان کی چالیس ہزار شاخیں (Branches) ہیں۔ اس تنظیم کا مکھیا (Head) ''سرسنگھ چالک'' کہلاتا ہے۔ (اس کا ہیڈ کوائر ناگپور میں ہے۔) اس وقت اس کے، موہن بھاگوت ''سرسنگھ چالک'' ہیں۔ اس تنظیم کے تین ہزار ایسے Full time میل (Male) ورکر ہیں جو غیر شادی شدہ ہیں (شری انل بہارتی واجپئی جی بھی ابھی تک کنوارے ہیں۔) یہ ''پرچارک'' کہلاتے ہیں اور اس تنظیم کی ریڑھ کی ہڈی مانے جاتے ہیں۔ یہ ''پرچارک'' ذیلی تنظیموں: جیسے .B.J.P اور .B.M.S وغیرہ کو وقت پڑنے پر ادھار دیئے جاسکتے ہیں۔

۲ـ ۱۹۶۴ء میں ۲۹ راگست کو سادھوؤں کے اجتماع میں بحیثیت R.S.S کی مذہبی شاخ کے قائم ہوا۔ اس وقت اس کے صدر اشوک سنگھل اور عالمی سکریٹری پروین توگڑیا ہیں۔

۳ـ ۱۹۵۲ء میں قائم ہوا۔ اس کا کام عیسائی مشنریز کی سرگرمیوں کا کاٹ کرنا ہے، خاص کر قبائلی علاقوں میں۔ اس وقت اس کے روح رواں جگدیو اوروں ہیں۔

۴ـ یہ ''لیفٹ ٹریڈ'' (Left Trade) یونینوں (کمیونسٹ یونینوں) کے متبادل بطور وجود میں لائی گئی۔ اس وقت اس کے صدر حسو بھائی دوے ہیں۔

۵ـ ۱۹۴۸ء میں قائم ہوا۔ طالب علموں میں کمیونسٹوں کے اثرات کی بیخ کنی کے لئے وجود میں لایا گیا۔ اس وقت اس کے صدر رام نریش سنگھ (ساکن سہرسہ، بہار) ہیں۔

۶ـ دسمبر ۱۹۸۰ء میں قائم ہوئی۔ جمہوریت نواز سیاسی پارٹیوں، بالخصوص کانگریس کے خلاف سیاسی سطح پر محاذ آرائی کے لئے وجود میں لائی گئی۔ اس وقت اس کے صدر راج ناتھ سنگھ ہیں۔

۷ـ ۱۹۷۹ء میں قائم کی گئی۔ اس کا کام کچی بستیوں (Slums) اور دیہاتوں میں پرچار کرنے کا ہے۔

۸ـ ۱۹۷۷ء میں قائم کی گئی۔ اس کا کام اسکولوں کے Network میں اشتراک پیدا کرنے کا ہے۔

۹ ۱۹۸۴ء میں قائم کی گئی۔ اس کا کام بزور طاقت اپنی بات منوانے کا ہے۔ اس وقت اس کے نیشنل کنوینر پرکاش شرما ہیں۔

[بشکریہ ''ہندوستان ٹائمز'' ص ۹، مورخہ ۹/ اکتوبر ۲۰۰۸ء]

مذکورہ بالا کے علاوہ بھی بہت سی ایسی تنظیمیں ہیں جن میں باہمی اشتراک اور اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کے بارے میں نظریاتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے؛ جیسے: ''بھارتیہ کسان سنگھ'' (.R.S.S کی کسان شاخ ہے)، ''درگا واہنی'' (وشو ہندو پریشد'' کی خواتین شاخ ہے جس کی ابتداء ۱۹۹۱ء میں سادھوی رتھمبرا نے کی۔)، ''راشٹریہ سیویکا سمیتی'' (یہ .R.S.S کی طرز پر خواتین کی تنظیم ہے جو ۱۹۳۶ء میں وجود میں آئی۔ اس کے ذمے ''سمیتی شکشک ورگ'' کا انتظام ہے)، ''جے کلیان سمیتی''، ''ہندو جاگرن سمیتی'' (جموں کے علاقے میں سرگرم ہے)، ''ہندو راشٹریہ سینا'' (HRS)، ''آریہ سینا'' (اس کا چیف یو۔ پی کے مظفر نگر کا رہنے والا ایک برخاست شدہ سپاہی، ستیندر ملک ہے ۲۰۰۲ء میں سہارنپور میں ہوئے متعدد دھماکوں سے یہ بے نقاب ہوا اور ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔)، ''شری رام سینا'' (اس کا بانی رکن کرناٹک کا پرمود متھالک ہے جو کبھی ''بجرنگ دل'' میں ہوا کرتا تھا۔ ۲۰۰۴ء میں اس نے مذکورہ دل سے علیحدگی اختیار کرتے ہوئے ۲۰۰۸ء میں اس تنظیم کی بنیاد رکھی۔)، ''شیو سینا'' (اس کے صدر بال ٹھاکرے ہیں جو کبھی ہفتہ وار ''مارمک'' میں ایک کارٹونسٹ ہوا کرتے تھے۔ ۱۹/ جون ۱۹۶۶ء میں وجود میں آئی۔)، ''مہاراشٹر نو نرمان سینا'' (M.N.S) (بال ٹھاکرے کے جواں سال بھتیجے، راج ٹھاکرے اس کے کرتا دھرتا ہیں جو کبھی ''شیو سینا'' میں ہوا کرتے تھے لیکن ۲۰۰۶ء میں انھوں نے اپنی یہ نئی پارٹی تشکیل دے لی۔ تبھی سے اس نے آج کل ممبئی میں دہشت کا ماحول پیدا کیا ہوا ہے نیز توڑ پھوڑ اور قتل و غارتگری کا بازار گرم کیا ہوا ہے۔)، ''ہندو جاگرن منچ''، ''جے بندے ماترم''، ''اکھل بھارتیہ ہندو مہا سبھا'' (۱۹۱۵ء میں قائم ہوئی۔ موجودہ صدر ہمائی ساور کر ہیں۔)، ''سناتن پربھات''، ''سناتن سنستھا'' (جموں کے علاقے میں سرگرم ہے۔)، ''گرو کرپا پرشٹھان'' (کشمیر کے جموں علاقے میں سرگرم ہے۔)، ''ہندو وِویک کیندر'' (کمیونسٹ طرز پر ہندوتو لٹریچر تقسیم کرنے کی ذمہ داری ہے۔)، ''بھارتیہ جن شکتی

پارٹی'' (.R.S.S کی سیاسی شاخ ہے جس کی روحِ رواں اوما بھارتی ہیں جو پہلے بھی ''بی جے پی'' میں ہوا کرتی تھیں اور مرکز میں وزیر بھی رہیں۔ اوما بھارتی ایک شعلہ بیان مقرر ہیں۔)، ''دین دیال شودھ سنستھان'' (.R.S.S کی Idiological Unit ہے۔ ''منتھن'' نامی رسالہ نکالتی ہے۔)، ''دین دیال ریسرچ انسٹیٹیوٹ'' (یہ بھی .R.S.S کی Idiological unit ہے۔ دراصل دین دیال اپادھیائے بھی .R.S.S کے سینیر کارکن ہوا کرتے تھے۔ انھیں پُراسرار طور سے قتل کردیا گیا تھا۔)، ''ہندو ساہتیہ کیندر'' (۱۹۸۴ء میں قائم ہوا)، ''نیشنل میڈیکوز آرگنائزیشن'' (آر ایس ایس کی طبّی شاخ ہے)، ''ابھینو بھارتی'' (اس کی بنیاد ویر ساورکر نے ۱۹۰۴ء میں رکھی تھی لیکن ۱۹۵۲ء میں اسے بند کردیا گیا تھا۔ ۲۰۰۶ء میں اسے دوبارہ ''ہندو مہا سبھا'' کے بانی، ویر ساورکر کے بھائی کی بہو، اور مہاتما گاندھی کے قاتل، ناتھورام گوڈسے کے بھائی، گوپال گوڈسے کی دختر، ہیمانی ساورکر نے زندہ کیا۔ رمیش اپادھیائے اس کا موجودہ صدر اور سمیر کلکرنی مدھیہ پردیش شاخ کا صدر ہے۔ ''مالیگاؤں بم دھماکے'' سے جڑے سبھی مشتبہ ہندو دہشت گرد کسی نہ کسی شکل میں اس تنظیم سے جڑے ہیں۔)، ''راشٹریہ جاگرن منچ'' (R.J.M) (پرگیہ سنگھ ٹھاکر عرف سادھوی پورنہ چیتانندگری صدر ہے۔ یہ اسی سال ۲۰۰۸ء میں ۳ر جولائی کو اندور میں ہوئے فرقے وارانہ فساد جس میں آٹھ جانیں تلف ہوئیں، کے بعد وجود میں آئی۔) اور ''ہندو منانی'' (یہ جنوبی صوبوں میں قائم ہے۔) وغیرہ وغیرہ۔

پرگیہ سنگھ ٹھاکر کی رسائی تو ملٹری کے اعلیٰ آفیسران تک بتائی جارہی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو یہ ایک نہایت خطرناک صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے۔ ۲۹ر ستمبر ۲۰۰۸ء کو مالیگاؤں (ضلع ناگپور) میں ہوئے بم دھماکے جس میں ۱۶ افراد ہلاک ہوگئے تھے، کی تفتیش کے سلسلے میں مہاراشٹر ''دہشت گردی مخالف دستے'' [Anti Terrorist Squad (ATS)] نے جو سنسنی خیز انکشافات کیے وہ چونکا دینے والے ہیں۔ اب تک ATS نے جن گیارہ مشتبہ مجرموں کو گرفتار کیا ہے ان کے نام اس طرح سے ہیں:-

۱۔ **پرگیہ سنگھ ٹھاکر عرف سادھوی پورنہ چیتانندگری (عمر ۳۸ سال)**= یہ ہندو سخت گیر تنظیم ''راشٹریہ جاگرن منچ'' کی صدر، آر۔ ایس۔ ایس کے ایک رکن چندر پال سنگھ ٹھاکر کی بیٹی اور مدھیہ پردیش کی رہنے والی ہے۔ ''اکھل بھارتیہ ودھارتھی پریشد'' کی بھی رکن رہ چکی ہے۔ ۲۰۰۷ء میں ''پریاگ کمبھ''

کے دوران مشہور پجاری سوامی اودھیش آنند گردی سے دیکھشا لے کر سادھو بن گئی۔

۲۔ **لیفٹیننٹ کرنل (Lieutenant Colonel) شری کانت پروہت (عمر ۳۷ سال)** = یہ ملٹری کی ''مہاراشٹر لائٹ انفینٹری'' میں لیفٹیننٹ کرنل اور ایک کمیشنڈ آفیسر ہے۔ گرفتاری سے پہلے پنچمڑھی میں تعینات تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے مجرموں کو RDX مہیا کرایا۔ مالیگاؤں کے علاوہ حیدرآباد کی مکہ مسجد اور ۱۹؍فروری ۲۰۰۷ء کو پانی پت کے قریب ''سمجھوتہ ایکسپریس'' جس میں ۶۸ بے گناہ مسافر شہید اور سینکڑوں زخمی ہو گئے تھے، میں جو دھماکے ہوئے تھے، ان میں بھی اسی کا ہاتھ بتایا جا رہا ہے [پہلے ''سمجھوتہ ایکسپریس'' دھماکے کا الزام صفدر ناگوری پر لگایا گیا تھا اور مکہ مسجد کے سلسلے میں کسی بنگلہ دیشی تنظیم ''حرکت الجہاد اسلامی'' (HUJI) کا نام لیتے ہوئے برق مسلمان نوجوانوں پر ہی گرائی گئی تھی۔] یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ ۱۶ رتا ۱۸؍اکتوبر ۲۰۰۸ء کو اس نے پنچمڑھی میں ایک ٹریننگ کیمپ لگایا جس میں دن میں ''یوگا'' اور ''سادھنا کی'' نیز رات کو بم سازی اور ہتھیار چلانے کی ہندو انتہا پسند نوجوانوں کو مخصوص ٹریننگ دی جاتی تھی۔ اس کیمپ میں جبل پور، بھوپال، کھنڈوا وغیرہ کے تقریباً ۴۹ نوجوانوں نے حصہ لیا لیکن ان میں سے محض ۱۰ کو ہی بم سازی اور ہتھیار چلانے کی خصوصی تربیت دی گئی۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ جبل پور میں تین آرڈیننس فیکٹریاں واقع ہیں۔

۳۔ **امرتانند سرسوتی مہاراج عرف دیانند پانڈے** = ان کو خود ساختہ ''شنکر آچاریہ'' بتایا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ ۱۱؍اکتوبر ۲۰۰۷ء کو خواجہ غریب نوازؒ کی درگاہ شریف اجمیر میں جو بم دھماکہ ہوا تھا اس کا ماسٹر مائنڈ یہی شخص ہے جب کہ پہلے شک مسلمانوں پر ہی کیا جا رہا تھا۔

۴۔ **سمیر کلکرنی (عمر ۳۲ سال)** = سابق فوجی اور ہندو سخت گیر تنظیم ''ابھینو بھارت'' کا سرگرم رکن ہے۔ بھوپال کی ایک پریس میں کام کرتا تھا۔

۵۔ **رمیش اپادھیائے** = پونہ کا رہنے والا ہے اور سابق میجر ہے۔ آرمی کی آرٹیلری رجمینٹ میں رہ چکا ہے۔

۶۔ **شیام بھنور لال ساہو (عمر ۴۲ سال)** = کامرس سے گریجویٹ ہے۔ بھوپال میں موبائل کا کاروباری ہے۔

۷۔ **شیو نرائن سنگھ (عمر ۳۶ سال)** = رام جی کال ساگرے کا بھائی اور اندور سے بی ایس سی گریجویٹ ہے۔ ایک الیکٹریشین اور L.I.C. ایجینٹ بطور کام کرتا ہے۔

۸۔ **راکیش دھاوڑے** = ہتھیار چلانے میں ماہر مانا جاتا ہے۔ اس کے پاس نادر ناجائز ہتھیاروں کا ذخیرہ بھی ہونا بتایا گیا ہے۔

۹۔ **جگدیش مہاترے**

۱۰۔ **اجے راہیلکر (عمر ۳۹ سال)** = ''ابھینو بھارت'' کا خزانچی ہے۔

۱۱۔ **سدھاکر چترویدی**

یہ قابلِ ذکر ہے کہ ۴ر اور ۵ر اپریل ۲۰۰۶ء کی درمیان شب کو ناندیڑ میں لکشمن راج گونڈوار کے گھر پر جو بم بناتے وقت دھماکہ ہوا تھا اور جس میں اس کا بیٹا، نریش اور VHP کا ایک رکن، ہمانشو پانسے مارے گئے تھے، کے سلسلے میں تفتیشی ایجنسیوں کو راج کونڈوار کے گھر سے نقلی داڑھیاں، ٹوپیاں اور اورنگ آباد کی ایک مسجد پر حملے سے متعلق ایک خاکہ وغیرہ ملے تھے۔ اگر اسی وقت غیر جانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس واقعہ کو سنجیدگی سے لیا جاتا تو شاید اس کے بعد جو دھماکے ہوئے، انھیں ٹالا جا سکتا تھا۔ لیکن CBI سے جانے یا انجانے میں چوک ہوگئی۔

اب تک مہاراشٹر ''دہشت گردی مخالف دستہ'' (ATS) مسٹر ہیمنت کرکرے (۱۷) کی سربراہی میں جس حوصلے، دیانتداری، جرأت اور غیر جانبداری سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ثابت کرنے میں لگا رہا اس کے لئے ہر انصاف و امن پسند اور صاف ذہن ہندوستانی، بالخصوص مظلوم فرقہ اس کو سلام کرتا ہے اور ان کی آنے والی نسلیں اپنے محسنوں کو تا قیامت یاد رکھیں گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مسٹر کرکرے کے بعد اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے؛ آیا کہ

مسترکرکرے کے جانشیں ان کے نقشِ قدم پر چلنا پسند کریں گے جو کانوں سے پرے یا پھر صیہونی طاقتوں کے دباؤ میں آکر محض خانہ پوری کریں گے۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسرائیل سے ہمارے سفارتی تعلقات ۱۹۹۲ء سے قائم ہوئے اور تبھی سے تمام دھماکوں کی ذمہ داریاں مسلمانوں کے سر تھوپی جارہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہندوسخت گیر تنظیموں کی اسرائیل کی خفیہ ایجنسی ''موساد'' اور امریکہ کی خفیہ ایجنسی "CIA" سے ضرور کوئی سازباز ہے جو ہمارے ملک کی سالمیت کے لئے ایک خطرہ ہوسکتا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ R.S.S. اوراس کی ذیلی تنظیمیں اب مجرموں کی عدالت میں پیروی پرغور کررہی ہیں کیوں کہ اب ان کی قلعی کھل رہی ہے۔ ویسے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جب بابائے قوم مہاتما گاندھی جی کو قتل کیا گیا تھا تب بھی ان ہی لوگوں نے قاتل کی پیروی کی تھی حتیٰ کہ ان کی خواتین نے اس کے لئے اپنے ہاتھ سے سوئیٹر تک بن کر بھیجے تھے۔ اور جب اس کو پھانسی کی سزا ہوگئی تو انھوں نے گرگٹ کا سارنگ بدلتے ہوئے یہ اپیل کی کہ چونکہ مہاتما گاندھی عدم تشدد کے پیرو تھے اس لئے ان کے قاتل کو پھانسی نہ دی جائے بلکہ سزا عمر قید میں تبدیل کردی جائے۔ جب مبینہ طور سے ایک مسلمان کو بم بلاسٹ کے الزام میں یو۔ پی۔ پولس نے گرفتار کیا تھا تو چند تنگ نظر، ناعاقبت اندیش اور انصاف و پیشے کے دشمن چند وکلاء صاحبان نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اس کی (مسلمان مبینہ مجرم کی) پیروی نہیں کرنے دیں گے۔ اسی طرح وہ عامر قصاب کی پیروی پر بھی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ جب کہ چیف جسٹس کا کہنا ہے کہ کسی بھی شخص کو قانونی مدد سے محروم نہیں کیا جانا چاہئے۔ ان سے پوچھا جائے کہ مالیگاؤں بم دھماکوں کے سلسلے میں Polygraph & Narco Analysis Test کے بعد جو حقیقت ابھر کر سامنے آئی ہے، اس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے!!

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر
لہو پکارے گا آستیں کا

(۱۵) طوفان اور بادو باراں (۱۸) میں اولیاء اللہ کے چراغ گُل نہ ہونے کے بارے میں بہت سی مستند کتب میں حوالے ملتے ہیں۔

منقول ہے کہ جن دنوں شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ [آپ حضرت خواجہ یسویؒ کی اولاد

سے تھے جن کا سلسلہ نسب حضرت محمد حنیفہؒ بن امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ پیر مرشد کی تلاش میں ترکستان سے ماوراء النہر اور پھر ہندوارد ہوئے۔ کچھ عرصے شیخ الاسلام حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کی صحبت میں رہنے کے بعد حضرت مخدوم علاؤالدین علی احمد صابرؒ (م ۱۲۹۱ء) کی خدمت میں پہنچ کر بیعت سے مشرف ہوئے اور خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ اس کے بعد خود کو پردہ میں رکھنے کی خاطر سلطان غیاث الدین بلبن (م ۱۲۸۷ء) کے مصاحبین میں ملازمت اختیار کرلی۔ بعد ازاں پیر مرشد کی وصیت کے مطابق، ان کے وصال کے تین دن بعد اور قریب وصال شیخ شرف الدین بوعلی شاہ قلندرؒ (م ۱۳۲۳ء) صاحبِ ولایت پانی پت، پانی پت پہنچ کر وہاں کے صاحب ولایت ہوئے۔ ۷۱۵ھ (۱۳۱۵ء) میں وصال ہوا اور پانی پت میں مدفون ہوئے۔]

سلطان غیاث الدین بلبن کے یہاں ملازم تھے تو بلبن نے ایک قلعہ پر یورش کی اور ایک عرصے تک اس کا محاصرہ کیے رہا لیکن فتح میسر نہ آئی۔ ایک رات زبردست طوفان آیا جس سے لشکر کے خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں اور شمعیں گل ہوگئیں۔ سلطان کے وضو کے لئے پانی گرم کرنے کی غرض سے ایک خدمت گار (سقہ) آفتابہ لئے پھرا کہ کہیں سے آگ مل جائے کہ ناگاہ اس نے دیکھا کہ ایک خیمے میں روشنی ہو رہی ہے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک بزرگ قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول ہیں اور شمع بدستور جل رہی ہے۔ صبح کو اس نے یہ بھی دیکھا کہ ان بزرگ نے جس تالاب پر وضو فرمایا تھا وہاں کا پانی سخت سردی کے باوجود بھی گرم ہے۔ سقہ نے پوری کیفیت سلطان سے عرض کی۔ اگلے دن سلطان نے خود مشاہدہ کیا اور واقعہ صحیح پایا۔ تب اس نے ان بزرگ کے خیمے میں جاکر عرض کیا کہ زہے قسمت کہ آپ جیسے بزرگ میرے لشکر میں موجود ہیں لیکن قلعہ فتح نہیں ہو پارہا ہے۔ انھوں نے ہر چند سلطان کو ٹالنا چاہا لیکن جب سلطان نہ مانا تو انھوں نے فرمایا کہ اسی وقت قلعہ پر یلغار کرو، اس بار ان شا اللہ فتح ہوجائے گا اور پھر وہ بزرگ خود سجدے میں گر گئے۔ قلعہ پر یلغار کی گئی اور وہ حکمِ ربّی سے فتح ہوگیا۔ وہ بزرگ حضرت شیخ شمس الدین ترک پانی پتی ہی تھے۔ [''تذکرہ اولیائے پاک وہند'' ص ۱۷۴]

ایک اور واقعہ منقول ہے۔ مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے لئے چتوڑ کا قلعہ فتح کرنا

دردسر بنا ہوا تھا۔ اس کے فتح کرنے میں جب بادشاہ ناکام ہو گیا تو اس نے نجومیوں اور ارا کین سلطنت سے مشورہ کیا۔ بادشاہ کو بتایا گیا کہ اوچ میں ایک بزرگ رہتے ہیں اگر وہ دعا فرما دیں تو یہ قلعہ فتح ہو سکتا ہے۔ بادشاہ نے فوراً ایک وفد ان بزرگ، حضرت میراں محمد شاہ موج دریا بخاریؒ [آپ سید جلال الدین سرخ بخاریؒ کی اولاد سے تھے۔ ۱۰۱۳ھ (۱۶۰۴ء) میں وصال ہوا۔ مزار شریف لاہور میں واقع ہے۔ تفصیل ع ۲۲۴ اور احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' کی جلد سوم'' ''منبع الاسرار'' میں ملاحظہ فرمائیں۔] کی خدمت میں روانہ کیا۔ جب وفد نے اوچ پہنچ کر بادشاہ کا پیغام آپ تک پہنچایا تو آپ نے فرمایا کہ آپ سب لوگ واپس جائیں اور جو سانڈنی بادشاہ نے ہمارے لئے بھیجی ہے اسے بھی واپس لے جائیں ہم از خود چتوڑ کے محاذ پر پہنچ جائیں گے، اور یہ بھی فرمایا کہ ہماری آمد کی شب اللہ کے حکم سے سخت طوفان آئے گا جس سے خیمے اور قناتیں گر جائیں گی نیز چراغ گل ہو جائیں گے محض ایک ہی چراغ روشن رہے گا جو ہمارے خیمے کا ہوگا۔ چند دنوں بعد ایک شب کو حضرت موج دریاؒ کے فرمان کے عین مطابق سخت طوفان آیا جس سے لشکر کے خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں اور چراغ گل ہو گئے۔ جب بادشاہ کے حکم بموجب مصاحبین نے تلاش کی تو ایک خیمے میں چراغ روشن پایا۔ اکبر فوراً برہنہ پا اس سمت چل پڑا۔ اس نے وہاں جا کر دیکھا کہ ایک نورانی صورت بزرگ محو عبادت ہیں۔ جب وہ بزرگ (حضرت موج دریاؒ) عبادت سے فارغ ہوئے تو اکبر اجازت لے کر خیمے کے اندر داخل ہوا اور عرض حال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ انشاءاللہ کل قلعہ فتح ہو جائے گا۔ دوسرے دن حضرت موج دریا بخاریؒ قلعہ کے پاس تشریف لے گئے اور تین بار بآواز بلند اسم ذات ''اللہ'' اپنی زبانِ مبارک سے پکارا، اس کے بعد اکبر نے جیسے ہی قلعہ پر یلغار کی کہ وہ ناقابل تسخیر قلعہ چند گھنٹوں میں اللہ کے فضل و کرم سے سر ہو گیا۔

(۱۶) ۱۹۹۵ء میں احقر مراد آباد میں تعینات تھا۔ دورانِ الیکشن اس کی قصبہ سنبھل میں ڈیوٹی لگی۔ وہ کوتوالی میں تنہا بیٹھا ہوا تھا کہ وہیں ایک پولس افسر جو غالباً Dy. S.P تھے، بھی آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں کوتوالی انچارج بھی وہاں آ گئے۔ احقر دونوں کے لئے اجنبی تھا لیکن پھر بھی احقر کی موجودگی کا نوٹس لئے بغیر Dy. S.P موصوف نے کوتوال صاحب سے

سوال کیا کہ قصبے میں ہندو مسلم تناسب کیا ہے؟۔کوتوال صاحب نے جواب دیا "۳۰۔۷۰" کا۔اس پر .Dy. S.P صاحب نے قدرِ متعجب ہو کر دوسرا سوال کیا کہ یہ قصبہ تو بہت Sensitive ہے، پھر کس طرح ہندو یہاں محفوظ رہتے ہوں گے؟۔کوتوال صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ ایسے موقعوں پر ہمیں ہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔اس جواب پر .Sy. S.P صاحب نے قدرِ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ایک واقعہ کوتوال صاحب کو سنایا۔بقول ان کے، جب وہ خورجہ میں کوتوال تھے تو وہاں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔جب مسلمان بلوائیوں پر حاوی ہونے لگے تو انھوں نے خود سرکاری اسلحہ سے ایک شخص (اس شخص کی نشاندہی کرتے ہوئے) کو گولی مار کر بلاک کر دیا تھا جس کا آج تک جج کسی کو یہ پتہ نہ چل سکا کہ کس نے مارا تھا۔

اسی دن احقر کی ملاقات الیکشن "آبزرور" (Observor) سے بھی ہوئی۔وہ چند افسران کے ساتھ ایک کمرہ میں بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔دورانِ گفتگو خاندانی منصوبہ بندی کا بھی ذکر چھڑ گیا۔"آبزرور" موصوف نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے زہر اگلا کہ ایک مخصوص اقلیتی فرقے (بہت بھدے الفاظ میں فرقے کا نام لے کر) کے لوگ اس منصوبہ بندی پر عمل نہیں کر رہے ہیں جس کی وجہ سے آبادی کا توازن بگڑتا جا رہا ہے، اور پھر خود ہی اس So called مسئلہ کا حل پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اس اقلیتی فرقے کے افراد کو حقِ رائے دہی سے محروم کر دینا چاہئے۔(یہی شور .R S.S بھی مچاتی ہے۔)

بابری مسجد کی شہادت کے بعد ایک مرتبہ جب میں دیوریا (جہاں تعینات تھا) سے علیگڑھ آ رہا تھا تو ٹرین میں حسبِ معمول مسافروں میں باہمی گفتگو کے دوران ایک نیم فوجی تنظیم کے ایک جوان نے یہ بتایا کہ اسکی یونٹ آجکل اجودھیا میں تعینات ہے اور وہ چھٹی پر اپنے گھر جا رہا ہے۔ اجودھیا کا نام سن کر کچھ مسافروں نے اس سے ۶ ردسمبر کی روداد سننی چاہی۔اس نے پورا واقعہ سناتے ہوئے بڑے فخریہ انداز میں یہ انکشاف بھی کر ڈالا کہ اس نے بھی اس دن " کارسیوا" میں حصہ لیا تھا۔

مرکزی یا صوبائی نیم فوجی تنظیموں یا پولس کی سطح پر کی جانے والی جانبدارانہ زیادتیوں یا ناانصافیوں کا سدِ باب اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے مذکورہ فورسیز میں نمائندگی دنیے جانے ہی سے کیا جاسکتا ہے لیکن

مصیبت یہ ھے کہ ماں، جسکی ممتا مثالی مانی گئی ھے، بھی اپنے اس دور میں شیر خوار بچوں کو برغبت و خوشی اپنا دودھ نہیں پلاتی۔

(۱۷) مسٹر ہیمنت کرکرے = وہ ۱۲؍دسمبر ۱۹۵۴ء کو ناگپور میں پیدا ہوئے اور ۱۹۸۲ء بیچ کے I.P.S. آفیسر تھے۔ I.P.S. جوائن کرنے سے پہلے وہ ایک اشیائے صرف بنانے والی کمپنی [Consumer Goods' Manufacturing Co.] میں بھی ملازمت اختیار کر چکے تھے۔ [انھوں نے Management Engineering سے گریجویشن کیا تھ۔] اس کے علاوہ انھوں نے Personality Development کا کورس بھی کیا تھا جہاں ان کی ملاقات کویتا (Kawita) جی سے ہوئی اور پھر یہ ملاقات شادی میں تبدیل ہوگئی۔ کویتا جی سے آپ کے تین بچے ہیں، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ بڑی لڑکی کی شادی ہو چکی ہے۔ لڑکا ابھی چھوٹا ہے۔ وہ بارہ سال تک ہندوستانی خفیہ ایجنسی "RAW" ["Research & Analysis Wing"] میں بھی بحسن خوبی خدمات انجام دے چکے تھے اور اب گذشتہ ایک سال سے مہاراشٹرا ''دہشت گردی مخالف تنظیم'' (ATS) کے سربراہ تھے۔ وہ ایک صاف ذہن، انصاف پسند، بااصول اور جری ہونے کے ساتھ ساتھ دہشت گردوں [بنا امتیاز مذہب وملت] کے جانی دشمن اور انسانیت کے دوست تھے۔ ۸؍ستمبر ۲۰۰۶ء کو مالیگاؤں میں ہوئے بم دھماکوں کے سلسلے میں وہ جس ایمانداری سے تفتیش کر رہے تھے اس سے بہت سے سفید پوش دہشت گرد بے نقاب ہونے والے تھے اور ملک میں دیگر مقامات پر بھی ہوئے بم دھماکوں پر سے پردہ اٹھنے والا تھا۔ اس سے دہشت گردوں اور ان کے آقاؤں میں ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ مستقل انھیں قتل اور گھر کو اڑا دینے کی دھمکیاں مل رہی تھیں لیکن وہ ثابت قدم رہے۔ بالآخر ۲۶؍نومبر ۲۰۰۸ء کو بظاہر تاج ہوٹل، اوبرائے ہوٹل اور نریمن ہاؤس پر ہوئے دہشت گردانہ حملوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جاں بحق ہوگئے۔ کہتے ہیں کہ کچھ سفید پوش دہشت گردوں کی قلعی کھولنے کے بعد آپ کا ہندوستان چھوڑ کر کسی دیگر ملک کو ہجرت کر جانے کا ارادہ تھا [آپ ممبئی کے دادر علاقے میں رہتے تھے۔] یہ قابلِ ذکر ہے کہ اب تک ہر دھماکے اور دہشت گردی کی تمام تر ذمہ داریاں مسلمانوں پر ہی ڈالی جاتی رہی تھیں لیکن یہ مسٹر کرکرے ہی تھے جنھوں نے یہ انکشاف کر کے ہندوفسطائی طاقتوں کی نیندیں حرام کردی

تھیں کہ ان سازشوں میں کچھ ہندو دھرم گرو، سادھوسنیاسی اور فوج کے افسر ملوث ہیں۔ جب گجرات کے وزیراعلیٰ نریندر مودی جی مذکورہ سانحہ کے بعد ایک کروڑ کی قطیر رقم آپ کی بیوہ کو دینے پہنچے [غالباً کسی اندیشے کے سبب کیوں کہ ہمدردی تو ہو نہیں سکتی جیسا کہ مودی جی اور ان کے ہم پیالہ وہم نوالہ چند دنوں پہلے تک مسٹر کرکرے کو ہدف تنقید بنائے ہوئے تھے۔] تو انھوں نے ملنے سے بھی صاف انکار کردیا۔ اس سے لگتا ہے کہ ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔

(۱۸) جب ناصرالدین قباچہ [م۶۲۲ھ(۱۲۲۵ء)] کے دور اقتدار میں تاتاریوں نے سندھ پر حملہ کر کے ملتان کا محاصرہ کرلیا تو قباچہ آبدیدہ ہوکر اپنے گلے میں تلوار لٹکائے شیخ الاسلام خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانی [م۶۶۶ھ(۱۲۶۷ء)] کی خدمت میں مدد کی درخواست کے ساتھ حاضر ہوا۔ ان دنوں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ [م۶۳۳ھ(۱۲۳۵ء)] بھی حضرت شیخ الاسلام کے یہاں تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام نے حضرت خواجہ کی جانب معنی خیز نگاہوں سے دیکھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہماری کیا مجال جو کوئی قدم اٹھائیں۔ حضرت خواجہ نے فوراً قباچہ کے ہمراہ قلعہ کی فصیل پر جاکر تاتاری لشکر کا معائنہ کیا اور پھر برجی پر متعین ایک سپاہی کے ترکش سے تیر نکال کر قباچہ کو دیتے ہوئے فرمایا کہ لو، اسے چلّے میں رکھ کر پوری قوت سے دشمن کی طرف چھوڑ دو۔ قباچہ یہ سن کر خوفزدہ ہوا کیوں کہ اس کے معنی جنگ کے شعلے بھڑکانا تھا۔ جب حضرت خواجہ نے قباچہ کو تذبذب کے عالم میں دیکھا تو فرمایا کہ اگر مدد چاہتے ہو تو جیسا ہم کہیں اس پر عمل کرو۔ قباچہ نے اس بار کوئی کوتاہی نہیں کی اور پوری قوت سے وہ تیر تاتاریوں کے لشکر میں پھینکا۔ تیر ایک منجنیق پر لگا جس سے وہ چکنا چور ہوگئی۔ آس پاس موجود تاتاری خوف وہراس سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے لیکن ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ابھی وہ سکتے کے عالم میں ہی تھے کہ مغرب کی سمت سے ایک زبردست طوفان اٹھا جس نے تاتاریوں کو اپنے نرغے میں لے لیا۔ طوفان اس قدر شدید تھا کہ منجنیق کہیں کی کہیں جا پہنچیں، خیمے اکھڑ گئے اور ہر طرف افراتفری کا عالم ہوگیا۔ پھر موسلا دھار بارش بھی شروع ہوگئی۔ الغرض تاتاری بے قابو ہوکر آپس میں ہی دست وگریباں ہونے لگے؛ اور پھر بالآخر انھیں پسپائی پر مجبور ہونا پڑا۔

[۲] تاریخ کے جھرونکوں سے

(۱) چند اہم تاریخی واقعات

۶۸/ ۶۷/ ۳۶۶ھ (۸/ ۷/ ۹۷۷ء) میں والئ **لاھور**، راجہ جے پال اول [برہمن تھا جس کے اجداد کابل کے حکمراں رہے لیکن وہاں سے نکال دیئے جانے کے بعد سے **لاھور** کو دارالخلافہ بنا کر حکومت کرنے لگے تھے۔] نے محاذِ جنگ سے **لاھور** آکر امیر سبکتگین کے ساتھ وعدہ شکنی کی جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان خوفناک جنگ ہوئی۔ نتیجتاً جے پال کی شکست کے بعد ہندوستان کے ایک بڑے علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔(۱)

۳۶۸ھ (۹۷۸ء) میں جے پال اوّل کے شکست کے بعد خودسوزی کر لینے پر اس کا بیٹا، آنند پال **لاھور** میں تخت نشیں ہوا۔

۴۰۴ھ (۱۰۱۳ء) میں جے پال ثانی اپنے باپ، آنند پال کی جگہ **لاھور** میں تخت نشیں ہوا۔

۴۱۲ھ (۱۰۲۱ء) میں سلطان محمود غزنوی نے **لاھور** پر حملہ کیا اور اسے فتح کر لینے کے بعد خود نے تو شہر میں قیام کیا اور اس کے لشکر نے دل کھول کر شہر کو لوٹا۔ (۲) راجہ، جے پال ثانی کے اجمیر بھاگ جانے پر محمود نے **لاھور** میں اپنا ایک مسلمان صوبے دار مقرر کردیا اور اس طرح سے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑ گئی۔

۴۱۴ھ (۱۰۲۳ء) میں محمود نے ہندوستان پر گیارہواں حملہ کر کے راجائے کالنجر کو شکست

دی اور **لاہور** کو سلطنتِ غزنی میں ملالیا۔

۴۲۹ھ ۹ر رمضان (۱۰۳۷ء ۱۶ر جون) میں طغرل بیگ سلجوقی کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد سلطان مسعود اوّل بن سلطان محمود غزنوی **لاہور** چلا آیا اور اس کو اپنا پائے تخت بنانے کا ارادہ کیا لیکن اس کی فوج نے اس کو قید کرلیا اور اس کے بھائی، محمد کو تخت پر بٹھا دیا۔ [۴۳۳ھ (۱۰۴۱ء) میں اس کو احمد بن محمد نے قتل کردیا۔]

۴۳۵ھ (۱۰۴۳ء) میں تین بڑے بڑے ایسے ہندو راجاؤں نے جو ماضی میں مسلمان حکمرانوں کے خوف سے جنگل میں جا چھپے تھے، مسلمان حکمرانوں کی باہمی چپقلش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے **لاہور** پر حملہ کرکے اس کا محاصرہ کرلیا۔ (۳)

۴۹۲ھ (۱۰۹۸ء) سے ۵۰۸ھ (۱۱۱۴ء) تک (۱۶ سال تک) سلطان مسعود ثالث (سلطان ابراہیم کا بیٹا اور سلطان سنجر کا داماد) نے غزنی اور **لاہور** پر حکومت کی۔

سلطان بہرام شاہ بن مسعود ثالث [شجرہ ص ۱۶۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔] کے انتقال کے بعد جب اس کا لڑکا، معز الدولہ خسرو شاہ تخت نشین ہوا تو اس زمانے میں علاؤ الدین غوری [المشہور بہ جہاں سوز] کے غزنی پر حملے کا غلغلہ مچا ہوا تھا۔ چنانچہ خسرو شاہ نے غزنی میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ معہ اہل و عیال **لاہور** آکر مقیم ہوگیا۔ اس طرح **لاہور سلطنتِ غزنی کا دارالخلافہ بن گیا۔**

۵۵۵ھ (۱۱۶۰ء) میں ۸ سال حکومت کرنے کے بعد معز الدولہ سلطان خسرو شاہ کا **لاہور** میں انتقال ہوگیا۔

سلطان خسرو شاہ کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا، تاج الدولہ خسرو ملک **لاہور** میں تخت نشیں ہوا۔

۵۷۶ھ (۱۱۸۰ء) میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے پہلی بار ہندوستان پر حملہ کیا۔

اس نے سندھ اور ملتان کو فتح کر لینے کے بعد **لاہور** کو بھی فتح کر لیا لیکن بعد میں سلطان خسرو ملک کے نو عمر شہزادے، ملک شاہ کو بطور یرغمال لے کر واپس غورستان لوٹ گیا۔ (۴) [ص 215 بھی ملاحظہ فرمائیں]

۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے دوسری بار **لاہور** پر حملہ کیا اور شہر نیز اس کے اطراف کو خوب جی کھول کر لوٹا۔ (۵)

۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں شہاب الدین محمد غوری نے تیسری بار **لاہور** پر حملہ کیا لیکن اس بار معرکہ آرائی کی بجائے اس نے ایک شاطرانہ چال (۶) چلی اور **لاہور** پر قابض ہو گیا۔ اس بار **لاہور** کے سکوت کے بعد **غزنی کی عظیم الشان حکومت امین الملّت یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی کے خاندان سے نکل کر خاندان غوری کے ہاتھ آگئی۔**

۲۷ سال حکومت کرنے کے بعد سلطان خسرو ملک کا **لاہور** میں انتقال ہو گیا۔

۶۰۲ھ (۱۲۰۵ء) ۱۸ ذیقعدہ بروز شنبہ قطب الدین ایبک **لاہور** میں تخت نشین ہوا۔ (۷)

۶۰۳ھ (۱۲۰۶ء) میں قطب الدین ایبک نے تاج الدین یلدوز (۸) پر حملہ کر کے دوبارہ **لاہور** پر اپنا اقتدار بحال کر لیا۔

۶۰۷ھ (۱۲۱۰ء) میں چوگان (پولو) کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر قطب الدین کا **لاہور** میں انتقال ہو گیا۔ اس کا مزار انارکلی بازار کے عقب میں واقع ہے۔

آرام شاہ بن قطب الدین ایبک **لاہور** میں تخت نشیں ہوا۔

۶۱۱ھ (۱۲۱۴ء) میں تاج الدین یلدوز خوازرم شاہیوں سے بھاگ کر ہندوستان آیا اور اس نے **لاہور** پر قبضہ کر لیا۔ التمش نے تراوڑی (ترائن) کے میدان میں اس کو

شکست دے کر بدایوں میں قید کر دیا جہاں وہ مر گیا۔

۶۱۴ھ (۱۲۱۷ء) میں شمس الدین التمش اور ناصر الدین قباچہ کے درمیان **لاہور** کو لے کر نوبت معرکہ آرائی تک پہنچی۔ دونوں ہم زلف کے درمیان دریائے چناب کے کنارے جنگ ہوئی۔ قباچہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور **لاہور** پر التمش کا قبضہ ہو گیا۔

۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) میں جلال الدین خوارزمی نے چنگیز خاں کے ڈر سے بھاگ کر پنجاب میں پناہ لی اور **لاہور** میں قیام کرنے کے لئے سلطان التمش سے اجازت چاہی جس نے یہ کہہ کر معذرت چاہ لی کہ یہاں کی آب و ہوا اس (جلال الدین) کو موافق نہیں آئے گی۔

۶۳۹ھ (۱۲۴۱ء) [سلطان معز الدین بہرام شاہ کے عہدِ حکومت میں] میں ۷ار جمادی الآخر کو چنگیز خانی مغلوں نے **لاہور** پر حملہ کر کے اسے دل کھول کر لوٹا اور بہت سے اہلیانِ شہر کو قید کر کے لے گئے۔ (۹)

۶۸۳ھ (۱۲۸۴ء) میں چنگیزی مغلوں نے تیمور چنگیزی کی قیادت میں بیس ہزار سواروں کی جمعیت سے پنجاب پر حملہ کیا اور دیپالپور و **لاہور** کے تمام دیہاتوں کو تباہ کر کے **لاہور** کا محاصرہ کر لیا۔ صوبیدار **لاہور** نے شہزادہ سلطان محمد یا محمد خاں سلطان (المعروف بہ خانِ ملتان) کو لکھا۔ محمد نے **لاہور** پر چڑھائی کر دی جس سے مغلوں نے راہِ فرار اختیار کی۔ محمد نے ان کا پیچھا کیا لیکن ملتان کے قریب ۳۰ر ذی الحجہ ۶۸۳ھ (۱۲۸۴ء ۹ر مارچ) بروز جمعہ بدقسمتی سے شہزادے کے سینے میں ایک تیر لگنے سے وہ شہید ہو گیا۔ اس کے ساتھ دیگر تمیں بہادر اور تجربہ کار جوان بھی شہید ہوئے۔ اس معرکہ میں امیر خسروؒ بھی قید کر لئے گئے تھے جو بعد میں رِہا ہو پائے۔ اسی وقت سے ''خانِ ملتان'' کو ''خانِ شہید'' کے نام

سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ بلبن کا سب سے بڑا لڑکا، ولی عہدِ سلطنت، بہادر اور نیک بخت شہزادہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی یاد میں بلبن راتوں کو اٹھ اٹھ کر اکثر رویا کرتا تھا۔

۶۹۸ھ (۱۲۹۸ء) میں ماوراء النہر سے ایک لاکھ مغل داؤد خاں کی سربراہی میں ہند پر حملہ آور ہوئے۔ دہلی سے الغ خاں اور ظفر خاں کو مقابلے کے لئے روانہ کیا گیا۔ **لاھور** کے قریب زبردست لڑائی ہوئی۔ بارہ ہزار مغل مارے گئے، بہت سے گرفتار ہوئے اور باقی ماندہ بھاگ گئے۔

۳۰/۲۹ ۷ھ (۲۹/۱۳۲۸ء) میں منگول سردار، ترمشیریں خاں نے ہندوستان پر حملہ کر کے ملتان اور **لاھور** سے دلّی تک کا پورا علاقہ روند ڈالا لیکن بعد میں واپس لوٹ گیا۔

۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء) میں ہندوستان سے لوٹتے وقت امیر تیمور نے پنجاب میں سیکھا گکھر جس نے سلطان غیاث الدین کے عہدِ حکومت سے پنجاب میں بغاوت کر رکھی تھی، کو قتل کر کے **لاھور** و دیپالپور کی حکومت خضر خاں کو سپرد کر دی اور خود مارچ میں دریائے سندھ کے اس پار چلا گیا۔

۸۲۴ھ (۱۴۲۱ء) سے ۸۳۷ھ (۱۴۳۳ء) کے عرصے میں [معزالدین ابوالفتح مبارک شاہ بن خضر خاں] پنجاب میں سیکھا گکھر کے بھائی، جسرت گکھر نے فتنہ برپا کر کے **لاھور** اور دیپالپور کو لوٹ لیا اور ان پر قابض ہو گیا۔

۸۳۳ھ (۱۴۲۹ء) میں والی کابل، امیر شیخ علی مغل نے شاہ رخ بن امیر تیمور کے حکم سے ہندوستان پر حملہ کیا مگر عماد الملک، صوبہ دار ملتان نے اسے شکست دے کر بھگا دیا، لیکن شیخ علی نے **لاھور** پر قبضہ کر لیا اور دو ہزار محافظ **لاھور** میں چھوڑ کر خود کابل واپس لوٹ گیا۔ سلطان مبارک شاہ نے شمس الملک کو **لاھور** روانہ کیا جس نے مغلوں سے **لاھور** کا قبضہ واپس لے لیا۔

۹۳۱ھ (۱۵۲۴ء) میں بابر نے ہندوستان پر حملہ کر کے **لاہور** پر قبضہ کرلیا۔ (۱۰)

۹۳۷ھ (۱۵۳۰ء) میں جب ہمایوں تخت نشیں ہوا تو اس نے پنجاب کی حکومت اپنے بھائی کامران کو دے دی۔ لنگر خاں بلوچ جو حسین ثانی لنگاہ کا مدار المحام تھا، کامران سے **لاہور** میں آکر ملا۔ کامران نے اسے **لاہور** کے قریب ایک علاقہ دے کر ملتان کو اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔

۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں ہمایوں نے قنوج کے قریب شیر شاہ سوری کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور دلی چھوڑ کر اپنے بھائی کامران کے پاس **لاہور** چلا گیا۔ وہاں وہ تین ماہ تک رہا لیکن جب خواص خاں اس کا پیچھا کرتا ہوا اکتوبر میں وہاں پہنچا تو وہ بھی وہاں سے براستہ سندھ کابل چلا گیا۔ اس کے بعد شیر شاہ سوری بھی **لاہور** پہنچا۔

۹۶۲ھ (۱۵۵۵ء) ۲۴ رفروری کو ہمایوں نے دوبارہ **لاہور** پر قبضہ کرلیا۔ [اُن دنوں سکندر شاہ سور (اصل نام احمد خاں سور تھا جو مبارز خاں الملقب بہ محمد عادل شاہ سور کا بہنوئی اور شیر شاہ سوری کا بھتیج داماد تھا۔) اپنے سالے، محمد عادل شاہ سور کو شکست دے کر حکومت کرتا تھا۔ اس کی طرف سے تاتار خاں **لاہور** کا نگراں تھا۔ ہمایوں کی آمد کی خبر سن کر تاتار خاں دلی بھاگ گیا جس سے بنا کسی مزاحمت کے ہمایوں نے **لاہور** پر قبضہ کرلیا۔]

۹۷۴ھ (۱۵۶۶ء) میں حکیم مرزا نے یلغار کر کے **لاہور** پر قبضہ کرلیا لیکن جب ۱۴ رجمادی الاوّل کو اکبر **لاہور** کے لئے روانہ ہوا تو وہ لاہور سے فرار ہو کر کابل چلا گیا۔

۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) ۱۱ رمحرم الحرام کو مرزا محمد حکیم نے دوبارہ **لاہور** پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کرلیا۔ سعید خاں، راجہ بھگونت داس اور راجہ مان سنگھ قلعہ بند ہو گئے۔ مرزا نے جب پھر سے اکبر کی آمد کی خبر سنی تو وہ پھر فرار ہو کر کابل بھاگ گیا۔

۹۹۵ھ (۱۵۸۶ء) ماہ اگست میں جہانگیر کا سب سے بڑا لڑکا، خسرو [ماں کا خطاب شاہ بیگم تھا جو راجہ مان سنگھ پسر راجہ بھگوان داس کی دختر تھی۔] **لاهور** میں پیدا ہوا۔

۹۹۹ھ ۲۳ ربیع الاوّل [۵ رجنوری ۱۵۹۰ء] نصف شب جمعرات کو رانی جگت گوسائیں بنت راجہ اودے سنگھ کے بطن سے شہزادہ خرم (شاہجہاں) **لاهور** میں پیدا ہوا۔

۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) میں جہانگیر کی ملکہ اور زین خاں کوکہ کی ایک رشتہ دار، صاحب جمال کا **لاهور** میں انتقال ہوا۔ سلطان پرویز اسی کے بطن سے تھا۔

۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں شہزادہ خسرو فرار ہو کر بغاوت پر کمر بستہ ہوا۔ شیخ فرید مرتضیٰ خاں کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا گیا۔ **لاهور** کے قریب دونوں کے درمیان جھڑپ ہوئی اور شہزادہ گرفتار کر لیا گیا۔ جہانگیر نے اس کے ۷۰۰ آدمیوں کی کھال کھنچوا کر **لاهور** کے باہر کھڑا کروا دیا اور خسرو کو بھی ہاتھی پر سوار کر کے انھیں دیکھنے کے لئے بھیجا اور نقیب کو حکم دیا کہ موافق دستور کے ہر ایک مصاحب کا نام لے کر نگاہ روبرو پکارتا جائے۔ خسرو نے اس غم میں تین دن تک کچھ نہیں کھایا اور زار و قطار روتا رہا۔ ایک دوسری روایت کی رو سے شہزادہ اور اس کا رفیقِ کار، عبدالرحیم [ایک جہانگیری امیر] پکڑ کر **لاهور** میں جہانگیر کے حضور میں پیش کئے گئے۔ عبدالرحیم کو گدھے کی کھال میں سی کر اس پر پانی ٹپکایا گیا۔ چوبیس گھنٹے کے بعد عفو قصور ہوا۔

۱۰۳۷ھ (۲۸ راکتوبر ۱۶۲۸ء) ۲۷ رصفر المظفر کو کشمیر سے **لاهور** آتے ہوئے دمہ کی بیماری سے شہنشاہ نورالدین جہانگیر کا انتقال ہوگیا۔ **لاهور** میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ جہانگیر کے انتقال کے فوراً بعد ہی شہزادہ شہریار نے **لاهور** میں بادشاہت کا اعلان کر دیا اور **لاهور** کے شاہی خزانے کو امراء و سپاہیوں میں تقسیم کر کے انھیں اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی۔ آصف خاں نے **لاهور** پر حملہ کر کے

شہر یار اور داور بخش عرف بلاقی سلطان خسرو کو قید کر کے قتل کر دیا۔ شہزادہ شہر یار اپنے جسم کی خوبصورتی اور دماغی کمزوری کے لئے مشہور تھا۔

۲۲/ جمادی الاوّل کو شہاب الدین محمد شاہجہاں (خرم) **لاھور** میں تخت نشین ہوا۔ (۱۱)

۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں ملکہ نور جہاں کا **لاھور** میں ۷۲ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اسی کے مقبرہ میں ایک دوسری قبر اس کی بیٹی، لاڈلی بیگم کی ہے۔

۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں جب شاہجہاں بیمار ہوا اور امید زیست کی منقطع ہو گئی تو شجاع بنگالہ سے، مراد گجرات سے اور اورنگ زیب دکن سے اپنی اپنی فوجیں آراستہ کر کے دارالسلطنت دلّی پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔ شجاع تو داراشکوہ کے بیٹے، سلیمان شکوہ سے بنارس کے قریب شکست کھا کر بنگالے کو لوٹ گیا، لیکن مراد اور اورنگ زیب متفق ہو کر اور داراشکوہ کے بھیجے ہوئے راجا جسونت سنگھ کو اوجین کے قریب شکست دے کر آگرہ کے قریب تقریباً ۲۵ کلومیٹر تک آ داخل ہوئے۔ داراشکوہ ایک لاکھ سوار لے کر مقابلے کو پہنچا لیکن شکست کھائی اور **لاھور** کی طرف بھاگ گیا۔

۱۰۷۰ھ (۱۶۵۹ء) اپریل میں جب داراشکوہ (م ۱۶۵۹ء ۳۰/ اگست) جے سنگھ اور بہادر خاں کے زیر کمان عالمگیری لشکر سے بھی اجمیر کے قریب ہار گیا تو وہ دادر کے افغان امیر، جیون خاں سے مدد کے لئے بھاگ نکلا۔ راستے میں ہی (مئی میں) اس کی اہلیہ، نادرہ بیگم جو جہانگیر کے فرزند، پرویز کی بیٹی تھی [وہ ۲۳/ جنوری ۱۶۳۴ء کو پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بطن سے دو شہزادے، سلیمان شکوہ اور سپہر شکوہ پیدا ہوئے تھے۔] کا انتقال ہو گیا۔ **لاھور** میں میاں میرؒ کی درگاہ میں اس کا مقبرہ واقع ہے۔

۱۱۱۴ھ (۱۷۰۲ء) میں شہزادی زیب النساء بیگم بنت اورنگ زیب کا انتقال **لاھور** میں ہوا۔ وہ ایک عالمہ خاتون اور قرآن شریف کی حافظہ تھی۔ اس کو عربی اور فارسی پر پورا عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ اس کو خطاطی کا بہت شوق تھا۔ اس کا اپنا ایک عمدہ کتب خانہ بھی تھا۔ [وہ ۱۰ر شوال المکرم ۱۰۴۸ھ (۵ر فروری ۱۶۳۹ء) کو پیدا ہوئی تھی۔]

۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) غرہ ذی الحجہ کو محمد معظم الملقب بہ شاہ عالم بہادر شاہ (اوّل) **لاھور** میں تخت نشین ہوا۔

۱۱۲۳ھ (۱۷۱۱ء) میں بہادر شاہ نے خطبۂ جمعہ سے متعلق جو فرمان جاری کیا تھا اس کی مخالفت میں **لاھور** میں زبردست احتجاج و ہنگامہ ہوا۔ (کہتے ہیں کہ یہ ہنگامہ شہزادہ عظیم الشان کے اشارے پر ہوا تھا۔) ہنگامے کی وجہ سے بادشاہ کو اپنا فرمان واپس لینے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ [تفصیل احقر کی کتاب ''سید عبدالرحمن بن فضل اللہ'' میں ملاحظہ فرمائیں۔]

۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) ۲۱ر محرم الحرام کو ۷۱ سال کی عمر میں بہادر شاہ کا **لاھور** میں انتقال ہوگیا۔

۱۱۲۵ء (۱۷۱۳ء) میں معزالدین جہاندار شاہ (بن شاہ عالم اوّل) اور فرخ سیر (بن عظیم الشان) کے درمیان آگرہ کے قریب جنگ ہوئی جس میں جہاندار شاہ ہزیمت اٹھانے کے بعد فرار ہوگیا لیکن بعد میں پکڑ کر قتل کردیا گیا اور اس کی معشوقہ لعل کنور المخاطب بہ امتیاز محل جو ایک رقاصہ تھی اور جس کی وجہ سے اس کے رشتہ دار دربار شاہی میں رسائی پاگئے تھے نیز جس کے بغیر جہاندار شاہ ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا، فرار ہوکر **لاھور** چلی گئی تھی۔

تخت نشینی کو لے کر ۲۷ر مارچ کو شہزادہ جہان شاہ اور شہزادہ جہاندار شاہ (محمد

معزالدین) کے درمیان **لاهور** میں میاں میرؒ کے مزار شریف کے نزدیک معرکہ آرائی ہوئی۔ اس لڑائی میں جہان شاہ اور اس کا فرزند، فرخندہ اختر مارے گئے۔

۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں فارس کے حکمران نادر شاہ (۱۲) نے ہندوستان پر حملہ کر کے **لاهور** پر قبضہ کرلیا۔ (۱۳)

۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ء) میں بندہ، جو گرو گوبند سنگھ کا جانشین تھا اور جس نے بہادر شاہ کے عہد میں اس وقت جب بادشاہ اپنے بھائی، کام بخش کا دکن میں مقابلہ کر رہا تھا، نے صوبہ **لاهور** میں سخت غارتگری پھیلاتے ہوئے مسلمانوں پر نہایت بیدردی سے مظالم کیے تھے، کو دہلی میں ہلاک کر دیا گیا۔

۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء) میں احمد شاہ ابدالی (۱۴) نے دوسری بار پنجاب پر حملہ کر کے **لاهور** کے صوبیدار معین الملک [بن اعتماد الدولہ قمر الدین خاں وزیر جو سرہند کے مقام پر احمد شاہ ابدالی سے ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تھا۔] کو شکست دے دی۔ معین الملک نے مغل بادشاہ، احمد شاہ کے مشورے اور حکم پر **لاهور** کے چار محال (سیالکوٹ، ایمان آباد، پسرور اور اورنگ آباد) ابدالی کو دے دیئے۔ ابدالی مطمئن ہو کر واپس لوٹ گیا۔

۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱ء) میں احمد شاہ ابدالی نے معین الملک کے اپنے وعدے سے پھر جانے پر تیسری بار پھر سے پنجاب پر حملہ کر دیا۔ معین الملک کو شکست ہوئی۔ اس بار معین الملک نے مغل بادشاہ کے رویّہ سے مایوس ہو کر ابدالی کی اطاعت قبول کر لی۔ مغل بادشاہ نے جاوید خاں (م ۱۷۵۲ء) کے مشورہ پر پنجاب اور ملتان کے صوبے ابدالی کو دے دیئے۔ ابدالی، معین الملک کو اپنی طرف سے **لاهور** کا صوبیدار مقرر کر کے واپس چلا گیا۔

۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء) میں احمد شاہ نے چوتھی بار پھر سے ہندوستان پر حملہ کر دیا اور وہ

۲۳ر جنوری ۱۷۵۷ء کو دہلی تک جا پہنچا۔ [نومبر ۱۷۵۳ء میں معین الملک اور ۱۷۵۴ء میں اس کے صغر سن فرزند، میر مومن (معین الملک کے انتقال کے بعد احمد شاہ نے میر مومن کو صوبیدار اور اس کی ماں کو مہمات ملکی پر مقرر کر دیا تھا۔) کے انتقال کے بعد وزیر سلطنت دلّی، عماد الملک غازی الدین فیروز جنگ، وزیر اور مدار المحام سلطنتِ عالمگیر ثانی، نے ۱۷۵۶ء میں حملہ کر کے پنجاب پر قبضہ کر لیا اور **لاھور** کے ایک بااثر امیر، میر منعم کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا تھا۔] اس نے پنجاب، کشمیر، سندھ اور سرہند وغیرہ علاقوں پر قبضہ کر لیا اور اپنے فرزند، تیمور شاہ کو **لاھور** کا صوبیدار اور افغان سپہ سالار، جہان خاں کو اس کا وزیر مقرر کر کے اپریل ۱۷۵۷ء میں وطن واپس لوٹ گیا۔

۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ء) اپریل میں رگھوناتھ راؤ اور ملہار راؤ (مراٹھہ) نے **لاھور** پر حملہ کر کے تیمور شاہ اور جہان خاں کو وہاں سے بھگا دیا نیز ۷۵ لاکھ روپیہ سالانہ مراٹھوں کو دینے کے عوض جالندھر دوآبہ کے حاکم، آدینہ بیگ خاں (م ۱۳؍ اکتوبر ۱۷۵۸ء) کو **لاھور** کا صوبیدار مقرر کر دیا۔

۱۱۷۳ھ (۱۷۵۹ء) اکتوبر میں مذکورہ بالا واقعہ کی وجہ سے ابدالی دریائے سندھ کو عبور کر کے سیدھا **لاھور** آیا اور اس نے پانچویں بار پھر سے حملہ کر کے پنجاب پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

۱۱۷۴ھ (۱۷۶۰ء) میں **لاھور** سے تقریباً بارہ کلومیٹر فاصلے پر واقع موضع آہلو کے جسا سنگھ نے **لاھور** کا محاصرہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور بادشاہ کا لقب اختیار کرتے ہوئے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا۔

۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) میں ابدالی پھر سے حملہ آور ہوا اور سکھوں کو شکست دے کر ۱۲؍ دسمبر ۱۷۶۲ء کو واپس لوٹ گیا۔ پھر اس کو ہندوستان کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی

جس سے وہ **لاھور** کا پوری طرح انتظام اور سکھوں کا استیصال پورا پورا نہ کر سکا۔ نتیجتاً کچھ ہی عرصے بعد **لاھور**، ملتان اور سندھ کی حکومت اس کے گماشتوں کے قبضے سے جاتی رہی اور پنجاب میں سکھوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء) فروری میں سکھوں نے پھر سے **لاھور** پر قبضہ کرلیا۔

۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں والئ کابل، سلطان زماں شاہ (۱۵) (شجرہ ۱۶۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔) (بن تیمور شاہ بن احمد شاہ درّانی) نے حملہ کر کے **لاھور** پر قبضہ کرلیا اور ایک انیس سالہ سکھ نوجوان، رنجیت سنگھ کو راجہ کے خطاب سے نوازتے ہوئے اس کو **لاھور** کا صوبیدار مقرر کردیا۔

۱۲۳۰ھ (۱۸۱۴ء) میں والئ کابل، شاہ شجاع (احمد شاہ ابدالی کا پوتا) کو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کشمیر سے پنجاب بلا کر **لاھور** میں قید کرلیا اور اس سے شاہجہاں کا مشہور زمانہ ہیرا، "کوہ نور" حاصل کرلیا۔ [۱۸۱۲ء میں اس کے بھائی نے اسے قید کر کے کشمیر بھیج دیا تھا۔]

۱۲۳۱ھ (۱۸۱۵ء) اپریل میں شجاع **لاھور** سے بھاگ کر برٹش ("ایسٹ انڈیا کمپنی") کے زیر انتظام لدھیانہ چلا گیا۔ [انگریزوں نے موقع پا کر ۸ رمئی ۱۸۳۹ء کو اسے پھر سے کابل کے تخت پر بٹھا دیا تھا۔ اس کے بعد ۲ رمئی ۱۸۴۲ء کو اسکے بھتیجے نے اسے قتل کردیا۔]

۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) میں سید احمد بریلوی (۱۶) نے لاہور کے راجہ، بدھ سنگھ کے پاس ایک تحریری اعلام نامہ حسب قاعدہ شرعی بھیج کر یہ مانگ کی کہ یا تو وہ اسلام قبول کرلے یا پھر مطیع ہوکر جزیہ دے نہیں تو جنگ کے لئے تیا ہوجائے۔ بالآخر جنگ ہوئی جس میں سکھوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

۱۲۶۳ھ (۱۸۴۶ء) ۱۳/۱۰ رفروری کو برٹش ("ایسٹ انڈیا کمپنی") کی فوج نے لاہور پر

حملہ کیا اور سکھوں کو شکست دے کر ۲۰ رفروری کو شہر میں داخل ہوگئی۔

۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) میں دیوان مولراج، ناظم ملتان نے **لاھور** میں آکر اپنی نظامت کا استعفیٰ برٹش حکام کے سامنے پیش کر دیا۔ صاحبِ ''قاموس المشاہیر'' کے بقول اس کو برطانیہ بھیج دیا گیا تھا جہاں اس نے عیسائی مذہب اختیار کرتے ہوئے ایک مصری عیسائی عورت سے شادی کر لی تھی اور پھر ۱۸۹۱ء میں فوت ہوگیا۔

۱۲۶۶ھ (۱۸۴۹ء) میں برٹش فوج ملتان میں داخل ہوگئی اور قریب تھا کہ قلعہ پر حملہ کرے کہ مولراج از خود معہ اپنی سپاہ کے قلعہ چھوڑ کر گورنر جنرل کی خدمت میں چلا آیا۔ گورنر جنرل نے اس کو قید کر کے لاہور روانہ کر دیا اور ۱۶ ر مارچ کو صوبہ پنجاب ضبط کر کے اور راجہ دلیپ سنگھ کو پینشن دے کر فرخ آباد میں رہنے کے لئے بھیج دیا۔

۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء، ۱۵ راپریل) کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آخری زوجہ، بھوری دیوی (۱۷) فوت ہوگئی۔

۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) کے انڈین ہائی کورٹ قانون کے تحت **لاھور** ہائی کورٹ قائم ہوا۔ (۱۸)

۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) میں علامہ اقبال کی زیرِ صدارت **لاھور** میں ''آل انڈیا مسلم کانفرنس'' کا اجلاس ہوا۔

۱۳۵۶ھ (۱۹۳۷ء) کے عام انتخابات میں پنجاب میں "Unionist" پارٹی برسرِ اقتدار آئی اور ''کانگریس'' کی مدد سے خضر حیات خاں وزیر اعلیٰ منتخب ہوئے۔

۱۳۵۹ھ (۱۹۴۰ء) مارچ میں ''مسلم لیگ'' کے **لاھور** اجلاس میں بابائے پاکستانی قوم، قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ایک علیحدہ آزاد مسلم مملکت کی مانگ کی۔ اُسی سال،

اِس سے پہلے کہ اجلاس میں وہ ''دو قومی نظریہ'' (Two Nation Theory) کا اعلان کر ہی چکے تھے۔ [یہ قابلِ ذکر ہے کہ اپریل ۱۹۲۵ء سے کچھ ہی پہلے لالہ لاجپت رائے بھی ہندوستان کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں مسلم صوبوں کی تجویز رکھ چکے تھے۔] (۱۹)

"Limited Civil Disobediance Movement" کے دوران **لاھور** سے مولانا ابوالکلام آزاد کو گرفتار کر کے دو سال کی سزا سنائی گئی اور پھر نینی جیل بھیج دیا گیا۔ (۲۰) اس وقت مولانا آزاد ''آل انڈیا کانگریس'' کے صدر تھے۔

۱۳۶۶ھ (۱۹۴۶ء) ۲ر مارچ کو وزیر اعلیٰ پنجاب، خضر حیات خاں نے استعفیٰ دے دیا۔ ۴ر مارچ کو شہر میں ''مسلم لیگ'' مخالف فسادات ہوئے جس میں ۱۳ آدمی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ [پہلے نواکھالی اور بہار میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ اس کے بعد کلکتہ، بمبئی، گڈھ مکتیسر (پہلے ضلع میرٹھ اور اب ضلع غازی آباد)، **لاھور**، امرتسر، ٹیکسلا اور راولپنڈی وغیرہ میں فسادات ہوئے۔]

۱۳۶۷ھ (۱۹۴۷ء) ۱۴ر اگست کو مملکتِ پاکستان کے عالمِ وجود میں آجانے کے بعد سے **لاھور** پورے پنجاب (غیر منقسم) کی بجائے نوتشکیل شدہ (منقسم مشرقی پنجاب) پنجاب کا دارالخلافہ بن گیا۔

۱۳۸۵ھ (۱۹۶۵ء) میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ ہندوستان کی فوجیں **لاھور** کے محاذ پر پیش قدمی کرتے ہوئے بین الاقوامی سرحد کو عبور کر کے اِچھوگل کینال تک پہنچ گئیں جہاں سے **لاھور** بالکل قریب اور ہندوستان کی توپوں کی زد میں تھا۔ (تفصیل ص ۱۱۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

۱۴۱۷ھ (۱۹۹۶ء) میں **لاھور** میں دوسری ''اسلامک کانفرنس'' کا انعقاد ہوا۔

International Cricket Council (I.C.C.) کی طرف سے

"قذافی اسٹیڈیم" لاھور میں "عالمی کرکٹ کپ" کا فائنل میچ کھیلا گیا۔

۱۴۲۰ھ (۱۹۹۹ء) فروری میں ہندوستان کے وزیرِ اعظم، جناب اٹل بہاری واجپئی نے پاکستان کا دورہ کیا اور لاھور میں ''مینارِ پاکستان'' پر جا کر وہاں رکھے رجسٹر میں اپنے تاثرات درج کئے۔ کسی ہندوستانی وزیرِ اعظم کا ''مینارِ پاکستان'' پر جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔

۱۴۳۰ھ (۲۰۰۹ء) میں "قذافی اسٹیڈیم" جاتے ہوئے لاھور میں سری لنکائی کرکٹ ٹیم پر نامعلوم مسلح دہشت گردوں نے قاتلانہ حملہ کیا۔ (۲۱)

حواشی

(۱) ۳۶۷ھ (۹۷۷ء) کے اواخر میں امیر سبکتگین نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ ان دنوں راجہ استپال کا بیٹا، راجہ جے پال سرہند سے لمغان [افغانستان کے مشرقی اضلاع جو موجودہ پاکستان میں پیشاور کے قریب تک پھیلے ہوئے ہیں، کا نام لمغان تھا۔] اور کشمیر سے ملتان تک کے علاقے پر حکومت کرتا تھا۔ ملتان کی سرحد پر دونوں حکمرانوں کے درمیان آمنا سامنا ہوا اور کئی روز تک لڑائی چلتی رہی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تو جے پال نے صلح کی درخواست کی۔ آخر کار اس شرط پر صلح ہوگئی کہ راجہ جے پال ایک لاکھ درم اور پچاس ہاتھی بطور نذرانہ پیش کرے گا۔ راجہ اپنی حکومت کے ایک معتبر رکن، دولت کو اس نذرانہ کے عوض گروی رکھ کر اور مسلمانوں کی ایک جماعت کو اپنے ہمراہ لے کر لاہور چلا گیا تاکہ حسب وعدہ وہ ہاتھی اور رقم ان کے حوالے کر سکے۔ لاہور پہنچ کر راجہ اپنے وعدہ سے پھر گیا اور اس نے ان مسلمانوں کو گرفتار کر کے سبکتگین سے یہ مانگ کی کہ وہ ان کے سردار کو رہا کر دے۔ اس کے درباریوں نے اسے ہر چند سمجھایا کہ وہ ایسا نہ کرے لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ جب سبکتگین کو علم ہوا تو وہ غصے سے تلملا اٹھا اور ایک لشکرِ جرار کے ساتھ راجہ پر حملہ آور ہوا۔ ہر چند کہ دہلی، کالنجر، قنوج اور اجمیر کے راجاؤں نے جے پال کی ہر طرح سے مدد کی لیکن انھیں

شکستِ فاش ہوئی اور لمغان و پشاور کے ملک دریائے سندھ کے کنارے تک مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔
["تاریخ فرشتہ" (اردو ترجمہ) جلد اوّل، ص ۹۰ تا ۹۲]

(۲) ۴۱۲ھ (۱۰۲۱ء) میں محمود نے اپنی عنانِ فتح کو کشمیر کی طرف موڑا اور نواحِ کشمیر میں پہنچ کر "لوہ کوٹ" کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ ایک ماہ تک جاری رہا اور محمود اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود جب اس کو فتح نہ کر سکا تو وہ لاہور کی سمت چل پڑا۔ ان دنوں راجہ انند پال [۱۰۰۱ء میں اپنے باپ، جے پال اوّل کا جانشین مقرر ہوا تھا۔] کا بیٹا، جے پال ثانی لاہور کا راجہ تھا جو کافی بوڑھا ہو چکا تھا؛ چنانچہ وہ مقابلے کی تاب نہ لا کر اجمیر بھاگ گیا۔
["تاریخ فرشتہ" (اردو ترجمہ) جلد اوّل، ص ۱۲۷]

(۳) امیر مودود (م ۴۴۱ھ ۲۴/رجب المرجب) بن سلطان مسعود بن سلطان محمود کے دورِ حکومت [۴۳۳ھ تا ۴۴۱ھ] میں پنجاب میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں اور مسلمان جاگیر دار اور امراء مودود کی اطاعت سے منہ موڑ کر آپس میں دست و گریباں تھے تو اُن تین بڑے بڑے ہندو راجاؤں نے جو ڈر کر جنگل میں جا چھپے تھے، نے باہمی اتفاق سے دس ہزار سوار اور بے شمار پیادوں کے ساتھ لاہور پر حملہ کر کے اس کا محاصرہ کر لیا۔ اس سے مسلمان امراء کی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر ایک متحدہ لشکر تیار کیا اور امیر مودود کی اطاعت کا اقرار کر کے حملہ آور فوج سے مقابلے کے لئے شہر سے باہر آئے۔ جب غنیم نے اُن کا یہ اتحاد دیکھا اور ان کے لشکر کی کثرت کا اندازہ کیا تو وہ بغیر جنگ کئے بدحواسی کے عالم میں میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے۔
["تاریخ فرشتہ" (اردو ترجمہ) جلد اوّل، ص ۱۷۷]

(۴) سلطان خسرو شاہ کی ۵۵۵ھ (۱۱۶۰ء) میں وفات کے بعد اس کا لڑکا خسرو ملک تخت نشین ہوا۔ اس نے لاہور کو اپنا دار السلطنت بنایا اور بڑے عدل و انصاف سے حکومت کی۔ جب شہاب الدین نے لاہور پر حملہ کیا تو وہ قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔
["تاریخ فرشتہ" (اردو ترجمہ) جلد اوّل، ص ۲۰۳]

(۵) اس بار بھی خسرو ملک قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔ غوری سیالکوٹ کا قلعہ تعمیر کر کے اور وہاں کی حکومت اپنے ایک امیر کے سپرد کر کے پھر سے غورستان واپس چلا گیا۔

[''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اوّل ص ۲۰۳]

(۶) اس مرتبہ شہاب الدین نے خسرو ملک سے بظاہر دشمنی کرنے کی بجائے دوستی کا اظہار کیا۔ اس نے خسرو ملک کے گرفتار شدہ شہزادہ کو آزاد کر دیا اور اپنے چند امراء، نیز شاہی اعزازات کے ساتھ شہزادہ کو باپ سے ملنے کے لئے روانہ کر دیا۔ ساتھ ہی امراء کو خفیہ طریقے سے یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ راستے بھر شہزادہ کو اتنی شراب پلاتے جائیں کہ وہ معمول سے زیادہ تاخیر باپ تک پہنچنے میں کرے۔ اُدھر خسرو شاہ فرزند کی رہائی کی خبر سن کر بے انتہا خوش ہوا اور بے خوف ہو کر آرام سے دن گزارنے لگا۔ اِدھر شہاب الدین ایک دوسرے راستے سے برق رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کر کے اچانک لاہور کے پاس دریائے راوی پر خیمہ زن ہو گیا۔ یہ دیکھ کر خسرو ملک نے مجبوراً غوری سے امان طلب کر لی اور لاہور پر بنا کسی معرکہ آرائی کے شہاب الدین کا قبضہ ہو گیا۔

[''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اوّل ص ۲۰۳، ۲۰۴]

(۷) شہاب الدین محمد غوری کی شہادت کے بعد اس کا بھتیجا، محمود بن سلطان غیاث الدین غورستان کا حکمراں ہوا۔ اس نے عنانِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی قطب الدین ایبک کے لئے آزادی و خودمختاری کا فرمان؛ چتر اور بادشاہی کے دیگر لوازمات کے ساتھ ہندوستان بھجوایا۔ قطب الدین اس فرمان اور خلعت کا استقبال کرنے کے لئے لاہور تک آیا اور ۱۸/ ذیقعدہ ۶۰۲ھ (۱۲۰۵ء) کو لاہور ہی میں تخت نشینی کی رسومات ادا کر کے واپس دلّی لوٹ گیا۔ اس کے پنجاب سے چلے جانے پر یلدوز نے غزنی سے آ کر لاہور پر حملہ کر دیا: اور اس طرح ۶۰۳ھ (۱۲۰۶ء) میں شہاب الدین کے پروردہ، پرداختہ یہ دونوں افراد ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہوئے۔ یلدوز شکست کھا کر توران و کرمان کے راستے پہاڑی علاقے میں جا چھپا۔ اس طرح پھر سے لاہور پر قطب الدین کا قبضہ ہو گیا۔

[''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اوّل، ص ۲۳۹۔۲۴۰]

(۸) **تاج الدین یلدوز** = بچپن میں اس کو شہاب الدین نے ایک سوداگر سے خریدا تھا۔ اس کی صورت و سیرت کی پاکیزگی اور حسن نے شہاب الدین کو اس کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ جب وہ جوان ہوا تو سلطان نے اس کو اپنے گرامی قدر امیروں کی جماعت میں شامل کر لیا

اور شیوران اور مکران کے علاقے اس کی جاگیر میں مقرر کردیئے۔ اس کے دو بیٹیاں تھیں۔ سلطان شہاب الدین کے حکم سے اس نے ایک بیٹی کی شادی قطب الدین ایبک سے اور دوسری کی شادی ناصر الدین قباچہ سے کردی تھی۔

(۹) جب چنگیزی مغلوں نے شہر پر حملہ کیا تو وہاں کا حاکم، ملک قراقش اپنی فوج میں نااتفاقی دیکھ کر دلّی فرار ہوگیا۔ معز الدین بہرام شاہ کو جب حالات کا علم ہوا تو اس نے شاہی محل میں امراء کو جمع کر کے اپنی اطاعت کا اقرار لیا اور پھر نظام الملک اور قطب الدین حسن غوری وکیل السلطنت کو ایک لشکر کے ساتھ مغلوں سے مقابلہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ جب لشکر دریائے بیاس (پرانا نام بیاہ) کے کنارے پہنچا تو نظام الملک جو پہلے ہی سے بادشاہ سے ناراض تھا، نے ایک شاطرانہ چال چلی جو ۸/ذیقعدہ ۶۳۹ھ (۱۲۴۱ء) کو بادشاہ کی گرفتاری کا ایک پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

["تاریخ فرشتہ" (اردو ترجمہ) جلد اول، ص ۲۶۵]

(۱۰) بابر کافی عرصے سے ہندوستان پر حملہ کرنے کی تمنا لئے تھا کہ دو اہم غیر مطمئن امراء نے اس کو حملہ کرنے کی دعوت دے ڈالی۔ یہ امراء تھے، دولت خاں اور عالم خاں۔ دولت خاں پنجاب کا سب سے زیادہ طاقتور امیر تھا۔ اس کے لڑکے، دلاور خاں کے ساتھ بادشاہ، ابراہیم لودی سختی سے پیش آچکا تھا۔ اور عالم خاں، بادشاہ کا چچا تھا جو دلّی کی گدی پر اپنا حق جتاتا تھا۔ بابر نے فوراً دعوت نامے کا مثبت جواب دیتے ہوئے ۱۵۲۴ء میں چوتھی بار [پہلا حملہ ۱۵۱۹ء کے اوائل میں، دوسرا حملہ ستمبر ۱۵۱۹ء میں اور تیسرا حملہ ۱۵۲۰ء میں] ہندوستان پر حملہ کیا اور پنجاب میں گھس کر لاہور پر قبضہ کرلیا۔

["بھارت کا برہت اتیہاس" (ہندی) جلد دوم، ص ۱۴۶؛ "مغل کالین بھارت" (ہندی) ص ۷، ۸]

(۱۱) ۱۰۳۶ھ (۱۶۲۶ء) میں جب جہانگیر کا انتقال ہوا تو اس کے دو شہزادے، شہاب الدین اور شہریار بقید حیات تھے۔ [خسرو کا ۱۶۲۲ء اور پرویز کا ۱۶۲۶ء میں پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔] شہاب الدین کی شادی ۱۶۱۲ء میں ارجمند بانو الملقب بہ ممتاز محل بنت آصف خاں (ملکۂ نورجہاں کا بھائی) اور شہریار کی شادی ۱۶۲۱ء میں لاڈلی بیگم بنت شیر افگن

(مہر النساء الملقب بہ نور جہاں کا پہلا شوہر) سے ہوئی تھیں۔ جہانگیر کے انتقال ہوتے ہی شہزادہ پرویز نے اپنی خوشدامنہ جو تب تک مہر النساء سے ملکۂ نور جہاں ہو چکی تھی، کی شے پر لاہور میں تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اُدھر دیوانِ سلطنت، خواجہ ابوالحسن کی حمایت پر آصف خاں جو وکیلِ سلطنت تھا، نے بہت چابکدستی اور عقلمندی سے خسرو کے لڑکے، شہزادہ داور بخش کی تخت نشینی کا اعلان کرتے ہوئے شہاب الدین کو فوراً بلا بھیجا اور میر بخشی کی حمایت سے لاہور پر حملہ کر کے پرویز کو گرفتار کر لیا، اور پھر اس کی آنکھیں پھوڑوا دیں۔ اس کے بعد شہاب الدین کے لاہور پہنچنے پر داور بخش کو برطرف کرتے ہوئے شہاب الدین کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا۔

(۱۲) نادر شاہ = اصل نام نادر قلی تھا وہ ایک ترکی النسل تھا اور ۱۶۸۷ء میں خراسان کے ایک معمولی گھرانے [ایک گڈریے کے گھر] میں پیدا ہونے کے سبب کافی دشواریوں کے بعد تعلیم حاصل کر سکا تھا۔ ۱۷۲۲ء میں ابدالی افغانوں نے شاہ حسین صفوی سے فارس حاصل کرلیا تو ۱۷۳۰ء میں نادر شاہ نے پھر سے فارس حاصل کرنے اور شاہ حسین کے فرزند، طہماسپ کے تخت نشیں ہونے میں مدد کی۔ اس کے بعد اس نے شاہ ایران کے ترکوں سے معاہدہ کر لینے سے خفا ہو کر ۱۷۳۲ء میں بادشاہ کو تخت سے معزول کر کے اس کے شیر خوار شہزادے کو عباس سوم کے لقب سے تخت نشین کر دیا اور انتظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد ۱۷۳۶ء میں بالآخر وہ خود مختار ہو گیا۔ ۱۰ر جمادی الاول ۱۱۶۰ھ (۱۰ مئی ۱۷۴۷ء) کو مشہد میں اس کو قتل کر دیا گیا۔

(۱۳) ''بھارت کا برہت اتیہاس'' (ہندی) جلد دوم ص ۲۴۶

(۱۴) احمد شاہ ابدالی = اس کا تعلق افغانستان کے ابدالی قبیلے سے تھا۔ وہ نادر شاہ کا بااعتماد سپہ سالار تھا۔ ۱۷۴۷ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد اس نے افغانستان میں ایک آزاد حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی اور ''دُرِ دُرّاں'' کا لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد سے اس کا قبیلہ بھی ''دُرّانی'' کے نام سے موسوم ہو گیا۔

جب وہ نادر شاہ کے ہمراہ ہندوستان آیا تھا تو تبھی سے ہندی حکمرانوں کی کمزوریاں بھانپ گیا تھا۔ اس لئے اس نے ان کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور سات بار ہندوستان پر حملے کئے۔

۲۶ سال حکومت کرنے کے بعد ۵۰ سال کی عمر میں ۱۱۸۲ھ (۷۷۲ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا مقبرہ جس پر اک سنہرا گنبد ہے، شاہی محل کے نزد واقع ہے۔

[''بھارت کا برہت اتیہاس'' (ہندی) جلد دوم ص ۲۴۷؛ ''قاموس المشاہیر'' جلد اول ص ۷۰]

(۱۵) سلطان زماں شاہ = وہ سلطان احمد شاہ ابدالی کا پوتا اور تیمور شاہ کا پانچواں فرزند، وارثِ سلطنت اور ایک قابل و بیدار مغز سلطان تھا۔ والد کی وفات کے بعد ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۳ء مئی) میں کابل میں تخت نشیں ہوا۔ پہلے تو اس نے ملک میں لاقانونیت کا خاتمہ کیا۔ اس کے بعد اس نے ۱۷۹۸ء میں لاہور تک اپنی سلطنت کو توسیع دی۔

''ایسٹ انڈیا کمپنی'' اُس سے خوف کھاتی تھی۔ اسی لئے ویلیزلی نے فارس سفیر بھیج کر اس کے اثر سے زماں شاہ کو لاہور سے واپس کابل لوٹ جانے پر مجبور کیا۔

محمد شاہ، بادشاہ ہرات نے ۱۸۰۰ء میں اس کو تخت سے بے دخل کرنے کے بعد اندھا کر کے بالا حصار میں قید کر دیا تھا۔ اس کے بعد اس کو ہندوستان آکر کمپنی بہادر کی پینشن پر زندگی بسر کرنی پڑی۔

[''بھارت کا برہت اتیہاس'' (ہندی) جلد سوئم ص ۱۱۷_۱۱۸]

(۱۶) سید احمد بریلوی = والد کا نام سید محمد عرفان تھا جن کا سلسلۂ نسب حضرت امام حسنؓ تک پہنچتا ہے۔ یکم مئی ۱۲۰۱ء میں بمقام رائے بریلی پیدا ہوئے اور بچپن ہی سے جہاد کا شوق تھا۔ ایک دفعہ رامپور میں آپ نے چند افغانیوں کی زبانی سنا کہ سکھوں نے مسلمان عورتوں کو جبراً سکھ بنا کر ان پر تصرف کر لیا ہے۔ اس پر آپ نے جہاد کا ارادہ کر لیا اور دس گیارہ ہزار مسلمان جاں نثاروں کی ایک فوج تیار کر لی۔ تب راجہ لاہور کے پاس اعلام نامہ ارسال کیا۔ راجہ نے آپ کے قاصد کو دربار سے نکلوا دیا اور دس ہزار کے ایک لشکر کے ساتھ مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ نوشہرہ کے قریب دریائے گنڈھ کے کنارے ۲۰ ر جمادی الاول ۱۲۴۲ھ (۲۱ ر دسمبر ۱۸۲۶ء) کو دونوں فوجیں، دونوں کناروں پر خیمہ زن ہوئیں۔ زبردست معرکہ آرائی کے بعد سکھوں کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد اول، ص ۲۹۰، ۲۹۶]

(۱۷) بھوری دیوی = مہاراجہ رنجیت سنگھ کی آخری بیوی تھی۔ اس کو سرکار سے ۸۰۰ روپیہ ماہوار

پینشن ملتی تھی اور ۶۰،۰۰۰ سالانہ سے زائد اس کے پاس جاگیر تھی۔ جب وہ فوت ہوئی تو اس کے پسر، متبنی کنور بھوپ سنگھ نے بہت دھوم دھام سے اس کی آخری رسومات ادا کیں۔ اس کی ارتھی مہاراجہ کی سمادھی کے پاس نذرِ آتش کی گئی اور راکھ ہردوار لے جا کر دریائے گنگا میں بہادی گئی۔ [''قاموس المشاہیر'' جلد اول ص ۱۴۳]

(۱۸) ''بھارت کا برہت اتیہاس'' (ہندی) جلد سوم ص ۲۹۹

(۱۹) .... ایضاً .... ص ۳۵۵

(۲۰) مولانا کو پورے دو سال تک جیل میں نہیں رہنا پڑا کیوں کہ اسی عرصے میں جرمنی نے جون ۱۹۴۱ء میں روس پر حملہ کر دیا اور ۶ ماہ کے اندر اندر ہی جاپان نے امریکہ کے Pearl Harbour (Ship) پر حملہ کر دیا تھا۔ نتیجتاً لڑائی Global ہو گئی تھی۔ [اس سے پہلے امریکہ برطانیہ کی مدد کر رہا تھا اور لڑائی مغربی یورپ تک ہی محدود تھی۔] چنانچہ امریکہ کے صدر، روزویلٹ (Roosvelt) نے برطانیہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوستان کے لیڈران سے تعلقات استوار کرے۔ الغرض دسمبر ۱۹۴۱ء میں وائسرائے ہند نے جواہر لال اور مولانا آزاد کو رہا کرنے کا فیصلہ لے لیا۔

(۲۱) ۵ ربیع الاول (۳ مارچ) بروز منگل صبح کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے شری لنکائی کرکٹ ٹیم کو ایک پاکستانی Luxury بس "قذافی اسٹیڈیم" لیجاتے وقت جیسے ہی لبرٹی چوک کے پاس (ٹریفک سرکل پر) قدر آہستہ ہوئی کہ دفعتاً اسپر نامعلوم اور انتہائی تربیت یافتہ تقریباً ایک درجن دہشت گردوں نے تابڑ توڑ ہینڈ گرینیڈ، راکٹوں اور خودکار اسلحہ [A.K. 47 رائفلوں] سے حملہ کر دیا۔ [یہ حملہ صبح کے 8:39 سے 8:51 تک چلا اور حملہ آور صحیح سلامت نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے] بس کا ڈرائیور، مہر محمد خلیل نہایت ہوشمندی اور جراءت کا ثبوت دیتے ہوئے بس کو تیزی سے وہاں سے نکال لیجانے میں تو کامیاب ہو گیا لیکن پھر بھی چھ شری لنکائی کھلاڑی اور انکا ایک برطانوی معاون کوچ معمولی سے زخمی ہو گئے۔ اس بس کے پیچھے جو گاڑی Umpires کو لیکر آ رہی تھی وہ البتہ حملے کی زد میں آ گئی جس سے اس کا ڈرائیور، محمد ظفر خاں جائے حادثے پر ہی جاں بحق اور ایک پاکستانی Reserve امپائر، احسان رضا، زخمی ہو گئے۔ کل ملا کر اس اندوہناک واقعے میں آٹھ افراد جن سب کا تعلق پاکستان سے تھا، جاں بحق ہوئے۔ ان میں پانچ پاکستانی سیکورٹی اہلکار شامل ہیں۔ ٹیم کا دورہ فوراً منسوخ کر دیا گیا اور شری لنکائی ٹیم اپنے ملک کے ایک چارٹرڈ ہوائی جہاز سے وطن واپس لوٹ گئی۔

۲۰۱۱ء میں "عالمی کرکٹ کپ" میچ کی پاکستان کو میزبانی کرنی تھی۔ اب اس واقعے سے اسکی میزبانی کھٹائی میں پڑ گئی ہے نیز مستقبل قریب میں کسی بیرونی کرکٹ ٹیم کے پاکستان آنے کے امکانات بھی معدوم ہو گئے ہیں جو معاشی اعتبار سے اسکے لئے ایک زبردست دھچکا ہو گا۔ ساتھ ہی ہندوستان پر بھی اس واقعے کے مضر اثرات مرتب ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔

خاندانِ غزنویہ
(۱) الپتگین = عبدالملک سامانی کا غلام تھا جو سامانی کی طرف سے صوبیدار خراسان ہوا۔ جب منصور بن نوح سامانی بادشاہ ہوا تو وہ غزنی چلا آیا اور غزنی کو دارالحکومت بنا کر خودمختاری کا اعلان کر دیا۔
۳۵۱ھ (۹۶۲)
دختر
(۲) اسحاق
۳۵۲ھ (۹۶۳ء)
اہلیہ (۵) ناصر الدین سبکتگین
۳۶۶ھ (۹۷۶ء)
(الپتگین کا غلام تھا)
(۳) ملک تگین = الپتگین کا غلام
۳۵۵ھ (۹۶۶ء)
(۴) پیری = الپتگین کا غلام
۳۶۲ھ (۹۷۲ء)
(۷) امین الملت، یمین الدولہ محمود
۳۸۷ھ (۹۹۷ء)
(۶) اسمٰعیل
۳۸۶ھ (۹۹۶ء)
(۹) ناصر الدولہ مسعود (اوّل)
۴۲۱ھ (۱۰۳۰ء)
(۸) جلال الدولہ محمد
۴۲۱ھ (۱۰۳۰ء)
(۱۳) اعز الدولہ عبدالرشید ۴۴۱ھ (۱۰۴۹ء)
(۱۲) بہاالدولہ ابوالحسن علی
۴۴۰ھ (۱۰۴۸ء)
(۱۰) شہاب الدولہ مودود
۴۳۲ھ (۱۰۴۰ء)
(۱۶) ظہیر الدولہ ابراہیم
۴۵۱ھ (۱۰۵۹ء)
(۱۵) جمال الدولہ فرخ زاد
۴۴۴ھ (۱۰۵۲ء)
(۱۱) مسعود (ثانی)
۴۴۰ھ (۱۰۴۸ء)
(۱۷) علاؤ الدولہ مسعود (ثالث)
۴۹۳ھ (۱۰۹۹ء)
(۲۰) یمین الدولہ بہرام
۵۱۲ھ (۱۱۱۸ء)
(۱۹) سلطان الدولہ ارسلان
۵۰۹ھ (۱۱۱۵ء)
(۱۸) کمال الدولہ شیر زاد
۵۰۰ھ (۱۱۰۶ء)
(۲۱) معز الدولہ خسرو شاہ
۵۴۷ھ (۱۱۵۲ء)
(۱۴) طغرل (غاصب)
۴۴۴ھ (۱۰۵۲ء)
(۲۲) تاج الدولہ خسرو ملک
۵۵۵-۵۸۲ھ
۱۱۶۰ء-۱۱۸۶ء
نوٹ: ناموں کے ساتھ جو سنہ دیے گئے ہیں وہ سنہ جلوس ہیں۔

درّانی شاہی خاندان
احمد شاہ درّانی (۱۷۴۷۔۱۷۷۳ء)
تیمور شاہ (۱۷۷۳۔۱۷۹۳ء)
ہمایوں
محمود
[۱۸۰۰۔۱۸۰۳ء
۱۸۰۹۔۱۸۱۸ء]
زماں شاہ
(۱۷۹۳۔۱۸۰۰ء)
شجاع الملک
[۱۸۰۳۔۱۸۰۹ء]
[۱۸۳۹۔۱۸۴۲ء]
ایوب
(۱۸۱۸۔۱۸۲۶ء)
مہاراجہ رنجیت سنگھ کا خاندان
بدھ سنگھ (م ۱۷۱۶ء)
نودھ سنگھ (م ۱۸۵۲ء)
چندر سنگھ
چڑت سنگھ (م ۱۷۷۴ء)
گجپت سنگھ (راجہ جند)
دیگر
مہا سنگھ
دختر
(مہان سنگھ)
(م ۱۷۹۲ء)
رنجیت سنگھ (پیدائش ۱۷۸۰ء، وفات ۱۸۳۹ء)
دلیپ سنگھ
(۱۸۴۳۔۱۸۴۹ء)
[رانی چندا کنور
کے بطن سے تھا]
ملتانہ سنگھ
پشورا سنگھ
کشمیرا سنگھ
تارا سنگھ
کھڑک سنگھ
(۱۸۳۹۔۱۸۴۰ء)
شیر سنگھ
(۱۸۴۱۔۱۸۴۳ء)
نونہال سنگھ
(۱۸۴۰ء)

(۲) لاہور کے چند نامور امراء

جن کے نقشِ پا کو رکھتی تھی زمیں سر پر بہ فخر
تربتوں میں خاک آلودہ ہیں وہ عالی گہر

نام ان کا کوئی اب بھولے سے بھی لیتا نہیں
جن کے دروازوں پہ ڈنکا بجتا تھا شام وسحر

خاک میں مر کر ملے افسوس وہ عالی دماغ
اب نشانِ قبر بھی اُن کے نہیں آتے نظر

(نامعلوم)

نمبر شمار	نام	منصب	عرصہ	
			کب سے	کب تک
۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	ملک ایاز (۱)	صوبیدار	سنہ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء)	—
۲۔	علی کرماج (۲)	صوبیدار	سنہ ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء)	—
۳۔	ملک اعز الدین ایاز (۳)	صوبیدار	—	—
۴۔	امیر تلاجو (۴)	صوبیدار	—	سنہ ۷۳۶ھ (۱۳۳۵ء)
۵۔	خضر خاں (۵)	صوبیدار	سنہ ۸۰۲ھ (۱۳۹۹ء)	—
۶۔	بہلول لودی (۶)	صوبیدار	—	—
۷۔	دولت خاں لودی (۷)	صوبیدار	—	—
		پنجاب	—	—
۸۔	احمد خاں سور (۸)	صوبیدار	—	سنہ ۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء)
	(الملقب بہ سکندر شاہ)		—	
۹۔	خضر خاں کاشغری (۹)	ناظم	سنہ ۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء)	—

عہدِ اکبری [سنہ ۹۶۳ھ (سنہ ۱۵۵۵ء) تا سنہ ۱۰۱۴ھ (سنہ ۱۶۰۵ء)]

۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	حسین قلی خاں (۱۰) (خانِ جہاں)	صوبیدار لاہور	سنہ ۹۶۵ھ تا (سنہ ۱۵۵۷ء)	سنہ ۹۷۵ھ (سنہ ۱۵۶۷ء)
۲۔	قاضی حسن زنجانی (۱۱)	قاضی	— —	سنہ ۹۷۵ھ (سنہ ۱۵۶۷ء)
۳۔	رائے رائے سنگھ آف بیکانیر (۱۲)	مشترکہ صوبیدار لاہور	سنہ ۹۹۴ء (سنہ ۱۵۸۵ء)	سنہ ۹۹۹ھ (سنہ ۱۵۹۰ء)
۴۔	راجہ بھگونت داس کچھواہا (۱۳)	......ایضاً......	سنہ ۹۹۴ء (سنہ ۱۵۸۵ء)	سنہ ۹۹۸ء (سنہ ۱۵۸۹ء)
۵۔	قلیج خاں اندجانی (۱۴)	دیوان لاہور	سنہ ۹۹۸ھ (سنہ ۱۵۸۹ء)	سنہ ۱۰۰۲ھ (سنہ ۱۵۹۳ء)
۶۔	متھرا داس کھتری (ہندی)	دیوان لاہور	سنہ ۱۰۰۳ھ (سنہ ۱۵۹۴ء)	— —
۷۔	میر مراد جوینی (تورانی) (۱۵)	بخشی لاہور	سنہ ۱۰۰۷ھ (سنہ ۱۵۹۸ء)	سنہ ۱۰۰۹ھ (سنہ ۱۶۰۰ء)
۸۔	خواجہ شمس الدین خوافی (ہندی) (۱۶)	صوبیدار لاہور	سنہ ۱۰۰۷ھ (سنہ ۱۵۹۸ء)	سنہ ۱۰۰۹ھ (سنہ ۱۶۰۰ء)
۹۔	قلیج محمد خاں (تورانی) (۱۷)	صوبیدار لاہور	۱۰۱۲ھ (i) (سنہ ۱۶۰۳ء)	سنہ ۱۰۱۳ھ (سنہ ۱۶۰۴ء)
			سنہ ۱۰۱۵ھ (سنہ ۱۶۰۶ء) (ii)	سنہ ۱۰۲۰ھ (سنہ ۱۶۱۱ء)
۱۰۔	ملک علی اہتمام خاں (برادر قاضی علی)	کوتوال لاہور	سنہ ۱۰۱۴ھ (سنہ ۱۶۰۵ء)	— —

عہدِ جہانگیری [۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) تا ۱۰۳۶ھ (۱۶۲۶ء)]

۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	دلاور خاں کاکر (۱۸)	صوبیدار	۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء)	۱۰۲۷ھ (۱۶۱۷ء)
۲۔	مرزا جعفر بیگ (آصف خاں) (۱۹)	صوبیدار	۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء)	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)
۳۔	نور الدین قلی اصفہانی (ہندی) (۲۰)	کوتوال	۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء)	۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء)
۴۔	ملک علی اہتمام خاں (ہندی) (برادر قاضی علی)	کوتوال	۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء)	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)
۵۔	قلیج خاں (تورانی) (۱۷)	صوبیدار	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)	۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ء)
۶۔	میر قوام الدین خوانی (ہندی)	دیوان	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)	۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء)
۷۔	جمال اللہ	کوتوال	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)	— —
۸۔	شیخ یوسف (ہندی)	بخشی	۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء)	— —
۹۔	آقا نور اصفہانی	کوتوال	— —	۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء)

۱	۲	۳	۴	۵
۱۰۔	آقا فضل اصفہانی (۲۱) (فاضل خاں)	نائب صوبیدار	۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء)	۱۰۲۸ھ (۱۶۱۸ء)
۱۱۔	خواجہ غیاث الدین (۲۲) (محمد غیاث بیگ اعتماد الدولہ)	صوبیدار	۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء)	۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء)
۱۲۔	صادق خاں (ہندی) (۲۳)	صوبیدار	۱۰۳۳ھ (۱۶۲۳ء)	۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء)
۱۳۔	طالب خاں (بن آصف خاں)	نائب صوبیدار	۱۰۳۴ھ (۱۶۲۴ء)	— —

عہدِ شاہجہانی [۱۰۳۶ھ (۱۶۲۶ء) تا ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء)]

۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	ابوالحسن (آصف خاں یمین الدولہ، مبارز الملت) (ہندی) (۲۴)	وکیل اور صوبیدار	۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء)	۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء)
۲۔	حکیم جمالائی کاشی (۲۵) (دیانت خاں) (ہندی)	دیوان	۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء)	۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲ء)
۳۔	وزیر خاں حکیم علیم الدین (۲۶) (ہندی)	صوبیدار	۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء)	۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء)
۴۔	رائے سبھا چند (ہندی) (۲۷)	دیوان	۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء)	۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء)

۱	۲	۳	۴	۵
۵۔	بہاری مل (ہندی) (۲۸)	دیوان	—	۱۰۴۸ھ
			—	(۱۶۳۸ء)
۶۔	محمد شریف (معتمد خاں) (ہندی) (۲۹)	صوبیدار	۱۰۴۹ھ	۱۰۴۹ء
			(۱۶۳۹ء)	(۱۶۳۹ء)
۷۔	دوست کام (بن معتمد خاں) (۳۰)	بخشی اور واقعہ	۱۰۴۹ھ	۱۰۵۱ھ
		نویس	(۱۶۳۹ء)	(۱۶۴۱ء)
۸۔	غیرت خاں (۳۱)	قلعدار	۱۰۴۹ھ	۱۰۵۰ھ
			(۱۶۳۹ء)	(۱۶۴۰ء)
۹۔	اعظم خاں کوکہ (۳۲)	صوبیدار	۱۰۴۹ھ	۱۰۵۳ھ
	[المعروف بہ فدائی خاں کوکہ]		(۱۶۳۹ء)	(۱۶۴۳ء)
۱۰۔	سعید خان بہادر ظفر بیگ (۳۳)	صوبیدار	۱۰۵۲ھ	۱۰۵۳ھ
		دوسری بار	(۱۶۴۲ء)	(۱۶۴۳ء)
۱۱۔	مہیش داس راٹھور (ہندی) (۳۴)	قلعدار	۱۰۵۴ھ	—
			(۱۶۴۴ء)	—
۱۲۔	سرانداز خاں قلماق (تورانی)	قلعدار	۱۰۵۶ھ	۱۰۵۶ھ
			(۱۶۴۶ء)	(۱۶۴۶ء)
۱۳۔	شفیع اللہ برلاس (تورانی)	قلعدار	۱۰۵۶ھ	۱۰۵۸ھ
	(تربیت خان)		(۱۶۴۶ء)	(۱۶۴۸ء)
۱۴۔	سید علی (ہندی)	کوتوال	۱۰۵۷ھ	۱۰۶۰ھ
	(بن سید جلال بخاری)		(۱۶۴۷ء)	(۱۶۵۰ء)

۱	۲	۳	۴	۵
۱۵۔	سید منور برہہ (ہندی) (بن سید خانِ جہاں)	قلعدار	سنہ ۱۰۵۷ھ (سنہ ۱۶۴۷ء)	— —
۱۶۔	محمد صالح	کوتوال	سنہ ۱۰۶۱ھ (سنہ ۱۶۵۰ء)	— —
۱۷۔	مرشد علی	بخشی	سنہ ۱۰۶۱ھ (سنہ ۱۶۵۰ء)	— —
۱۸۔	نادر علی بیگ (تُورانی)	قلعدار	سنہ ۱۰۶۱ھ (سنہ ۱۶۵۰ء)	— —
۱۹۔	آقا یوسف	داروغہ (عمارات)	سنہ ۱۰۶۱ھ (سنہ ۱۶۵۰ء)	— —
۲۰۔	نادر علی (تُورانی)	کوتوال	سنہ ۱۰۶۲ھ (سنہ ۱۶۵۱ء)	— —
۲۱۔	اسد اللہ (بن شیر خواجہ)	قلعدار	سنہ ۱۰۶۲ھ (سنہ ۱۶۵۱ء)	— —
۲۲۔	شیخ عبدالکریم (ہندی)	حارث	سنہ ۱۰۶۲ھ (سنہ ۱۶۵۱ء)	— —
۲۳۔	محمد فاضل خاں	بخشی اور واقعہ نویس	سنہ ۱۰۶۵ھ (سنہ ۱۶۵۴ء)	— —
۲۴۔	قاضی محمد یوسف	دیوان	سنہ ۱۰۶۶ھ (سنہ ۱۶۵۵ء)	— —

۱	۲	۳	۴	۵
۲۵۔	عبدالرحیم (ہندی) (بن عبدالکریم)	بخشی اور واقعہ نویس	۱۰۶۶ھ (۱۶۵۵ء)	۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء)
۲۶۔	بہادر خان باقی بیگ (۳۵)	محافظ لاہور	۱۰۶۶ھ (۱۶۵۵ء)	۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء)
۲۷۔	قاضی حیدر	قاضی	۱۰۶۶ھ (۱۶۵۵ء)	— —
۲۸۔	خواجہ معین خاں	نائب صوبیدار	۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء)	— —
۲۹۔	سید عزت خان عبدالرزاق گیلانی (۳۶)	محافظ لاہور	۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء)	— —
۳۰۔	شیخ داؤد (عزت خاں) (ہندی)	نائب صوبیدار	۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء)	— —
۳۱۔	باقی بیگ (غیرت خان، بہادر خان) (۳۷)	نائب صوبیدار	۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء)	۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء)
۳۲۔	علی مردان خاں (امیر الامراء) (۶۷)	صوبیدار	۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء)	۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء)

عہدِ عالمگیری [سنہ ۱۰۶۸ھ (سنہ ۱۶۵۷ء) تا سنہ ۱۱۱۸ھ (سنہ ۱۷۰۶ء)]

۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	مہابت خان محمد ابراہیم (۳۸)	صوبیدار	— —	سنہ ۱۰۷۸ھ (سنہ ۱۶۶۷ء)
۲۔	خانِ جہاں بہادر ظفر جنگ کوکلتاس (۳۹)	صوبیدار	سنہ ۱۱۰۲ھ (سنہ ۱۶۹۰ء)	سنہ ۱۱۰۵ھ (سنہ ۱۶۹۳ء)
۳۔	مظفر حسین المعروف بہ فدائی خان کوکہ (۴۰)	صوبیدار	سنہ ۱۰۶۲ھ (سنہ ۱۶۷۱ء)	سنہ ۱۰۸۶ھ (سنہ ۱۶۷۵ء)
۴۔	محمد امین خان (میر محمد امین) (۴۱)	صوبیدار	سنہ ۱۰۷۸ھ (سنہ ۱۶۶۷ء)	سنہ ۱۰۸۱ھ (سنہ ۱۶۷۰ء)
۵۔	قوام الدین خاں اصفہانی (۴۲)	صوبیدار	سنہ ۱۰۸۹ھ (سنہ ۱۶۷۸ء)	سنہ ۱۰۹۱ھ (سنہ ۱۶۸۰ء)
۶۔	لطف اللہ خان (۴۳)	نائب صوبیدار	سنہ ۱۰۹۱ھ (سنہ ۱۶۸۰ء)	سنہ ۱۰۹۲ھ (سنہ ۱۶۸۱ء)
		واقعہ نویس	سنہ ۱۰۹۳ھ (سنہ ۱۶۸۲ء)	سنہ ۰۱۹۴ھ (سنہ ۱۶۸۲ء)
۷۔	کامگار خان (۴۴)	واقعہ نویس	سنہ ۱۰۹۲ھ (سنہ ۱۶۸۱ء)	سنہ ۱۰۹۳ھ (سنہ ۱۶۸۲ء)
۸۔	خلیل اللہ خان (۴۵)	صوبیدار	—	—
۹۔	میر محمد کاظم خان (۴۶)	دیوان قلعدار [جہاندار شاہ کے عہد میں]	—	—

۱	۲	۳	۴	۵
۱۰۔	صمصام الدولہ شاہنواز خان (۴۷)	دیوان	—	—
۱۱۔	اللہ یار خاں (۴۸)	صوبیدار	—	—
۱۲۔	احمد یار خاں (۴۹) (بن اللہ یار خاں)	صوبیدار	—	—

عالمگیر کے بعد کا دور [۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) تا ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ء)]

۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	ولی محمد خاں مسرور	حاکم	طہماسپ ثانی، شاہ فارس کے عہد (۱۱۳۵ھ تا ۱۱۵۱ھ) میں	
۲۔	سیف الدولہ عبد الصمد خان بہادر دلیر جنگ (۵۰)	صوبیدار		
۳۔	زکریا خان بہادر ہز بر جنگ (۵۱)	صوبیدار	—	۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء)
۴۔	شہنواز خاں (۵۲) (بن زکریا خاں)	صوبیدار	۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء)	— —
۵۔	معین الملک (۵۳) (بن اعتماد الدولہ قمر الدین خاں)	صوبیدار	۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء)	۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء)
۶۔	میر مومن (بن معین الملک) (۵۴)	صوبیدار	۱۱۶۷ھ (۱۷۵۳ء)	۱۱۶۸ھ (۱۷۵۴ء)

۱	۲	۳	۴	۵
۷۔	میر منعم (۵۵)	صوبیدار	۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء)	۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء)
۸۔	تیمور شاہ (۵۶)	صوبیدار	۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء)	۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ء)
۱	۲	۳	۴	۵
۹۔	آدینہ بیگ خاں (۵۷)	صوبیدار	۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ء)	۱۱۷۲ھ (۱۷۵۸ء)
۱۰۔	رنجیت سنگھ (۵۸)	صوبیدار	۱۱۷۸ھ (۱۷۶۴ء)	۱۱۹۳ھ (۱۷۷۹ء)
۱۱۔	حفظ اللہ خاں	واقعہ نویس	۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء)	— —
۱۲۔	شاہ نواز خاں	صوبیدار	—	—

(۳) لاہور میں پیدا ہوئے/ وصال پائے چند نامور امراء

نمبر شمار	نام	سنہ پیدائش/ وصال	پیدائش/ وصال
۱	۲	۳	۴
۱۔	قاضی حسن زنجانی (۱۱)	۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء)	انتقال

۱	۲	۳	۴
۲۔	راجہ بھگونت داس کچھواہہ (۱۳)	۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء)	انتقال
۳۔	راجہ ٹوڈرمل (۵۹)	۱۱/محرم الحرام ۹۹۸ھ (۱۰/نومبر ۱۵۸۹ء)	انتقال
۴۔	شیخ مبارک ناگوری (۶۰)	۱۰۰۱ھ ۱۷/ذیقعدہ (۱۵۹۲ء ۵/اگست)	انتقال (لیکن دفن آگرہ میں ہوئے)
۵۔	خواجہ شمس الدین خوانی (۱۶)	۱۰۰۹ء (۱۶۰۰ء)	انتقال
۶۔	میر مراد جوینی (۱۵)	۱۰۰۹ء (۱۶۰۰ء)	انتقال
۷۔	شاہ بیگ خان کابلی (۶۱) (خانِ دوراں اوّل)	۱۰۲۹ھ (۱۶۱۹ء)	انتقال
۸۔	ابوالحسن آصف خاں امیر الدولہ (۲۴)	۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء)	انتقال
۹۔	فتح خاں [بن ملک عزیز (م ۱۶۲۶ء)]	۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء)	انتقال
۱۰۔	اسد خاں ماموری (۶۲)	۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء)	انتقال
۱۱۔	خواجہ ابوالحسن تربتی (۶۳)	۱۰۴۲ھ (۱۶۳۲ء)	انتقال
۱۲۔	علامی ملا شکر اللہ شیرازی (الملقب بہ افضل خاں)	۱۰۴۸ھ ۱۲/رمضان ۷/جنوری (۱۶۳۹ء)	انتقال
۱۳۔	صف شکن خاں مرزا لشکری (۶۴)	۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء)	انتقال
۱۴۔	خانِ جہاں بارہہ (۶۵)	۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء)	انتقال
۱۵۔	خانِ دوراں نصرت جنگ (۶۶)	۱۰۵۵ھ ۷/جمادی الاوّل (۱۶۴۵ء ۲/جون)	انتقال

۱	۲	۳	۴
۱۶۔	علی مردان خاں امیر الامراء (۶۷)	۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء)	انتقال
۱۷۔	ظفر خاں (خواجہ احسن اللہ (بن خواجہ ابوالحسن تربتی) (۶۸)	۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء)	انتقال
۱۸۔	ملا علاء الملک تونی (۶۹) (مخاطب بہ فاضل خاں)	ایضاً (۱۱/ ذیقعدہ) (ایضاً ۲۴/ جون)	انتقال
۱۹۔	پشوتن (م ۱۶۴۲ء آگرہ) (۷۰)	۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) ۳/ ذیقعدہ بروز جمعہ	پیدائش
۲۰۔	ستی النساء (۷۱)	۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء)	انتقال
۲۱۔	فاضل خاں (۷۲)	۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء) ۲۷/ ذیقعدہ	انتقال
۲۲۔	صمصام الدولہ شاہنواز خاں (۴۷)	۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء)	پیدائش

حواشی

(۱) ملک ایاز = محمود غزنوی نے لاہور فتح کر کے اس کو وہاں کا صوبیدار مقرر کیا۔ اس طرح کسی بھی مسلم سلطان کی طرف سے مقرر کیا گیا وہ لاہور کا پہلا صوبیدار ہوا۔

(۲) علی کرماج = شہاب محمد غوری کی طرف سے ملتان کا حاکم تھا۔ جب ۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں غوری نے لاہور پر زبردست حملہ کر کے اسے فتح کر لیا تو علی کرماج کو لاہور کا حاکم مقرر کیا۔

(۳) ملک اعز الدین ایاز = رضیہ سلطانہ بنت سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۳۶ء میں برسرِ اقتدار آنے پر حکومت کی تنظیم نو کی۔ حکومت کے اہم اور بڑے بڑے عہدے اپنے

مشہور اور قابلِ اعتماد امیروں کے سپرد کیے۔ اعز الدین کبیر خانی (ملک اعز الدین ایاز) کو لاہور کا حکمراں (صوبیدار) مقرر کیا لیکن جب رضیہ سلطانہ اور جمال الدین یاقوت حبشی کے درمیان تعلقات نے غلط موڑ لیا تو بہت سے امراء رضیہ سے ناراض ہو گئے۔ ملک اعز الدین نے بھی ۱۲۳۸ء میں رضیہ کے خلاف علمِ سرکشی بلند کر دیا۔ جب رضیہ نے اس پر لشکر کشی کی تو اس نے پھر سے رضیہ کی اطاعت قبول کر لی۔ اس پر رضیہ نے خوش ہو کر اس کو لاہور کے ساتھ ملتان کی بھی حکومت سپرد کر دی۔ ملک ایاز کی قبر لاہور میں واقع ہے۔

(۴) امیر ہلاجو = محمد بن تغلق کے عہدِ حکومت میں صوبیدار لاہور ہوا۔ لیکن اس نے ۱۳۳۵ء میں سلطان کے خلاف بغاوت کر دی جس کی پاداش میں مارا گیا۔

(۵) خضر خاں = تیمور نے وطن واپس لوٹتے وقت خضر خاں کو ملتان، لاہور اور دیپالپور کا صوبیدار مقرر کیا۔

(۶) بہلول لودی = سلطان محمد شاہ بن فرید خاں بن خضر خاں کے عہدِ حکومت (۱۴۳۴ـ۱۴۴۵ء) میں وہ لاہور اور سرہند کا صوبیدار رہا۔ بعد میں دیپالپور کو اپنے قبضہ میں کر کے خود مختار ہو گیا تھا۔ آگے چل کر وہ لودی خاندان کا پہلا سلطان ہوا۔ تفصیلات احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد چہارم (''تذکرۂ جہانیاں'') میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۷) دولت خاں لودی = ۱۵۲۴ء میں جب بابر نے چوتھی بار ہندوستان پر حملہ کر کے باجور اور بھیرا کے علاوہ پنجاب میں داخل ہو کر لاہور، سیالکوٹ اور دیپالپور وغیرہ پر قبضہ کیا، ان دنوں دولت خاں لودی پنجاب کا صوبیدار تھا۔ اسی کی دعوت پر بابر نے حملہ بھی کیا تھا۔ دولت خاں پورے پنجاب پر اپنی حکومت چاہتا تھا لیکن بابر اس کے لڑکے دلاور خاں اور عالم خاں لودی کو پنجاب کی دیکھ ریکھ سپرد کر کے واپس چلا گیا۔ دولت خاں نے دلاور خاں اور عالم خاں پر حملہ کر کے ان سے علاقہ چھین لیا۔ چنانچہ نومبر ۱۵۲۵ء میں بابر پھر سے حملہ آور ہوا۔ دولت خاں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ بابر نے اسے قید کر کے بھیرا روانہ کر دیا۔ راستے میں ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

[''مغل کالین بھارت'' (ہندی) ص ۸]

(۸) احمد خاں سور = احمد خاں، نظام خاں سوری (شیر شاہ سوری کا بھائی) کا داماد، یعنی محمد عادل شاہ سور (اصل نام مبارز خاں) کا بہنوئی تھا۔ اس نے ۱۵۵۵ء میں سلطان عادل شاہ سور پر حملہ کیا۔ فرح (متھرا) کے قریب جنگ ہوئی جس میں عادل شاہ کی شکست ہوئی۔ سکندر شاہ نے آگرہ اور دلّی پر قبضہ کر لیا۔ اس سے حکومت ہمایوں نے لے لی تھی۔

(۹) خضر خاں خاشغری = اس کی شادی شہزادی گلبدن بیگم بنت بابر بادشاہ سے ہوئی تھی۔ لاہور کے بعد اس کو بہار کا ناظم مقرر کر دیا گیا تھا جہاں ۹۶۶ھ (۱۵۵۸ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ [''قاموس المشاہیر'' جلد دوم ص ۱۴۸]

(۱۰) حسین قلی بیگ = وہ خانِ خاناں بیرم خاں کا بھانجہ اور ولی بیگ ذوالقدر کا لڑکا تھا۔ جب بیرم خاں اور شمس الدین اتکہ کے درمیان جالندھر کے قریب معرکہ آرائی ہوئی تو اس میں بیرم خاں کی طرف سے لڑتے ہوئے ولی بیگ زخمی ہو گیا تھا اور بعد میں زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا۔
حسین قلی اکبر کے عہد میں پنج ہزاری منصب دار رہا۔ ۹۷۱ھ (۱۵۶۳ء) میں اسکو ''خان'' کے خطاب سے نوازتے ہوئے اجمیر اور ناگور کی جائداد دی گئی۔ ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں جب اکبر گجرات فتح کر کے آگرہ لوٹا تو جشن کے موقع پر اس کو ''خان جہاں'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ [اس وقت یہ سب سے اونچا خطاب مانا جاتا تھا اور محض خانِ خاناں کو یہ خطاب ملا ہوا تھا۔] ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) میں بنگال کے صوبیدار، منعم خان کے انتقال کے بعد اس کو وہاں کا صوبیدار مقرر کیا گیا اور ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں صوبیدار اڑیسہ بنا دیا گیا۔ اس نے ٹانڈا کے قریب صحت پور کے نام سے ایک بستی آباد کی۔ وہیں ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں وہ بیمار پڑ گیا۔ مرض اطباء کی سمجھ میں نہ آسکا اور پھر ڈیڑھ ماہ بسترِ علالت پر رہ کر دسمبر میں انتقال کر گیا۔ [''ماثر الامرا'' (انگلش ترجمہ) جلد اول ص ۶۴۵ تا ۶۴۹]

(۱۱) قاضی حسن زنجانی = آپ کو کئی ہزار احادیث ازبر تھیں۔ بابر بادشاہ جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے آپ کا شہرۂ فضل و کمال سن کر فرغانہ طلب کیا اور مشیر خاص بنا لیا۔ آپ بابر کے ہمراہ ہند وارد ہوئے۔ ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد بابر نے آپ کو دیگر باغیوں کو زیر کرنے کے لئے معمور کیا۔ چنانچہ آپ نے موجودہ بجنور ضلع میں واقع قصبہ

سیوہارہ کو فتح کیا جس سے خوش ہوکر بادشاہ نے وہ علاقہ آپ کو جاگیر میں عطا فرماتے ہوئے منصبِ قضیات مرحمت فرمائی۔ بعد میں اکبر نے آپ کو لاہور کا قاضی بنا کر بھیجا۔ آپ کو دیوانی اور فوجداری کے کل اختیارات حاصل تھے۔ وہیں ۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء) میں سو سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ فرنگ کے دیرینہ قبرستان میں شاہ سریائی کے مزار کے پاس آپ کا مزار شریف واقع تھا۔ اب آثار لاپتہ ہیں۔

آپ کی اولاد میں کئی نامور ہستیاں پیدا ہوئیں، جیسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، بیرسٹر آصف علی، پروفیسر عبدالصمد صارم، خان بہادر نورالاسلام وغیرہ وغیرہ۔ آج بھی آپ کی اولاد سیوہارہ میں رہتی ہے اور ابھی بھی قاضی کہلاتے ہیں۔ احقر کی حقیقی نانی کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔

(۱۲) رائے رائے سنگھ آف بیکانیر = وہ بیکانیر کے زمیندار کلیان مل کا لڑکا اور راٹھور قبیلے سے تھا۔ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کی دختر، جو بیکانیر بیگم کے نام سے مشہور ہوئی، شہزادہ سلیم کے عقد میں تھی۔ اکبر نے اسے چار ہزاری اور جہانگیر نے پنج ہزاری منصب عطا فرمائے۔ [''قاموس المشاہیر'' جلد اول ص ۲۴۲]

(۱۳) راجہ بھگونت داس کچھواہا = راجہ بہارامل کچھواہہ کا لڑکا تھا۔ ۱۵۷۲ء میں بہادری دکھانے کے عوض علم و نقارہ مرحمت ہوا۔ ۹۹۳ھ (۱۵۸۴/۸۵ء) میں اس کی لڑکی کی شادی شہزادہ سلیم سے ہوئی اور دو کروڑ روپیہ کا مہر مقرر ہوا۔ اسی کے بطن سے ایک دختر، سلطان النساء بیگم اور ۴ اگست ۱۵۸۷ء کو شہزادہ خسرو پیدا ہوئے۔ وہ اکبر کا نہایت وفادار سردار اور کھلے ذہن کا انسان تھا۔ اس نے لاہور میں ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جس میں اکثر لوگ جمعہ کی نماز ادا کرتے تھے۔ تیسویں سال جلوس اکبری میں وہ پنج ہزاری منصب پر فائز ہوا۔ ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں اس کا لاہور میں انتقال ہوگیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۱۳۰ تا ۱۳۳]

(۱۴) قلیج خاں اندجانی = اس کے باپ دادا سلاطینِ چغتائیہ کی خدمت میں صاحبِ نسبت رہے تھے۔ خاص طور سے اس کا دادا سلطان حسین مرزا بایقرا کے یہاں امارت کا درجہ رکھتا تھا۔ جب اکبر نے کشمیر کے سفر کا ارادہ کیا تو اس نے قلیج خاں کو راجہ بھگونت داس اور راجہ

ٹوڈرمل کے ہمراہ لاہور میں ٹھہرنے کا حکم دیا تا کہ ایک دوسرے کے مشورے سے ملکی معاملات انجام پائیں۔ راجہ ٹوڈرمل کے مرنے کے بعد بھی وہ ایک مدت تک دیوانی کے کام انجام دیتا رہا۔ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں وہ کابل کی نظامت پر مقرر کیا گیا۔ ۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۶۱ تا ۶۶]

(۱۵) **میر مراد جوینی** = بہت دنوں تک دکن میں رہنے کے سبب دکنی مشہور ہوا۔ شجاعت اور بہادری میں بے مثال تھا۔ تیر اندازی کے فن میں لوگ ماہر استاد سمجھتے تھے، اس لئے اکبر نے شہزادہ خرم کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا۔ بخشی گیری کے زمانے میں ہی ۱۰۰۹ھ (۱۶۰۰ء) میں لاہور میں وفات ہوئی۔ ["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۱۳۰ تا ۱۳۳]

(۱۶) **خواجہ شمس الدین خوافی** = مورث اعلیٰ ہرات کے رہنے والے تھے جو بعد میں خواف آ گئے تھے۔ اس لئے خوافی کہلائے۔ شمس الدین کو اکبر نے ۱۵۵۹ء میں "خانِ اعظم" اور پھر بعد میں "اتکا خان" اور "اعظم خاں" کے خطابات سے نوازا۔ وہ مغلیہ سلطنت کا دیوان بھی رہا۔ لاہور میں انتقال ہوا۔

(۱۷) **قلیج خاں تورانی** = ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں وہ صوبیدار گجرات، ۹۸۹ھ (۱۵۸۱ء) میں وزیر، ۹۹۴ھ (۱۵۸۵ء) میں مشترکہ صوبیدار احمد آباد، ۱۰۰۷ھ (۱۵۹۸ء) میں صوبیدار آگرہ، ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) میں صوبیدار پنجاب، ۱۰۱۲ھ (۱۶۰۳ء) میں صوبیدار لاہور، ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں صوبیدار گجرات، ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں صوبیدار لاہور، ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ء) میں صوبیدار کابل ہوا نیز چار ہزار ذات سے ترقی کرتا کرتا چھ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کے منصب پر پہنچا۔ عہدِ جہانگیری میں ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ دو دو بار لاہور کا صوبیدار رہا، ایک بار اکبر کے عہد میں اور دوسری بار جہانگیر کے عہد میں۔

["The Apparatus of Empire"]

(۱۸) **دلاور خاں کاکر** = اس کا اصل نام ابراہیم تھا۔ جس لائقمندی سے اس نے لاہور کو سلطان خسرو کے حملے سے محفوظ رکھا اس پر شاہی عنایات سے سرفراز ہوا۔ ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۷ء) میں وہ کشمیر کی صوبیداری پر فائز ہوا۔

["مآثر الامراء" (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۱۳۰ تا ۱۳۳]

(۱۹) مرزا جعفر بیگ (آصف خان) = وہ عہدِ اکبری میں ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں بخشی، ۹۹۴ھ (۱۵۸۶ء) میں بخشی الہ آباد، ۱۰۰۶ھ (۱۵۹۷ء) میں صوبیدار کشمیر، ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) میں دیوانِ کل، ۱۰۱۰ھ (۱۶۰۱ء) میں صوبیدار آگرہ، ۱۰۱۳ھ (۱۶۰۴ء) میں صوبیدار بہار اور دو ہزار ذات اور دو ہزار سوار کے منصب پر فائز رہا۔ عہدِ جہانگیری میں ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں حاکم لاہور، ۱۰۱۵ھ (۱۶۰۶ء) میں وزیر اور پانچ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کے منصب پر فائز رہا۔ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں وفات پا گیا۔ ["Tha Apparatus of Empire"]

(۲۰) نورالدین قلی اصفہانی = ۱۰۲۶ھ (۱۶۱۷ء) میں وہ ایک ہزاری ذات اور ۳۰۰ سوار کے منصب پر فائز ہوا۔ ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) (دور شاہجہانی) میں سابقہ منصب دو ہزاری ذات اور ۷۰۰ سوار کے منصب پر بحال ہوا۔ ۲۵ رشعبان ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) کو اسے کشن سنگھ نے قتل کر دیا۔ [''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۲۱۴]

(۲۱) فاضل خاں = اصل نام آقا فضل اصفہانی تھا۔ وہ ولایت سے ہندوستان آیا اور شیخ فرید مرتضیٰ خاں بخاری سے وابستہ ہو گیا۔ ۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) میں جب صوبہ پنجاب کی حکومت شیخ فرید کو تفویض ہوئی تو لاہور کی نائب صوبہ داری اس کو مل گئی۔ جب شیخ فرید کے انتقال کے بعد صوبہ اعتمادالدولہ کی جاگیر میں مقرر رہا تو بھی وہ بدستور نائب صوبہ دار لاہور رہا۔ بعد میں اس کو ''فاضل خاں'' کا خطاب مرحمت ہوا۔ اس کے بعد شاہجہاں نے بھی اس کو نوازتے ہوئے ''اعتماد خاں'' کا خطاب مرحمت فرمایا۔ ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ [''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۶۳۸، جلد سوم ص ۱۵ تا ۱۸]

(۲۲) خواجہ غیاث الدین (محمد غیاث بیگ) = والد کا نام محمد طہرانی تھا جو طہماسپ صفوی، شاہ ایران کے عہد میں حاکم خراسان رہا لیکن خواجہ غیاث گردشِ زمانہ سے پریشان ہو کر ایک قافلے کے ساتھ معہ اپنی بیوی کے عازم ہندوستان ہوا۔ قندھار کے قریب راستے میں اس کے لڑکی پیدا ہوئی۔ کئی دنوں سے پریشانی اور معاشی تنگی کا سامنا تھا چنانچہ اس بچی کو چھوڑ کر آگے بڑھ لیا۔ وہ بچی ایک سوداگر کے ہاتھ لگ گئی اور پھر خدا کی قدرت سے خواجہ کی اہلیہ ہی اس بچی کو دودھ پلانے پر مقرر ہوئی۔ آگے چل کر یہی بچی جس کا نام مہرالنساء تھا،

ملکۂ نور جہاں کے نام سے مشہور ہوئی۔ سوداگر نے جب وہ لڑکی اکبر کو پیش کر دی تو مرزا غیاث بھی اکبر کے یہاں ملازم ہو گئے۔ عہدِ جہانگیری میں ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۵ء) میں نصف حکومت کے وزیر کے ساتھ ''اعتماد الدولہ'' کے خطاب سے سرفراز ہوا، پھر ترقی کرتے کرتے ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ء) میں وزیر و وکیل، ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں صوبیدار لاہور ہوا نیز ایک ہزار ذات اور دو سو پچاس کے منصف سے سات ہزار ذات اور سات ہزار سوار کے منصب تک ترقی کی۔ ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۰ء) میں انتقال ہو گیا۔ آگرہ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اعتماد الدولہ کے نام سے آپ ہی کا مقبرہ قابلِ دید ہے جو نور جہاں نے تعمیر کرایا تھا۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد دوم، ص ۲۴۱؛ "The Apparatus of Empire"]

(۲۳) صادق خان = آقا طاہر وصلی بن محمد شریف ہروی کا لڑکا اور اعتماد الدولہ طہرانی کا بھتیجا اور داماد تھا۔ کچھ مدت اپنے باپ کے ہمراہ پنجاب کے نواح میں گزاری۔ ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء) میں ایک ہزار ذات اور ایک ہزار سوار کے منصب کے ساتھ ''خان'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ پھر ترقی کرتے کرتے چار ہزار ذات اور چار ہزار سوار کے منصب کے ساتھ ساتھ ۱۰۳۲ھ (۱۶۲۲ء) میں صوبیدار پنجاب، ۱۰۳۳ھ (۱۶۲۳ء) میں حاکم لاہور اور عہدِ شاہجہانی میں ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں میر بخشی ہوا۔ ۹ ربیع الاول ۱۰۴۳ھ (۳ ستمبر ۱۶۳۳ء) کو انتقال ہو گیا۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد دوم ص ۳۳؛ ''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۷۲۳ تا ۷۲۵؛ "The Apparatus of Empire"]

(۲۴) ابوالحسن (آصف خاں) = وہ نور جہاں کا بھائی، شاہجہاں کا خسر اور مشہور مغل امیر، شائستہ خاں کا باپ تھا۔ وہ دورِ جہانگیری میں: ۱۶۱۱ء میں ''اعتقاد خاں'' کے لقب سے سرفراز ہو کر ۱۶۱۹ء میں وکیلِ حضرات، ۱۶۲۲ء میں صوبیدار بنگال و اڑیسہ، ۱۶۲۷ء میں وکیل اور صوبیدار پنجاب و ملتان رہا۔ دورِ شاہجہانی میں: ۱۶۲۷ء میں ''مبارز الملک'' اور ''یمین الدولہ'' کے خطابات سے نوازے جانے کے ساتھ ساتھ وکیل و صوبیدار لاہور رہا اور ۱۶۳۴ء میں ''خانِ خاناں سپہ سالار'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۶۴۱ء میں انتقال کے وقت وہ ۹۰۰۰ ذات اور ۹۰۰۰ سوار کے منصب پر فائز تھا۔ شاہدرہ میں دریائے راوی کے کنارے جہانگیر کے مقبرہ

کے متصل مدفون ہے۔ چارلز کے شائستہ خاں، مرزا مسیح، مرزا حسین اور نوشہ نواز خاں چھوڑے۔

(۲۵) حکیم جمالائی کاشی = ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) میں دو ہزاری ذات اور ۲۵۰ سوار کے منصب پر فائز ہوا اور صوبہ پنجاب کی دیوانی پر مقرر رہا۔ ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) میں ''دیانت خاں'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۰۸۳ھ (۱۶۷۲ء) میں انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۳۶۔۳۷]

(۲۶) وزیر خاں حکیم علیم الدین = وہ چنیوٹ (پنجاب) کا رہنے والا اور طبابت میں ملکہ رکھتا تھا۔ جس دن شاہجہاں تخت نشیں ہوا، وہ پنج ہزاری ذات اور تین ہزار سوار کے منصب پر فائز ہوا۔ ''وزیر خاں'' کے لقب سے نوازے جانے کے ساتھ ہی علم، نقارہ اور ایک لاکھ روپیہ انعام میں پایا۔ ۱۰۴۴ء میں لاہور میں ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی جو آج بھی ''مسجد وزیر خاں'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ لاہور ہی کے نزدیک اس نے وزیر آباد آباد کیا۔ وہ لاہور کے قریب واقع چنیوٹ کا رہنے والا تھا چنانچہ اس نے چنیوٹ میں قصبے کے چاروں جانب ایک پختہ چہار دیواری، پختہ عمارتیں، بازاروں کے پختہ راستے، دکانیں، مساجد، سرائے، مدرسے، شفا خانے، کنویں اور تالاب بھی بنوائے۔ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں اس کا درد قلنج میں انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۶۲۷۔۶۴۷]

(۲۷) رائے سبھا چند = عہدِ شاہجہانی میں ۱۰۴۷ھ (۱۶۳۷ء) میں پانچ سو ذات اور اسی سوار کے منصب سے ترقی کرتے کرتے ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں دیوان لاہور، ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں سات سو ذات اور سو سوار کے منصب تک پہنچا۔ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں فوت ہو گیا۔

["The Apparatus of Empire"]

(۲۸) بہاری مل = عہدِ شاہجہانی میں ترقی کر کے دارالسلطنت لاہور کا دیوان مقرر رہا۔ بارہویں سال جلوس شاہجہانی میں صوبہ ملتان کی دیوانی پر تبدیل ہو گیا۔ اس کے بعد خالصہ شاہی کا دیوان نائب (دوم وزیرِ اعظم) مقرر رہا۔ پندرہویں سال جلوس شاہجہانی میں کل صوبہ پنجاب کی دیوانی پر مقرر رہا۔ اس کے بعد اس کی ملازمت شاہزادہ دارا شکوہ کی سرکار میں منتقل ہو گئی اور شہزادوں کی سرکار کا دیوان مقرر رہا۔ بیسویں سال جلوس شاہجہانی میں پھر

سے شاہی ملازمت میں واپس آ کر منصب ہزاری ذات وصد و پنجاہ سوار سے ممتاز ہوا۔

[''قاموس المشاہیر'' (جلد اوّل) ص ۱۴۰]

(۲۹) **محمد شریف** = ایران سے عہد جہانگیری میں ہندوستان آیا۔ ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) میں ''معتمد خاں'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ شاہجہاں کی خیر خواہی میں مشہور تھا اس لئے شاہجہاں کے برسرِ اقتدار آتے ہی عروج حاصل کیا۔ ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۱۲۳ تا ۱۲۴]

(۳۰) **دوست کام** = عہدِ شاہجہانی میں پانچ سو ذات اور اسّی سوار کے منصب سے ترقی کر کے آٹھ سو ذات اور دو سو سوار کے منصب پر پہنچا نیز مختلف مقامات پر بخشی اور واقعہ نویس رہا جیسے ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) میں لاہور، ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) میں بنگال، ۱۰۵۷ھ (۱۶۴۷ء) میں گجرات، ۱۰۶۳ھ (۱۶۵۲ء) میں مالوہ، ۱۰۶۴ھ (۱۶۵۳ء) میں احمد آباد اور ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۷ء) میں بنگال وغیرہ۔

["The Apparatus of Empire"]

(۳۱) **غیرت خاں** = اصل نام خواجہ کامگار تھا، اور عبداللہ بہادر فیروز جنگ کا بھتیجا تھا۔ ۱۰۳۹ھ (۱۶۲۹ء) میں ایک ہزاری ذات اور ۴۰۰ سوار کے منصب پر فائز ہوا۔ ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۱ء) میں منصب میں اضافہ کے ساتھ بادشاہ نے ''غیرت خاں'' کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۸۵۸۔۸۶۰]

(۳۲) **اعظم خاں کوکہ** = اصل نام مظفر حسین تھا اور خانِ جہاں بہادر کوکلتاش کا چھوٹا بھائی تھا۔ ۹ ربیع الآخر ۱۰۸۹ھ (۲۱ مئی ۱۶۷۸ء) کو اس کا ڈھاکہ میں انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (انگلش ترجمہ) جلد اوّل ص ۳۱۱ تا ۳۱۴]

(۳۳) **سعید خاں بہادر ظفر بیگ** = وہ امیر غیاث الدین خان جو امیر تیمور کے سرداروں میں سے ایک تھا، کی اولاد سے نیز شجاعت و دلیری و حسنِ تدابیر اور دانشمندی میں بے مثال تھا۔ جہانگیر کے عہد میں کابل میں تعینات رہا۔ شاہجہاں کے عہد میں دو ہزاری منصب سے ترقی کرتا کرتا سہ ہزاری ذات اور دو ہزار سوار کے منصب کے علاوہ کئی صوبوں میں صوبیدار رہا۔ ۲ صفر المظفر ۱۰۶۲ھ [۴ جنوری ۱۶۵۲ء] کو اس کا انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۴۳۴۔۴۴۰]

(۳۴) مہیش داس راٹھور = راجہ سورج سنگھ کا بھتیجا اور دلپت سنگھ کا لڑکا تھا۔ ابتداً مہابت خاں خانخاناں کے یہاں نوکری کی اور بہادری دکھائی۔ خان مذکور کے انتقال کے بعد ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں شاہی ملازمت اختیار کر لی اور ۵۰۰ ذات اور ۴۰۰ سوار کا منصب ملا۔ اس کے بعد لگاتار ترقی کرتا چلا گیا۔ ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء) میں انتقال ہوگیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۳۷۵، ۳۷۶]

(۳۵) بہادر خان باقی بیگ = ابتداً وہ شہزادہ داراشکوہ کا نجی ملازم تھا۔ ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں دو ہزاری ذات اور ۵۰۰ سوار کے منصب کے ساتھ ساتھ ''عزت خاں'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) میں وہ شاہی لشکر میں شامل ہوگیا۔ ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۲ء) میں چار ہزاری ذات اور ۲۵۰۰ سوار کے منصب کے ساتھ ''بہادر خاں'' کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ [''مآثر الامراء'' جلد اول (انگلش ترجمہ) ص ۳۳۸ تا ۳۴۰]

(۳۶) سید عزت خاں عبدالرزاق گیلانی = ابتداً شہزادہ داراشکوہ کا متوسل تھا۔ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں شہزادہ کی سفارش پر ''غیرت خاں'' کا خطاب ملا۔ ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں بہادر خاں کی جگہ لاہور کی حفاظت پر مامور ہوا۔ جب سموگڑھ کے مقام پر داراشکوہ اورنگ زیب سے شکست کھا کر لاہور، اور پھر وہاں سے بھی ملتان فرار ہوگیا تو وہ شہزادہ مذکور کا ساتھ چھوڑ کر اورنگ زیب سے جا ملا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۴۷۸]

(۳۷) باقی بیگ = ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں ایک ہزار ذات اور چار سو سوار کے منصب سے ترقی کرتا کرتا ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) تک چار ہزار ذات اور دو ہزار پانچ سو سوار کے منصب تک پہنچا اور اس دوران ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں نائب صوبیدار الہ آباد، گجرات: ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۰ء) میں حارث احمد آباد، نائب صوبیدار گجرات: ۱۰۶۷ھ (۱۶۵۶ء) میں نائب صوبیدار لاہور اور ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں نائب صوبیدار بہار رہا۔ نیز ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) میں ''غیرت خان'' اور ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) میں ''بہادر خان'' کے خطابات سے نوازا گیا۔ ["The Apparatus of Empire"]

(۳۸) مہابت خان محمد ابراہیم = وہ ایرانی النسل اور دکنی (حیدر آباد) تھا۔ عالمگیری عہد

میں سات ہزار ذات اور چھ ہزار سوار کے منصب پر فائز رہا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۸۱۵؛ "The Mughal Nobility Under Aurangzeb"]

(۳۹) **خان جہاں بہادر ظفر جنگ** = اس کا نام میر ملک حسین اور اس کے والد کا نام میر ابوالمعالی خوافی تھا۔ ۱۹؍ جمادی الاول ۱۱۰۹ھ (۲۳ نومبر ۱۶۹۷ء) کو اس کا انتقال ہوا۔

[''مآثر الامراء'' (انگریزی ترجمہ) جلد اوّل ص ۸۳۷-۹۰]

(۴۰) **مظفر حسین کوکہ** = اس کی زیرِ نگرانی لاہور کی بادشاہی مسجد تعمیر ہوئی۔

(۴۱) **محمد امین خان** = معظم خاں میر جملہ اردستانی کا لڑکا تھا۔ ابراہیم خاں کی جگہ پر لاہور کا صوبیدار مقرر ہوا۔ ۸؍ جمادی الآخر ۱۰۹۳ھ (۴؍ جون ۱۶۸۲ء) کو احمد آباد میں اس کا انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۵۰۹-۵۱۴]

(۴۲) **قوام الدین خاں اصفہانی** = وہ ایران کے مشہور وزیر اعظم، خلیفہ سلطان کا بھائی تھا۔ جب بھائی وزیر اعظم ہوا تو وہ بھی ایران کی صدارت کے منصب پر فائز ہو گیا جو اس ملک کا بہترین منصب تھا لیکن بعد میں سب کچھ چھوڑ کر ہندوستان آ گیا اور ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴ء) میں عالمگیر کی ملازمت میں حاضر ہوا۔ ۱۰۹۱ھ (۱۶۸۰ء) میں اس کی جگہ شہزادہ محمد اعظم شاہ لاہور کا صوبیدار مقرر ہوا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۹۶ تا ۱۰۱ اور ۶۴۸]

(۴۳) **لطف اللہ خاں** = وہ جملۃ الملک سعد اللہ خاں (وزیر اعظم شاہجہاں بادشاہ) کا فرزند، لاہور کے مضافاتی علاقے، چنیوٹ کا رہنے والا اور انصاری النسب تھا۔ (تفصیل کے لئے احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' کی جلد اوّل ''تاریخ دودمانِ عالی'' ملاحظہ فرمائیں۔) جب والد کا انتقال ہوا تو اس کی عمر محض گیارہ سال تھی۔ شروع میں اس کو ۷۰۰ ذات اور ۱۰۰ سوار کا منصب مرحمت ہوا۔ اس کے بعد عہدِ عالمگیری میں اس نے بہت ترقی کی۔ جب شہزادہ محمد اعظم صوبیدار لاہور ہوا تو اس کو شہزادہ کا نائب مقرر کیا گیا۔ ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۲ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۱۴۷ تا ۱۵۲]

(۴۴) **کامگار خاں** = جعفر خاں کا دوسرا لڑکا تھا۔ عالمگیر کی سلطنت کے آغاز میں اسے مناسب منصب ملا۔ ۱۰۷۵ھ (۱۶۶۴ء) میں ایک ہزاری ذات اور دو سو سوار کے منصب کے ساتھ ''خان'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۱۳۷ تا ۱۳۸]

(۴۵) **خلیل اللہ خاں** = جس سال عالمگیر، شجاع سے مقابلے کے ارادے سے ملتان سے واپس ہوا، اسی سال خلیل اللہ خاں کو لاہور کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۵۱۳]

(۴۶) **میر محمد کاظم خاں** = صاحبِ ''مآثر الامراء'' کا دادا اور میرک معین الدین امانت خاں کا فرزند تھا۔ ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۳ء) میں انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد سوم ص ۵۹۲ تا ۵۹۸]

(۴۷) **صمصام الدولہ شاہنواز خاں** = اصل نام میر عبدالرزاق تھا۔ خواف کے سیّد خاندان سے تھا۔ اکبر کے عہد میں اس کے بزرگ، میر کمال الدین خواف سے ہندوستان وارد ہوئے اور شاہی ملازمت اختیار کر لی۔ میر کمال الدین کے فرزند، میرک حسین جہانگیر کے عہد میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے اور میرک حسین کے فرزند، میرک معین الدین کو شاہجہاں کے عہد میں ''امانت خان'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ عالمگیر کے عہد میں وہ لاہور، ملتان اور کابل کا دیوان مقرر ہوا۔ وہ ۹ رمضان ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) کو لاہور میں پیدا ہوا، نشوونما اورنگ آباد (دکن) میں ہوئی اور ۳ رمضان ۱۱۷۱ھ (۱۱ مئی ۱۷۵۸ء) کو شہید کر دیا گیا۔ شاہ نورؒ کے مزار کے متصل اورنگ آباد (دکن) میں قبر واقع ہے۔

[''مآثر الامراء'' (انگریزی ترجمہ) جلد اوّل ص ۱۲ تا ۴۴]

(۴۸) **اللہ یار خاں** = ترکی النسل اور خاندان برلاس سے تھا۔ عہدِ عالمگیری میں صوبیدار لاہور، ٹھٹھہ اور ملتان رہا۔ اس کے بعد غزنی کی فوجداری پر تقرر ہو گیا۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد اوّل ص ۴۷]

(۴۹) **احمد یار خاں** = اللہ یار خاں کا لڑکا تھا۔ عالمگیر کے عہد کے آخر میں صوبیدار لاہور رہا۔ بہت نازک خیال شاعر تھا۔ کئی نظمیں لکھیں۔ ۲۳ رجمادی الاوّل ۱۱۴۷ھ (۲۱ ستمبر

۱۷۳۴ء) کو وفات پائی۔ [''قاموس المشاہیر'' جلد اوّل ص ۷۴]

(۵۰) سیف الدولہ عبدالصمد خاں = وہ خواجہ عبیداللہ احرار کی اولاد سے، خواجہ عبدالکریم کا لڑکا، خواجہ زکریا کا بھتیجا و داماد نیز اعتماد الدولہ محمد امین خاں کا ہم زلف تھا۔ عالمگیر کے عہد میں ہندوارد ہوا اور ۴۰۰ کے منصب پر فائز ہوا۔ بہادر شاہ اوّل کے عہد میں ۷۰۰ کے منصب پر پہنچا۔ فرخ سیر کے عہد میں پانچ ہزاری ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب، ''دلیر جنگ'' کا خطاب اور لاہور کی صوبیداری پر فائز ہوا۔ بعد میں سکھوں کی بغاوت کے قلع قمع کرنے پر سات ہزاری ذات اور سات ہزار سوار کے منصب کے ساتھ ''سیف الدولہ'' کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ [''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۵۱۷ تا ۵۲۰]

(۵۱) زکریا خاں [المعروف بہ سیف الدولہ بہادر ہزبر جنگ] = وہ عبدالصمد خاں کا فرزند اور اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کا بہنوئی تھا۔ والد کے بعد وہ صوبیدار لاہور مقرر ہوا۔ اس کا حسنِ انتظام اور عدل گستری مشہور ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں جب ۱۷۳۹ء میں فارس کے حکمراں، نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تو وہ خود اس مقابلے کی قوت نہ دیکھ کر نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ ۱۲ر جمادی الثانی ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) کو اس کا انتقال ہو گیا۔
[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۱۰۳ تا ۱۰۴]

(۵۲) شہ نواز خاں = وہ زکریا خاں بن عبدالصمد خاں کا لڑکا تھا۔ ۱۲ر جمادی الثانی ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) کو باپ کے انتقال کے بعد اس کی جگہ پر صوبیدار لاہور مقرر رہا۔
[''قاموس المشاہیر'' جلد اوّل ص ۲۵۷]

(۵۳) معین الملک = وہ قمر الدین خاں وزیر الملک کا فرزند تھا۔ تفصیلات ص...... پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۴) میر مومن = تفصیلات ص ۱۴۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۵) میر منعم = تفصیلات ص ۱۴۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۶) تیمور شاہ = تفصیلات ص ۱۴۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۷) آدینہ بیگ خاں = چنو آریہ کا لڑکا تھا۔ لاہور کے نزد واقع سرک پور میں پیدا ہوا اور مغلیہ خاندان میں پرورش پائی نیز فنِ حساب میں ماہر تھا۔ ۱۷۵۸ء میں افغانوں کو لاہور کے نزدیک شکست دی۔ ہوشیار پور کے نزد واقع خان پور میں مرا اور کوئی جانشین نہیں چھوڑا۔ اس کا شاندار مقبرہ اب تک موجود ہے۔ [''قاموس المشاہیر'' (حصہ اوّل) ص ۶]

(۵۸) رنجیت سنگھ = تفصیلات ص ۵۰ اپر ملاحظہ فرمائیں۔

(۵۹) راجہ ٹوڈرمل = ذات کا کھتری تھا۔ وطن کی بابت اختلاف ہے۔ بعض قصبہ لاہرپور (ضلع سیتاپور) کا، تو بعض لاہور کا بتاتے ہیں۔ بیوہ ماں نے بہت تنگ دستی سے پرورش کی۔ شروع میں اکبر کے عام منشیوں میں داخل ہوا اور پھر اپنی قابلیت اور محنت سے ترقی کرتے کرتے وزارت کی مسند پر بیٹھ کر دیوانِ کل ہو گیا۔ ۹۹۳ھ (۱۵۸۵ء) میں چہار ہزاری منصب پر فائز ہوا۔ ۱۱ محرم الحرام ۹۹۸ھ (۱۰ نومبر ۱۵۸۹ء) کو ایک کھتری نے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ [''قاموس المشاہیر'' جلد اول ص ۱۵۹]

(۶۰) شیخ مبارک ناگوری = تفصیل احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' کی جلد سوم، ''منبع الاسرار'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۶۱) شاہ بیگ خان کابلی = عہدِ اکبری کا ایک امیر تھا۔ ۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء) میں اس کو جہانگیر نے ''خانِ دوراں'' کا خطاب عطا فرما کر کابل کا صوبیدار مقرر کیا۔ ۹۰ سال کی عمر میں ۱۰۲۹ھ (۱۶۱۹ء) میں لاہور میں انتقال ہوا۔ [''قاموس المشاہیر'' جلد اول ص ۲۰۸

(۶۲) اسد خاں ماموری = عبدالوہاب خاں عنایتی کا لڑکا اور مظفر خاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ عہدِ جہانگیری میں صوبہ دار قندہار ہوا اور دوسرے سال جلوس شاہجہانی میں لکھی جنگل (سندھ) کا فوجدار مقرر رہا۔ [''مآثر الامراء'' جلد اول (انگلش ترجمہ) ص ۲۶۹]

(۶۳) خواجہ ابوالحسن تربتی = تربت، خراساں کا ایک ضلع ہے۔ اسی نسبت سے تربتی کہلایا۔ ۱۶۱۳ء میں میر بخشی ہوا اور اعتمادالدولہ کے انتقال پر چیف دیوان بنا اور پانچ ہزاری منصب ملا۔ ۷۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

[''مآثر الامراء'' جلد اول (انگلش ترجمہ) ص ۱۲۸ تا ۱۳۰]

(۶۴) صف شکن خاں مرزا لشکری = سید یوسف خاں رضوی کا لڑکا تھا۔ والد کے انتقال پر تھانیداری پر مقرر رہا اور جہانگیر کے عہد میں ''صفدر خاں'' کا خطاب ملا اور صوبہ بہار کے جاگیرداروں میں شامل ہوا۔ چھٹے سال جلوس جہانگیری میں صوبہ دار کشمیر مقرر ہوا۔ عہد شاہجہانی میں ''صف شکن خاں'' کے خطاب سے نوازا گیا۔

[''مآثر الامراء'' جلد اول (اردو ترجمہ) ص ۳۰ ۷ تا ۳۲ ۷]

(۶۵) خانِ جہاں بارہہ = اصل نام سید مظفر تھا جو بارہہ ضلع مظفر نگر کا رہنے والا اور چھ ہزاری دار تھا۔ بعہدِ شاہجہانی لاہور میں ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں انتقال ہوا۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد اول ص ۲۰۹]

(۶۶) خانِ دوراں نصرت جنگ = لاہور سے ۴ کلومیٹر مشرق میں واقع چنتا گڑھ میں مقبرہ واقع تھا۔

(۶۷) علی مردان خاں = گردوں کے قبیلے سے اور گنج علی خاں (م ۱۶۲۵ء) کا لڑکا تھا۔ گنج علی خاں، شاہ ایران کی طرف سے کرمان کا حاکم رہا۔ وہ شاہ کی طرف سے قندہار کا صوبیدار مقرر ہوا لیکن بعد میں شاہ کے ظلم سے فرار ہو کر دہلی آ گیا۔ ۱۶۳۹ء میں اسے ہفت ہزاری ذات اور ہفت ہزار سوار کا منصب اور کشمیر کی صوبیداری کے ساتھ ساتھ پنجاب کی صوبیداری بھی عطا ہوئی ۱۶۴۲ء میں ''امیر الامراء'' کے خطاب کے ساتھ ساتھ ایک کروڑ دام اور لاہور میں اعتقاد خاں کی حویلی عنایت ہوئی۔ چھیواڑہ کے مقام پر ۱۶/اپریل ۱۶۵۷ء [۱۲/رجب ۱۰۶۷ھ] کو انتقال ہوا لیکن سپردِ خاک لاہور میں والدہ کے مقبرہ میں ہوا۔

[''قاموش المشاہیر'' (جلد دوم) ص ۹۲؛ ''مآثر الامراء'' جلد اوّل (انگلش ترجمہ) ص ۱۸۹ تا ۸۰۱]

(۶۸) ظفر خاں احسن اللہ = خواجہ ابوالحسن تربتی کا لڑکا تھا۔ جب انیسویں صدی سال جلوس جہانگیری میں اس کے والد کو کابل کی صوبیداری ملی تو وہ باپ کی نیابت میں وہاں کی حکومت پر مقرر ہوا نیز ۱۵۰۰ ذات اور ۶۰۰ سوار کے منصب کے ساتھ ''ظفر خاں'' کے خطاب، علم، خنجر، شمشیر مرصع اور ہاتھی مرحمت ہوا۔ وہ پستہ قد لیکن عقل و تدبیر کے اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء) میں لاہور میں انتقال ہوا اور والد کے مقبرہ میں دفن ہوا۔

[''مآثر الامراء'' جلد دوم (اردو ترجمہ) ص ۷۵۱ تا ۷۵۸]

(۶۹) ملّا علاء الملک تُونی [المخاطب بہ فاضل خاں] = وہ طبیعی اور ریاضی علوم میں یکتائے زمانہ تھا، خاص طور سے علمِ ہیئت اور نجوم میں۔ ساتویں سال جلوس شاہجہانی میں وہ ایران سے ہندوستان آیا اور نواب آصف جاہی سے وابستہ ہو گیا اور بحیثیت مصاحب اس کے ساتھ رہنے لگا۔ نواب کے انتقال کے بعد پندرہویں سال جلوس شاہجہانی میں وہ بادشاہی ملازمت میں شامل ہو گیا اور

۵۰۰ ذات اور ۵۰ سوار کا منصب ملا۔ دوسرے سال جلوس عالمگیری میں اسے ۴۰۰۰ ذات اور دو ہزاری سوار کا منصب ملا۔ اور پانچویں سال عالمگیری میں پانچ ہزاری منصب ملا۔

[''مآثر الامراء'' جلد سوم (اردو ترجمہ) ص ۴۴۰ تا ۴۴۳]

(۷۰) پشوتن = شیخ عبدالرحمٰن الملقب بہ ''افضل خاں'' بن ابوالفضل کا لڑکا تھا۔ نام اکبر بادشاہ نے رکھا تھا۔ شیخ حبیب اللہ کی دعاؤں سے پیدا ہوا تھا۔ (تفصیل احقر کی کتاب ''سید عبدالرحمٰن بن فضل اللہ'' میں ملاحظہ فرمائیں۔)

(۷۱) ستی النساء = ملک الشعراء طالب آملی کی بہن تھی۔ عہدِ جہانگیری میں بھائی سے ملنے ایران سے ہندوستان آئی۔ شادی نصیرائی کاشی جو مرزا صائب کا استاد اور مسیح کاشی کا بھائی تھا، سے ہوئی تھی۔ نصیرائی کی وفات کے بعد ممتاز محل کی پیش خدمت مقرر ہوئی۔ نہایت قابل، خوش تقریر اور فنِ قرأت کی ماہرہ تھی اور خانہ داری کا خاص سلیقہ رکھتی تھی۔ علم طب میں بھی مہارت تھی۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر جہاں آرا کی معلّمہ مقرر ہوئی۔ ممتاز محل کے انتقال کے بعد شاہجہاں نے اس کو حرم شاہی کا مدار المحام مقرر کر دیا تھا۔ انتقال لاہور میں ہوا لیکن شاہجہاں نے آگرہ میں دفن کرایا۔ ممتاز محل کی قبر سے مغرب کی سمت میں، جلو خانے کے متصل مقبرہ واقع تھا جو تیس ہزار روپیہ کی لاگت سے شاہجہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ اور ایک گاؤں بھی مقبرے کے اخراجات کے لئے عطا کر دیا تھا۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد اوّل ص ۲۶۵]

(۷۲) فاضل خاں = عالمگیر کا وزیر تھا جو ۱۱/ ذیقعدہ ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء) کو خلعتِ وزارت سے سرفراز ہوا۔ وہ نام ہی کا نہیں بلکہ فی الحقیقت فاضلِ اجل اور جامع علومِ دینی و دینوی تھا۔ خاص کر علمِ نجوم میں اسے کامل دستگاہ تھی۔ منصبِ وزارت پر سرفراز ہونے سے سولہ روز بعد ہی پیامِ اجل آیا اور ۲۷/ ذیقعدہ کو فوت ہو گیا۔ اس نے لاہور میں جو پہلے ہی سے مقبرہ تعمیر کرایا ہوا تھا، اسی میں دفن ہوا۔

[''قاموس المشاہیر'' جلد دوم ص ۱۰۷]

''تمام ہندوستان پر انوار و تجلّیات کی بارش **لاہور** سے ہو رہی ہے۔''
[حضرت مجدد الف ثانیؒ]

[۳] لاہور کے چند معروف صوفیا کرام

(۱) جن کے مزارات پر حاضری ممکن ہوسکی

سرحلقۂ جملہ اقطاب، محرم از جمیعِ ابواب، معشوق بہ اوصافِ معنوی

شیخ علی بن عثمان بن علی الجلابی الغزنویؒ

[المعروف بہ داتا گنج بخش علی ہجویریؒ] [م ۴۶۴ھ (۱۰۷۱ء) ۱۵ر صفر المظفر بروز یکشنبہ]

آپ کے والد بزرگوار کا نام شیخ ابو علی عثمانؒ (ہجویری جلابی غزنوی) تھا جو افغانستان کے مشہور شہر غزنی کے رہنے والے تھے۔ ایک دوسرے قول کے مطابق آپ کے آبا و اجداد غزنی کے قریب واقع قصبہ حُصر کے رہنے والے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کو پیر حصریؒ بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کی کنیت ابوالحسن اور لقب داتا گنج بخش ہے۔ آپ کی والدہ سیدنا حضرت امام حسینؓ کی اولاد سے اور ایک ولیہ خاتون تھیں جن کا مزارِ مبارک غزنین میں واقع اور مرجعِ خلائق ہے۔ آپ کے ماموں بھی ایک ولی اللہ گزرے ہیں جو شیخ تاج اولیاءؒ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کا مزارِ مبارک بھی غزنین میں زیارت گاہِ خلق ہے۔ مذکورہ دونوں مزارات باہم متصل ہیں۔ شہزادہ دارا شکوہ اپنے والد، شہنشاہ شاہجہاں کے ہمراہ ان مزارات پر حاضری دے آیا ہے۔ آپ کے والد سیدنا حضرت امام

حسنؒ کی اولاد سے اور صوفی منش انسان تھے۔ اس طرح آپ خاندانی اعتبار سے حسنی۔ حسینی سیّد ہوئے۔

کہتے ہیں کہ جلاب اور ہجویر، غزنی شہر کے دو مشہور محلوں کے نام ہیں۔ آپ پیدا تو جلاب میں ہوئے لیکن خاندان کے ہجویر میں نقلِ مکانی کر جانے پر پرورش ہجویر میں ہوئی۔ اس لئے آپ کے نام کے ساتھ جلابی یا ہجویری الفاظ لگائے جاتے ہیں۔

آپ کی سنہ ولادت کے بارے میں محققین کے درمیان اختلافِ رائے ہے جو ۳۸۱ھ (۹۹۱ء) سے ۴۰۱ھ (۱۰۱۰ء) کے درمیانی عرصے میں بتایا جاتا ہے۔ زیادہ تر کا اتفاق ۴۰۰ھ (۱۰۰۹ء) پر ہے۔

آپ ایک جید عالم و عارف اور صاحبِ صحو (۱) بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ نے فرمایا "میرے شیخ "جنیدی" مسلک رکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ سُکر (۲) بچوں کا کھیل ہے جب کہ صحو مردوں کا کارنامہ۔ میں اپنے شیخ کے قدم بہ قدم ہوں کہ صاحبِ سُکر کمالِ حال صحو ہوتا ہے اور ادنیٰ درجہ صحو کا، دیدار سے محرومی ہے کیوں کہ بشریت کا حجاب غالب ہے۔ پس وہ صحو جو آفت معلوم ہو، وہ عین سُکر سے بدرجہا بہتر ہے۔" آپ امامِ اعظم ابو حنیفہ کوفیؒ کے پیرو اور شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی الجنیدیؒ (۳) کے مرید تھے اور آپ نے شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ (۴)، شیخ ابوالقاسم قشیریؒ (۵) اور شیخ ابوالقاسم گورگانیؒ (۶) وغیرہ متعدد بزرگوں سے ملاقاتیں کیں اور ان کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔ آپ خواجہ احمد حمّاد سرخسیؒ (۷) اور خواجہ ادیب کمندیؒ (۸) کے ہم عصر تھے۔

آپ کے خوارق و کرامات بے شمار ہیں۔ بارہا آپ نے تجرید و توکّل پر سفر کیا۔ کافی سیر و سیاحت کے بعد، مصائب و مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آپ سلطان مسعود ابن محمود غزنوی (۹) کے آخیر عہدِ حکومت [سلطان مسعود کو ۴۳۳ھ میں قتل کر دیا گیا تھا۔ اس نے ۹ سال ۹ ماہ حکومت کی۔ اس طرح اس کا دورِ حکومت ۴۲۳ھ تا

۴۳۳ھ بیٹھتا ہے۔] میں [۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء) میں] دو ساتھیوں، حضرت ابو سعیدؒ اور حضرت سید حمادؒ کے ہمراہ لاہور وارد ہوئے (۱۰) اور وہاں کی سکونت اختیار کر لی۔ اُن دنوں سرزمینِ لاہور بد ترین حالات سے دوچار تھی۔ ہر طرف بدعقیدگی، بت پرستی، شعبدہ بازی اور جادوگری کا دور دورہ تھا۔ گرچہ آپ سے پہلے سید فخر الدین حسین زنجانیؒ اور سید اسمٰعیل بکاریؒ (۱۱) جن کا شمار اکابر محدثین و مفسرین میں سے ہوتا ہے، ۳۹۶ھ (۱۰۰۵ء) میں لاہور تشریف لا چکے تھے اور جن کی مجلسِ وعظ میں سامعین کا ہجوم ہوتا تھا اور ہر روز صدہا مشرکین خلعتِ اسلام سے مشرف ہوتے تھے، لیکن لاہور اور علاقے کو اسلام کا مرکز اور مضبوط قلعہ بننا آپ ہی کی شبانہ روز محنت اور مساعی جمیلہ سے نصیب ہوا۔ آپ کی برکت سے اس علاقے میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ آپ کے کمالات آج تک اظہر من الشمس ہیں۔ لاہور میں آپ نے ایک مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا اور کچھ عرصے تک درس دیتے رہے۔ اس کے بعد تصنیف (۱۲) و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ آپ کی تبلیغ کی بدولت بہت سے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ انھیں میں سے ایک رائے راجو بھی تھا جو سلطان مودود ابن مسعود غزنوی [۴۳۱ھ تا ۴۴۱ھ] کی طرف سے لاہور کا نائب تھا۔ اس کا نام اسلام قبول کر لینے کے بعد آپ نے شیخ ہندیؒ رکھ دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ کے مزار شریف کے خدام و مجاور اسی کی نسل سے ہیں۔

آپ سماع کے سخت مخالف تھے (۱۳) کہتے ہیں کہ آپ صاحبِ اشعار بھی تھے۔ بقول صاحبِ ''آبِ کوثر'' آپ کا کوئی دیوان یا باضابطہ کلام تو دستیاب نہیں البتہ نثر کی کتابوں میں چند اشعار مل جاتے ہیں، جیسے ۔

''اشتیاقت روز و شب دارم دِلا	عشقِ تو دارم نہاں و برملا
جاں بخواہم داد اندر کوئے تو	گر مرا آزار آید یا بلا
سوزِ تو دارم میانِ جان و دل	میدہم از عشقِ تو ہر سو صدا

دلبرا از تو ہمے خواھم لقا　　کُن تو ''آرے'' ومکن ہرگز تو ''لا''

اے علی تو فرخی درشہر و گو　　دِہ ز عشق خویشتن ہر سو صلا''

صاحب ''گلزارِ ابرار'' نے ''کشف المحجوب'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ نے اپنے کلام کا ایک دیوان ترتیب دیا تھا جس کی غزلوں کے مقطع میں تخلص نہیں کہا گیا تھا۔ چنانچہ ایک بدنیت نے ان غزلیات میں اوّل تا آخر اپنا تخلص داخل کردیا تھا۔

آپ کی ازدواجی زندگی سے متعلق تصویر واضح نہیں البتہ ''کشف المحجوب'' کے مطالع سے ضرور اس ضمن میں کچھ روشنی پڑ جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا: (ترجمہ) ''گیارہ سال تک حق تعالیٰ نے مجھے شادی کی آفت سے بچائے رکھا۔ پھر تقدیر سے میں آزمائش میں ڈالا گیا۔ میرا ظاہر و باطن ایک پری صفت کا اسیر ہوا۔ بغیر اس کے کہ میں نے اسے دیکھا ہو، ایک سال تک میں اس کے خیالات میں غرق رہا۔ قریب تھا کہ یہ چیز میرے دینی معاملات میں خلل انداز ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کمال لطف و فضل سے عصمت کو دل بیچارہ کے استقبال کے لئے بھیجا اور اپنی رحمت سے مجھے اس مصیبت سے نجات دلائی۔'' آپ نے اپنی تصانیف میں عورتوں کی خوب خبر لی ہے۔ لکھتے ہیں: (ترجمہ) ''بہشت میں سب سے پہلا فتنہ جو آدمؑ پر مقدر ہوا، اس کا اصل یہی عورت تھی۔ پہلے پہل جو فتنہ دنیا میں ظاہر ہوا، یعنی ہابیلؑ و قابیلؑ کی لڑائی، اس کا سبب بھی یہی ذاتِ شریف تھی اور جب خدا نے چاہا کہ دو فرشتوں (ہاروتؑ و ماروتؑ) کو سزا دے تو اس کا سبب بھی عورت ہی کو قرار دیا اور آج کے دن [یعنی ۵۶۵ھ (۱۱۶۹ء) کے قریب تک] دینی اور دنیاوی فتنوں کے تمام اسباب کا ذریعہ یہی عورتیں ہیں۔''

آپ کا وصال ۱۵رصفر المظفر بروز یکشنبہ ۴۶۴ھ (۱۰۷۱ء) کو ہوا۔ [اناللہ و

انا الیہ راجعون]۔

صاحب ''خزینۃ الاصفیاء'' نے ''علی سید ولی ہجویری'' ۴۶۴ھ، ''گنجینۂ اسرارِ محبوبی'' ۴۶۴ھ، ''حبیب اولیاء گنجینۂ نور'' ۴۶۴ھ، ''عالی قطب لاہور'' ۴۶۴ھ، ''گلشنِ دیں'' ۴۶۴ھ، ''پیر لاہوری'' ۴۶۴ھ سے آپ کا سنہ وصال نکالا ہے۔

آپ کا مزار شریف لاہور میں مرجعِ خلائق ہے۔ ہر جمعرات کو خاص طور سے ہزاروں عقیدت مند آپ کے روضۂ اطہر پر حاضری دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جو شخص چالیس جمعرات یا چالیس دن کامل آپ کے روضہ کا طواف کرلے، اللہ تبارک تعالیٰ اس کی ہر جائز مراد پوری کر دیتا ہے۔ احقر کو بھی حاضری کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔

آپ کی عظمت کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ الاسلام شیخ فرید الدین گنج شکرؒ، حضرت میاں میر قادری لاہوریؒ، حضرت حاجی نوشہ گنج بخش قادریؒ اور محدثِ کبیر حضرت شاہ محمد غوث قادری لاہوریؒ جیسے بزرگ آپ کے مزارِ مبارک پر معتکف رہ کر فیض حاصل کر چکے ہیں۔ خواجۂ بزرگ نے تو اپنی عقیدت مندی کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے۔

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

علامہ اقبالؒ نے آپ کی تبلیغی خدمات کا برملا اعتراف کرتے ہوئے جو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا اس کے چند اشعار پیش ہیں ؎

سید ہجویر مخدوم امم — مرقد او پیر سنجر را حرم
بند ہائے کوہسار آساں گسیخت — در زمین ہند تخم سجدہ ریخت
عہد فاروق از جمالش تازہ شد — حق ز حرف او بلند آوازہ شد
پاسبان عزت ام الکتاب — از نگاہش خانہ باطل خراب
خاک پنجاب از دم او زندہ گشت — صبح ما از مہر او تابندہ گشت

سلسلۂ نسب

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ [سنہ ۲۳ ق ھ (۵۹۹ء) - سنہ ۴۰ ھ (۶۶۰ء)]

۲۱/ رمضان المبارک، شب یکشنبہ

حضرت امام حسنؓ [سنہ ۲ ھ (۶۲۴ء) - سنہ ۵۰ ھ (۶۷۰ء)] نجف اشرف

۱۵/ رمضان المبارک ۴/ محرم الحرام، جنت البقیع

حضرت زیدؒ

حضرت حسین اصغرؒ (۱۴)

حضرت ابو الحسن علیؒ

حضرت شجاعؒ

حضرت عبد الرحمٰنؒ

حضرت سید علیؒ

حضرت عثمانؒ

حضرت ابو الحسن علی ہجویریؒ

[مزار شریف سے سرہانے کی جانب، چند گز کے فاصلے پر، ایک مقام کو مقامی لوگ "قرآن محل" کہتے ہیں۔ مذکورہ نسب نامہ ایک تختی پر کندہ متذکرہ "قرآن محل" میں آویزاں ہے۔]

سلسلۂ طریقت

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ [م ۴۰ھ (۶۶۰ء)]۲۱ر رمضان المبارک، شب یکشنبہ، نجف اشرف]

حضرت خواجہ حسن بصریؒ [م ۱۱۰ھ (۷۲۸ء) ۴ر محرم الحرام بروز سہ شنبہ، صحرائے بصرہ (قریب شہر)]

حضرت حبیب عجمیؒ [م ۱۵۶ھ (۷۷۲ء) ۱۷ر رجب المرجب بروز جمعہ، بغداد شریف کہنہ]

حضرت سلیمان داؤد بن نصیر طائیؒ [م ۱۶۵ھ (۷۸۱ء) ۲۸ر ربیع الاوّل، بغداد شریف]

حضرت اسد الدین معروف کرخیؒ [م ۲۰۰ھ (۸۱۵ء) ۲ر محرم الحرام بروز یکشنبہ، بغداد شریف کہنہ]

حضرت شیخ سری سقطیؒ [م ۲۵۳/۲۵۰ھ (۸۶۷/۸۶۴ء) ۳ر رمضان المبارک، بروز پنجشنبہ، بغداد شریف کہنہ، گورستان سونیریہ]

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ [م ۲۹۷ھ (۹۰۹ھ) ۵ر ربیع الاوّل بروز چہار شنبہ، بغداد شریف کہنہ]

حضرت شیخ ابوبکر شبلیؒ [م ۳۳۴ھ (۹۴۵ء) ۲۶ر ذی الحجہ بروز پنجشنبہ، بغداد شریف کہنہ]

حضرت شیخ ابوالحسن حُصریؒ [م ۳۷۱ھ (۹۸۱ء) ذی الحجہ بروز جمعہ، بغداد شریف کہنہ]

حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلیؒ [م ۴۶۰ھ (۱۰۶۷ء)]

حضرت شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ
[م ۴۶۴ھ (۱۰۷۱ء) ۱۰ر صفر المظفر]

سید فخر الدین حسین زنجانیؒ
[م ۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء) ۱۹ر شعبان المعظم]

شیخ ہندیؒ (روحانی)

سید شادی شاہ قادریؒ [م ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۵ء) لاہور]

سید شاہ غلام نبیؒ [م ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء)]

شیخ حسین لاہوریؒ [م ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) لاہور]

اشاریہ

(۱)،(۲) **صحو، سکر** = تفصیل کے لئے احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') ملاحظہ فرمائیں۔

(۳) **شیخ ابوالفضل بن حسن الختلیؒ** = آپ ختلان کے رہنے والے تھے اسی لئے ختلی کہلائے اور وصال بیت الجن میں ہوا جو عقبہ کے علاقے میں دمشق کے قریب ایک قصبہ ہے۔آپ علم تفسیر، روایات و آیات کے زبردست عالم تھے۔آپ کی کرامات بہت مشہور ہیں۔آپ ساٹھ سال تک گوشہ نشین رہے اور خلقت سے بھاگتے رہے یہاں تک کہ آپ نے اپنا نام تک گم کر دیا تھا۔آپ اکثر قبرستان میں رہتے تھے اور درویشانہ رسوم ولباس اختیار نہیں کرتے تھے۔چہرہ بہت بارعب وجلال تھا۔جس وقت ۴۶۰ھ (۱۰۶۷ء) میں آپ کا وصال ہوا سر داتا گنج بخشؒ کی گود میں تھا۔

حضرت داتا گنج بخشؒ ۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء) میں لاہور وارد ہوئے اور شیخ ابوالفضل کا وصال ۴۶۰ھ (۱۰۶۷ء) میں بیت الجن میں ہوا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ لاہور وارد ہونے کے بعد بھی حضرت شیخ ابوالفضلؒ کے پاس جاتے رہے تھے۔

(۴) **شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ** = تفصیلات احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') میں ملاحظہ فرمائیں۔

منقول ہے کہ ایک بار داتا گنج بخشؒ قصبہ مہنہ میں شیخ ابوسعید ابوالخیرؒ کے مزار کے پاس بیٹھے تھے کہ انھوں نے دیکھا کہ ایک کبوتر اڑتا ہوا آیا اور شیخ کے مزار کے غلاف کے نیچے چلا گیا۔جب داتاؒ نے غلاف اٹھا کر دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔دوسرے اور تیسرے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا تو داتاؒ متعجب ہوئے۔رات کو خواب میں جب داتاؒ نے شیخ سے یہ واقعہ بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ کبوتر میرے معاملہ کی صفائی ہے جو روزانہ میری قبر میں داخل ہوتی ہے۔ [''مرآۃ الاسرار'' (اردو ترجمہ) ص ۴۸۲]

(۵) **شیخ ابوالقاسم قشیریؒ** = تفصیلات احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم

(''منبع الاسرار'') میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۶) **شیخ ابوالقاسم گورگانیؒ** = تفصیلات احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') میں ملاحظہ فرمائیں۔

ایک بار حضرت داتا گنج بخشؒ نے **چند درویشوں کی موجودگی** میں شیخ ابوالقاسم گورگانیؒ سے پوچھا کہ درویش (۱۵) کے لئے کم از کم کیا ضروری ہے تاکہ فقر (۱۶) کا سزاوار ہو سکے۔ شیخ نے فرمایا کی تین چیزیں بہت ضروری ہیں۔ اول صحیح ٹکڑا سی سکے، دوئم صحیح بات کہہ اور سن سکے نیز سوئم صحیح قدم زمین پر رکھ سکے۔ اس کے بعد داتاؒ نے موجود درویشوں سے کہا کہ وہ فرداً فرداً اس موضوع پر کلام کریں۔ جب سب بول چکے تو حضرت داتاؒ نے فرمایا کہ صحیح ٹکڑا سینے کا مطلب یہ ہے کہ کپڑا فقر کے لئے سینے نہ کہ زینت کے لئے۔ جب کپڑا فقر کے لئے سیا جائے گا گرچہ وہ آگ بھی ہو، صحیح سیا جائے گا؛ صحیح سخن سے مراد ہے کہ اس کے اندر حال ہو نہ صرف قال، یعنی از روئے تحقیق ہو نہ از گمان، اور سخن وجدانِ حق سے خالی نہ ہو اور زندگی پر حاوی ہو، ریاکاری اور دکھاوا نہ ہو؛ صحیح قدم زمین پر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ وجد حق کے ساتھ گامزن ہو نہ کہ لہو و لعب کے ساتھ۔ داتاؒ کی اس تشریح پر شیخ نے فرمایا کی علیؒ نے بالکل درست کہا ہے۔ [''مرآۃ الاسرار'' (اردو ترجمہ) ص ۴۸۲]

(۷) **خواجہ احمد حماد سرخسیؒ** = آپ عابدانِ وقت اور مجاہدینِ وقت میں سے ہوئے ہیں۔ منقول ہے کہ ایک بار حضرت داتا گنج بخشؒ نے اُن سے اُن کی توبہ کی ابتداء کی بابت معلوم کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ایک بار میں سرخس سے اونٹ پر سوار ہو کر صحرا کی سمت گیا اور ایک مدت تک وہیں رہا۔ وہاں میں ہمیشہ بھوکا رہتا تھا اور اپنا کھانا دوسروں کو دے دیتا تھا۔ مجھے درویشوں سے بہت عقیدت تھی۔ ایک دن ایک شیر نے میرا ایک اونٹ مار ڈالا اور پہاڑی پر چڑھ کر آوازیں دینے لگا۔ اس کی آواز کو سن کر تمام جانور جمع ہو گئے۔ شیر نے اونٹ کو پھاڑا اور بنا کچھ کھائے پھر سے پہاڑی پر جا بیٹھا۔ تمام جانوروں نے پیٹ بھر کر اونٹ کھایا اور پھر وہاں سے چلے گئے۔ اس کے بعد شیر پہاڑی پر سے اترا اور اونٹ کو کھانے لگا کہ اسی دوران ایک لومڑی آئی۔ اسے دیکھ کر شیر پھر سے پہاڑی پر چلا گیا۔ لومڑی نے پیٹ بھر کر

اونٹ کھایا اور وہاں سے چلی گئی۔ تب شیر دوبارہ پہاڑی پر سے آیا اور اس نے بچا کھچا اونٹ کھایا۔ میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ جاتے وقت شیر نے فصیح زبان سے مجھ سے کہا ''اے احمد! کتوں کا ایثار لقمہ ہے اور مردوں کا ایثار جان ہے۔'' میں نے شیر سے یہ بات سنی تو تمام کاموں سے دست بردار ہو گیا۔

[''مرآۃ الاسرار'' (اردو ترجمہ) ص ۴۸۲؛ ''نفحات الانس'' (اردو ترجمہ) ص ۵۵۲]

(۸) **خواجہ ادیب کمندیؒ** = آپ بیس سال تک کھڑے رہے اور نماز میں تشہید (التحیات) کے سوا کبھی نہ بیٹھے۔ پوچھنے پر آپ نے فرمایا کہ ابھی میں اس منزل اور مرتبہ پر نہیں پہنچا کہ خداوندِ قدوس کے مشاہدے میں بیٹھا کروں۔

[''مرآۃ الاسرار'' (اردو ترجمہ) ص ۴۸۳؛ ''نفحات الانس'' (اردو ترجمہ) ص ۵۵۳]

(۹) **سلطان مسعود ابن محمود غزنوی** = سلطان کو ۴۳۳ھ (۱۰۴۱ء) میں قتل کر دیا گیا۔ اس نے ۹ سال ۹ ماہ حکومت کی۔ تفصیلات احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد چہارم (''تذکرۂ جہانیاں'') میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۰) آپ اپنے دوستوں (پیر بھائیوں) حضرت ابو سعیدؒ اور حضرت سید حماد لطفیؒ کے ہمراہ لاہور میں وارد ہوئے اور پہلی شب لاہور کے شمال میں دریائے راوی کے کنارے بسر کی۔ صبح کو لاہور شہر میں داخل ہوئے۔ اسی دن حضرت سید حسین زنجانیؒ، قطب لاہور کا وصال ہو گیا۔ چنانچہ ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت فرمائی۔ اس کے بعد شہر کے مغربی حصہ میں تشریف لے جا کر اسلامی پرچم نصب کر کے فرمایا کہ یہ پرچم اسی طرح اس سرزمین پر انشاء اللہ لہراتا اور سایہ فگن رہے گا۔ [اب دریائے راوی اپنے پرانے مقام سے کافی ہٹ چکا ہے۔]

(۱۱) **علامہ سید اسمٰعیل بکاریؒ** = لاہور اور خطۂ پنجاب میں سب سے پہلے جس مبلغِ اسلام کا نام آتا ہے وہ علامہ سید اسمٰعیلؒ کا ہے۔ آپ سلطان محمود غزنوی کے عہدِ حکومت [۳۸۶ھ تا ۴۲۱ھ] میں غالباً ۳۹۶ھ (۱۰۰۵ء) میں لاہور وارد ہوئے تب لاہور پر ایک ہندو راجہ حکومت کرتا تھا اور سلطان محمود کو خراج دیتا تھا۔

آپ علومِ ظاہری اور باطنی، دونوں میں دسترس رکھتے تھے۔ آپ کی مجلس وعظ میں سامعین کا ایک اژدہام ہوتا تھا اور ہر روز صدہا مشرکین بگوشۂ اسلام ہوتے تھے۔

۴۴۸ھ (۱۰۵۶ء) میں وصال ہوا۔ مزار شریف لاہور میں واقع ہے ''فقیر محبوب'' (۴۴۸ھ) اور ''پیرو جیہہ اسماعیل'' (۴۴۸ھ) سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

[''خزینۃ الاصفیاء'' ص ۸۸۴، ''آب کوثر'' ص ۸۴]

(۱۲) حضرت داتا گنج بخشؒ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مثلاً ''کشف المحجوب''، ''کشف الاسرار''، ''منہاج الدین''، ''البیان الاہل العیان'' وغیرہ وغیرہ۔ یہ کتابیں اس وقت لکھی گئیں جب تصوف کی مشہور کتابیں مثلاً شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی ''عوارف المعارف'' اور شیخ ابن العربیؒ کی ''فصوص الحکم'' نہیں لکھی گئی تھیں۔ [''آب کوثر'' ص ۸۷]

''کشف المحجوب'' آپ نے اپنے رفیق شیخ ابوسعید ہجویریؒ کی خواہش پر لکھی تھی۔ شیخ ابوسعیدؒ آپ کے ہمراہ غزنیؒ سے لاہور تشریف لائے تھے۔ ''کشف المحجوب'' کے بارے میں سلطان المشائخ حضرت نظامؒ الدین اولیاءؒ کا فرمانا ہے کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو اس کو چاہئے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرے۔ اس کی برکت سے اسے مرشد مل جائے گا۔

(۱۳) **سماع** :۔ تفصیل احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') میں ملاحظہ فرمائیں۔

منقول ہے کہ کرمانؒ میں ایک دفعہ حضرت داتا گنج بخشؒ شیخ ابواحمد مظفرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سفر کے کپڑے تھے اور پریشان حال تھے۔ شیخ نے ان سے پوچھا کہ اے ابوالحسنؒ! تمہیں کس چیز کی خواہش ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے اس وقت سماع کی طلب ہے۔ پس قوال بلالیا گیا۔ درویشوں کی ایک جماعت بھی آگئی۔ سماع شروع ہوا۔ سماع کے الفاظ نے حضرت داتاؒ کو مضطرب کر دیا۔ کچھ دیر بعد، جوش کم ہو جانے پر جب شیخ نے پوچھا تو حضرت داتاؒ نے فرمایا کہ سماع سن کر مجھے بہت مسرت ہوئی۔ اس پر شیخ نے فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ سماع اور کوے کی آواز میں تیرے لئے کوئی فرق نہ رہے گا کیوں کہ قوت سماع اس وقت تک ہے جب تک مشاہدہ (۱۷) حاصل نہ ہو اور جب مشاہدہ حاصل ہو جاتا

ہے تو سماع کی خواہش مٹ جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت داتاؒ نے بعد میں سماع سے توبہ کرلی تھی جس کی وجہ حضرت داتاؒ نے یہ فرمائی کہ سماع میں بڑے خطرے ہیں اور بڑی عافت یہ ہے کہ عورتیں کسی اونچے مقام سے سماع کے حال میں درویشوں کو دیکھتی ہیں اور نوجوان اور نوخاستہ ان مجالس میں شریک ہوتے ہیں جس سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

[''آبِ کوثر'' ص ۸۸۔۸۹]

(۱۴) **حضرت حسینؒ اصغرؒ** = احقر کے خیال میں یہ نام حضرت حسن اصغرؒ ہونا چاہیے۔

(۱۵)،(۱۶)(۱۷) **درویش، فقرہ، مشاہدہ** = تفصیل کے لئے احقر کی کتاب ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') ملاحظہ فرمائیں۔

آں محرم رازِ نہانی، آں مستغرق ذاتِ ربانی، آں دردامِ مشاہدۂ اسیر

حضرت شیخ محمد میرؒ

[المشہور بہ میاں میر بالا پیرؒ] [م ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) ۷؍ربیع الاوّل بروز سہ شنبہ]

آپ کی والدہ محترمہ کا نام بی بی فاطمہؒ بنت قاضی قارنؒ اور والدِ بزرگوار کا نام قاضی سامیدۃؒ بن قاضی قلندرؒ تھا جو سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کی نسل سے تھے۔ آپ کے چار بھائی اور دو بہنیں اور بتائی گئی ہیں۔ بھائیوں کے نام یہ تھے: میاں قاضیؒ، قاضی عثمانؒ، قاضی طاہرؒ نیز قاضی محمدؒ اور بہنوں کے نام یہ تھے: بی بی بادیؒ اور بی بی جمال خاتونؒ۔ آپ کے والدین اور ایک بہن صاحبِ کرامات ہوئے ہیں۔

منقول ہے کہ جب آپ کے بڑے بھائی پیدا ہوئے تو آپ کی والدہ کو بذریعہ کشف یہ علم ہو گیا تھا کہ یہ بچہ عارف نہیں ہوگا۔ چنانچہ جب آپ ۹۵۷ھ (۱۵۵۰ء) میں بمقام سیوستان (سیستان) تولد ہوئے تو آپ کی والدہ نے خدا سے دعا کی کہ خدایا! میرے اس فرزند کو عارفِ کامل، تارک الدنیا اور اپنی یاد میں مستغرق بنا دینا۔ پس غیب سے ندا آئی کہ ہم نے تیرے اس فرزند اور ایک دختر کو عارف بنانا قبول کر لیا۔ آپ کے بعد بی بی جمال خاتونؒ پیدا ہوئیں جو عارفۂ وقت ہوئیں۔

آپ نے بڑے ناز و نعم میں پرورش پائی لیکن سات برس کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ پانچ سال میں آپ تحصیلِ علومِ ظاہری سے فارغ ہوئے اور پھر آگے چل کر یہی یتیم بچہ اپنے وقت کا قطب و پیشوا، امامِ طریقت، واقفکارِ اسرارِ حقیقت، علومِ ظاہری میں یکتائے روزگار اور عارفِ کامل ہوا۔

آپ سلسلۂ ''قادریہ'' میں شیخ خضر سیوستانیؒ جو سیوستان کے صاحبِ کمال و یکتائے

روزگار بزرگ ہوئے ہیں، سے بیعت تھے اور انھیں کی ایما پر ہندوستان میں لاہور تشریف لائے۔ عالمِ ملکوت کا کشفِ حال کا علم آپ نے اپنی والدہ سے حاصل کیا تھا اور حضرت غوث پاک کے اویسی تھے۔ کہتے ہیں کہ آپ بنا وضو کئے غوثِ اعظمؒ کا نام نہیں لیتے تھے۔ آپ فقر و غنا، توکل و قناعت، زہد و عبادت اور ترکِ دنیا میں اپنے زمانے میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔ شب و روز ذکرِ الٰہی میں مستغرق رہتے، شب کو نہ سوتے، دن کو نہ کھاتے، صائم رہتے، شروع میں تیسرے دن اور بعد میں ایک ماہ بعد افطار کرنے لگے تھے۔ آپ کی باتیں مستقل وعظ و نصائح ہوتی تھیں۔ موقع کے مناسب اشعار بھی سناتے تھے۔ اکثر یہ شعر سنایا کرتے تھے۔

شرط اوّل در طریقِ عاشقی دانی کہ چیست

ترک کردن ہر دو عالم را و پشت پا زدن

آپ کا یہ معمول تھا کہ فجر کی نماز سے پہلے مریدین کے ہمراہ جنگل جاتے اور وہاں جا کر الگ الگ درختوں کے نیچے بیٹھ جاتے اور پھر نماز کے وقت باجماعت نماز ادا کرتے اور واپس تشریف لاتے۔ اکثر رات کو حجرہ میں تنہا بیٹھ کر دروازہ بند کر لیتے اور پوری رات عبادت میں بسر کر دیتے۔ آپ کا ظاہری اور باطنی حقیقت اور قابلیت میں اتنا بلند مقام تھا کہ بڑے سے بڑے فاضل شخص کو بھی آپ کے سامنے مجالِ سخن نہ ہوتی تھی۔

منقول ہے کہ ایک بار جب ملکۂ نور جہاں نے مشہد مقدس سے ایک مجتہد کو مناظرہ کے لئے ہندوستان بلوایا تو ان کا شاہی فرمان بموجب لاہور میں زبردست خیر مقدم کیا گیا۔ استقبال کرنے والوں میں صوبیدار، شہر کے امراء اور علماء کے ہمراہ آپ بھی تشریف رکھتے تھے۔ جب مجتہد محترم کی نظر آپ کے روئے منور پر پڑی تو انھوں نے آپ سے متعارف ہو کر مصافحہ کیا اور صوبیدار سے خواہش ظاہر کی کہ ان کی آرام گاہ کا انتظام آپ کی خانقاہ کے قریب ہی کیا جائے۔ الغرض آپ کی خانقاہ کے قریب ہی ایک

مکان آراستہ کر دیا گیا۔ اگلے دن صبح کو جب ایک جمِ غفیر مُصر ہو کر آپ کو مجتہد کی قیام گاہ پر لے گیا تو مجتہد مکرم آپ سے نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آئے۔ آپ نے مجتہد سے فرمایا کہ مخلوقِ لاہور آپ سے کچھ سننا چاہتی ہے اور یہ فقیر بھی مشتاق ہے۔ مجتہد نے جواب دیا کہ لیکن میں آپ کا مشتاق ہوں۔ آپ نے برجستہ فرمایا کہ ہمیشہ غلبہ کثرتِ رائے سے ہوتا ہے۔

الغرض مجتہد صاحب نے بیان شروع فرمایا۔ اہلِ بیت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناء کے بعد انھوں نے کربلائے معلٰی کی تعریف میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمینِ کربلا کو وہ عظمت بخشی ہے کہ اس کے گرداگرد بارہ بارہ کوس تک دوزخ کی آنچ حرام ہے۔ اس پر آپ نے بآوازِ بلند فرمایا کہ حاضرینِ والا تمکین! یہ بزرگی کربلا کو اس وجہ سے ہے کہ وہاں نواسے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ابدی نیند سوئے ہیں۔ سبحان اللہ!، جائے غور ہے کہ جہاں خود وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم معہ اپنے تینوں ستونِ دین کے آسودہ ہیں اگر اس جگہ کے واسطے یہ کہا جائے کہ اس کے گرد سو سو کوس تک دوزخ کی آنچ حرام ہے، تو بجا ہوگا۔ یہ سن کر مجتہدِ محترم خاموشی سے دردِ سر کا حیلہ کر کے مسند سے اتر آئے اور جلسہ برخاست ہو گیا۔ اس کے بعد وہ صوبیدار لاہور سے یہ کہہ کر وطن واپس ہو گئے کہ شہنشاہ کو لکھ دینا کہ مجھے یہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی۔

منقول ہے کہ ایک بار شاہجہاں نے جمعہ کے دن آپ کی زیارت کے بعد آپ کو پچاس ہزار روپیہ نذر کرنا چاہا تو آپ نے یہ کہتے ہوئے کہ مالِ سلطنت مشکوک ہے، لینے سے صاف انکار فرما دیا۔ اس کے بعد شہنشاہ نے لاہور ہی میں ایک دوسرے بزرگ کو وہ روپیہ نذر کر دیا۔ جب اگلے جمعہ کو شاہجہاں آپ کی زیارت کو آیا اور اس نے دوسرے بزرگ کے روپیہ قبول کر لینے کی بابت بتایا تو آپ نے فرمایا کہ وہ بزرگ مثل دریا کے ہیں اور یہ فقیر مثل ایک کوزے کے کہ ناخن ڈوبنے سے بھی اس کا پانی مکروہ ہو جاتا ہے۔ وہاں

سے رخصت ہو کر شاہجہاں پھر انھیں بزرگ کے پاس پہنچا اور ان کے نذرانہ قبول کر لینے اور میا تمیرؒ کے قبول نہ کرنے کی بابت پوری بات بتاتے ہوئے ان بزرگ سے اصرار کیا کہ اس میں کیا اسرار ہے تو ان بزرگ نے فرمایا کہ میاں میرؒ کا اتقاء زیادہ ہے۔

ایک بار آپ باغِ زرّیں خاں میں مشغولِ عبادت تھے کہ ایک فاختہ ایک درخت پر بیٹھی ''حق سرّہ'' کا ورد کر رہی تھی کہ ایک شکاری نے غلیل سے اس پر وار کیا اور وہ مر کر نیچے زمین پر گر گئی۔ شکاری اس کو مرا ہوا دیکھ کر وہاں سے چلا گیا۔ آپ نے اس مردہ فاختہ کو خادم سے اٹھوا کو منگوا لیا اور جب اپنا دستِ حق پرست اس پر پھیرا تو وہ خدا کے فضل و کرم سے زندہ ہو کر اسی درخت کی ایک شاخ پر جا بیٹھی اور پھر سے یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئی۔ شکاری نے جب پھر اس کی آواز سنی تو اس نے پھر اس کو نشانہ بنانا چاہا لیکن آپ نے منع فرما دیا۔ شکاری نے کوئی توجہ نہ دی لیکن جیسے ہی غلیل چلانی چاہی کہ اس کے ہاتھ میں شدت کا درد ہوا اور وہ زمین پر گر کر لوٹنے لگا۔ تب آپ نے اس کے پاس جا کر فرمایا کہ اے بے درد! یہ درد تیری بے دردی کا ثمرہ ہے۔ وہ شخص بہت رویا اور اس نے آپ کی قدم بوسی کے بعد شکار سے توبہ کی۔ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا کہ درد موقوف ہو گیا۔ اس کے بعد وہ شخص آپ کا مرید ہو کر مرتبۂ اعلیٰ پر پہنچا۔

آپ کے انفاس پاک کو اللہ نے وہ تاثیر بخشی تھی کہ آپ کا دم کیا ہوا پانی کیسے ہی سخت بیمار کو پلا دیں تو اس کو فوراً شفاء ہو جاتی تھی، گونگا گویا ہو جاتا تھا اور جس کو شکایتِ ضعفِ بصر ہوتی اس کو اس پانی کے لگاتے ہی اس کے چشم روشن ہو جاتے تھے۔ آپ کی بہت سی خواق و کرامات مشہور ہیں۔

ایک بار کسی شخص کی باندی کچھ مال اسباب لے کر فرار ہو گئی۔ اس نے بہت تلاش کیا لیکن جب وہ نہ ملی تو وہ آپ کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا کہ جا! وہ تیرے گھر ہی میں ہے۔ اس شخص نے جب گھر جا کر دیکھا تو باندی کو معہ اسباب گھر ہی میں پایا۔ پوچھنے

پر اس باندی نے بتایا کہ میں بہت دور چلی گئی تھی کہ کسی نے میرا ہاتھ بازو سے پکڑا اور مجھے یہاں چھوڑ گیا۔

ایک بار کسی بدگو کی شکایت پر شہنشاہ جہانگیر نے شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور مرزا حسام الدینؒ (خلیفہ شاہ محمد باقی باللہؒ) کو کشمیر طلب کرلیا۔ جب یہ دونوں بزرگ لاہور پہنچے اور آپ سے ملاقات کی تو آپ نے فرمایا کہ نہ تم (شیخ عبدالحقؒ) کشمیر جاؤ گے، نہ تمہارا بیٹا (نورالحقؒ) کابل جائے گا اور نہ تم (مرزاؒ) دہلی سے جدا ہوں گے۔ اس کے بعد چوتھے دن ہی خبر آئی کہ شہنشاہ کا انتقال ہوگیا۔

تقریباً ساٹھ سال لاہور میں قیام کرنے کے بعد ۸۵ برس (شمسی) کی عمر میں ۷/ربیع الاوّل ۱۰۴۵ھ (۱۵۵۰ء) کو (عہدِ شاہجہانی میں) لاہور کے محلّہ خانی پورہ (بیگم پورہ) میں آپ کا وصال ہوا۔ [اناللہ وانا الیہ راجعون]

"میانمیر چشمۂ انوار"، "رہبرِ متقی"، "شیخ والا جاہ" سے آپ کا سنہ ولادت اور

میانمیر چشمۂ انوار	رہبرِ متقی	شیخ والا جاہ
۹۵۷ھ	۹۵۷ھ	۹۵۷ھ

ہادی صدق میر اشرف	میانمیر دستگیر	فیاضِ حق ولی	تاج الاصفیاء عابد میانمیر
۹۵۷ھ	۹۵۷ھ	۹۵۷ھ	۹۵۷ھ

سے سنہ وصال نکالے گئے ہیں۔

اُن دنوں نواب وزیر خان صوبیدار لاہور تھا۔ چونکہ شہزادہ دارا شکوہؒ آپ کا بہت معتقد تھا اس لئے اس نے موضع ہاشم پور جو اب لاہور ہی کا حصہ ہے، میں آپ کا مزارِ مبارک تعمیر کرایا یہ علاقہ اب آپ کے نام سے "چھاؤنی میاں میر" کہلاتا ہے۔ گرچہ آپ کا مزار بہت سادہ ہے لیکن ایک وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہے جس میں دیگر متعدد بزرگوں و اولیاء اللہ کے مزارات واقع ہیں۔ علاقے کے اطراف پُرشکوہ چہار دیواری اور داخلے کے لئے چہار دیواری کی مناسبت ہی سے دروازے ہیں۔ صدر دروازہ کے سامنے

بہت سے ہوٹل ہیں جن پر غرباء، فقراء میں کھانا تقسیم کرنے کے لئے بڑی بڑی دیگوں کا مناسب انتظام ہے۔ احقر کو حاضری اور فاتحہ خوانی کی سعادت نصیب ہو چکی ہے۔ آج بھی آپ کا مزار پُر انوار لاہور میں مشہور حاجت روائے خلق ہے۔

یہاں اس واقعہ کا ذکر کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب رنجیت سنگھ لاہور کا راجہ ہوا تو اس نے بہت سی شاہی عمارات، خانقاہوں، مساجد و مقابر سے پتھر نکلوا کر امرتسر روانہ کئے۔ ایک دن حسبِ معمول جب وہ آپ کے مزارِ مبارک پر گیا اور معماروں کو حکم دیا کہ اس کا گھوڑا اچانک بگڑا اور وہ زمین پر آ رہا۔ وہ اٹھا اور ہنس کر بولا کہ یہ بادشاہوں کے پیر کا مقبرہ ہے، اس کو نہ چھیڑو اور پھر اس نے چھ سو روپیہ سالانہ برائے عرس شاہی خزانہ سے مقرر کر دیا جو انگلش دورِ حکومت میں بھی برابر جاری رہا۔

سلسلۂ طریقت

غوث الثقلین حضرت شیخ عبد القادر جیلانی [م ۵۶۱ھ (۱۱۶۶ء)]

شیخ احمد بن مبارکؒ [م ۵۷۲ھ (۱۱۷۶ء)]

شیخ مرتضیٰ سجائی

شیخ ابو اسحاق ابراہیمؒ

سید لال شہبازؒ

شاہ جمال مجردؒ

سید علی قادریؒ

شیر اولیا خواجہ باقیؒ

شیخ خضر سیوستانی [م ۹۹۴ھ (۱۵۸۵ء)]

شیخ محمد میرؒ
[المشہور بہ میاں میر بالا پیرؒ]

روحانیت
- شاہ محمد غوث گیلانی قادری [م ۱۱۵۲ھ] (ص ۲۲۱ ملاحظہ فرمائیں)

- شیخ نعمت اللہ سرہندیؒ [م ۱۰۱۷ھ]
- حاجی مصطفیٰ سرہندیؒ [م ۱۴؍ صفر ۱۰۳۹ء بروز چہار شنبہ]
- ملا خواجہ کلاںؒ
- ملا عبد الغفور دانشمندؒ
- شیخ نتھا شاہؒ [م ۱۰۲۷ھ نزد مزار میاں میرؒ] (ص ۲۲۸)
- میر عنایت اللہؒ [م ص ۲۲۳ ملاحظہ فرمائیں]

- خواجہ بہاریؒ [م ۱۰۶۰ھ لاہور] (ص ۲۲۶)
- شیخ احمد دہلویؒ
- شیخ اسماعیلؒ
- شیخ احمد سنائیؒ
- میاں حامدؒ [م ۱۷؍ رمضان ۱۰۴۴ھ] (ص ۲۲۵)
- شیخ شاہ محمد ملا شاہ [م ۱۰۶۹ھ]

[آگے اگلے صفحہ پر]

[گذشتہ صفحہ سے

شیخ شاہ محمد ملا شاہ [م ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۸ء)] (ص ۲۲۷)

شہزادہ محمد دارا شکوہؒ

[م ۱۰۷۰ھ (۱۶۵۹ء)]

[تفصیل احقر کی کتاب "تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ" کی جلد چہارم میں ملاحظہ فرمائیں]

شیخ محسن شاہؒ

شاہ عبدالرشید لاہوریؒ

شاہ بلاق لاہوریؒ [م ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء)]

سید عبدالکریمؒ المشہور بہ پیر بہاون شاہؒ

[بن سید بلاق لاہوریؒ (ص ۲۳۶)]

مقبولِ امامت، مخصوص بکرامت، محرمِ رازِ سبحانی

سید فخر الدین حسین زنجانیؒ

[م ۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء) ۱۹ رشعبان المعظم]

آپ کا اصل نام سید فخر الدین حسینؒ اور والدِ محترم کا نام سید علی محمودؒ اور والدہ محترمہ کا نام حضرت مریم صغریٰ تھا جن کا چند واسطوں سے تعلق سیدنا حضرت امام حسین سے ہے۔ ۲۶ رشعبان المعظم ۳۴۷ھ (۹۵۸ء) کو ایران کے مشہور تاریخی شہر زنجان میں پیدا ہوئے اور اسی نسبت سے زنجانی کہلائے۔ [زنجان، ایران کے شمال میں کوہ البرز کے دامن میں واقع ہے۔ یہ علاقہ بڑا زرخیز اور قدرتی دولت سے مالا مال ہے۔]

آپ کے اسلاف خلافتِ راشدہ کے دور میں عراق آکر آباد ہو گئے تھے اور وہاں سے آپ کے دادا، حضرت سید جعفر برقعیؒ تیسری صدی ہجری میں زنجان تشریف لے آئے تھے۔ انھیں سے ساداتِ زنجانیہ کا سلسلۂ نسب آگے بڑھا۔

آپ کے تین بہنیں [کلثوم، زینب اور فاطمہ] اور تین بھائی [یعقوبؒ، موسیٰ اور علیؒ] تھے۔ آپ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ حضرت یعقوب زنجانیؒ [پیدائش ۳۵۶ء] اور حضرت موسیٰ زنجانیؒ [پیدائش ۳۵۹ھ] آپ ہی کے ہمراہ زنجان سے لاہور تشریف لے آئے تھے۔ حضرت یعقوب زنجانیؒ اپنے والد سے اور حضرت موسیٰ زنجانیؒ آپ ہی سے بیعت تھے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم زنجان میں ہی ایک امامِ مسجد سے حاصل کی جو بہت عالم و فاضل بزرگ تھے۔ انھیں کی صحبتِ فیض سے آپ کے دل میں روحانیتِ باطنی و اسرار و رموز جاننے کی تڑپ پیدا ہوئی۔ ان دنوں گاذرون میں حضرت ابوالفضل ختلیؒ کا

چرچا عام تھا۔ چنانچہ آپ اپنے والد کے ہمراہ گاذرون جا کر ان سے بیعت ہو گئے۔

پیرِ مرشد نے خرقۂ خلافت سے آپ کو سرفراز فرماتے ہوئے ہندوستان جا کر تبلیغ کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ آپ نے والدین سے بھی اجازت حاصل کر لینے کے بعد ۳۸۵ھ (۹۹۵ء) میں سفر کا آغاز کیا اور قذوین، رے، سبزوار (رے سے پینتیس میل کے فاصلے پر واقع)، تمنان اور اقطان ہوتے ہوئے نیشا پور پہنچے جہاں سلطان محمود غزنوی (م ۴۲۱ھ) نے آپ سے ملاقات کی۔ نیشا پور سے روانہ ہو کر آپ ہرات، کا کا خیل، ہزارہ، جنجوعہ، مہمند، چدبہ، ہلمند ہوتے ہوئے غزنی پہنچے۔ غزنی سے براستہ کابل، جلال آباد تشریف لائے۔ وہاں سے درۂ خیبر میں سے گزرتے ہوئے پشاور سے بیس میل فاصلے پر واقع ایک مقام، لقمان میں قیام پذیر ہوئے۔ چند روز آرام کے بعد آپ وہاں سے پشاور، اور پشاور سے بذریعہ کشتی دریائے سندھ کو عبور کر کے مارگلہ کے مقام پر پہنچے اور پھر بالآخر ۳۸۷ھ (۹۹۷ء) میں اپنی منزلِ مقصود لاہور میں قدم رنجہ فرما کر شہر کے مشرقی علاقے میں دریا کے کنارے قیام فرمایا۔ بعد میں یہ علاقہ آپ کی نسبت سے ''چاہ میراں'' کہلایا۔ آپ کے بھائی، یعقوب زنجانیؒ جو عیال دار تھے، نے جنوبی لاہور (موجودہ شاہ عالمی) اور موسیٰ زنجانیؒ نے مستی دروازے کے اندر اقامت اختیار کر لیں۔

لاہور ان دنوں کفر کے اندھیروں میں غرقاب تھا۔ چنانچہ آپ نے تین سال تو بہت مشکلات میں گزارے لیکن پیہم جدّ وجہد کرتے رہے اور صبر کا دامن نہ چھوڑا اور پھر بالآخر اللہ کے حکم سے اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔ آپ نے لاہور میں کل ملا کر چوالیس سال تبلیغ فرمائی۔ اس دوران آپ کے دونوں بھائی تاحیات آپ کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ [حضرت یعقوبؒ کا انتقال ۴۶۰ھ میں اور حضرت موسیٰؒ کا انتقال ۴۴۰ھ میں ہوا۔]

حضرت موسیٰ انجانیؒ پر شروع میں تو سکر و جذب کی کیفیت طاری رہی لیکن پھر آہستہ آہستہ صحو کی حالت میں آتے گئے۔ عمر کے آخری حصے میں مستی دروازے سے

شمالی لاہور، یعنی ریلوے اسٹیشن کی آبادی جو اب پاک نگر (پہلے بھارت نگر) کہلاتی ہے، میں تشریف لے آئے۔ وہیں ۸۱ سال کی عمر میں وصال پایا۔

آپ نے شادی نہیں کی تھی۔ اس لئے حضرت یعقوب زنجانیؒ کی اولاد ہی خود کو آپ کی نسل سے بتاتی ہے۔

آپ کی درگاہ کے قریب جو کنواں ہے اور ''میراں دی کھوئی'' کے نام سے مشہور ہے، وہ آپ کے مریدین نے عقیدت مندوں کی سہولت کی خاطر کھدوایا تھا۔ شروع میں اس کا پانی کھاری تھا۔ جب آپ نے اس کی منڈیر پر کھڑے ہو کر دعا فرمائی تو وہ خدا کے فضل سے میٹھا ہو گیا۔

آپ نے اپنی زندگی میں ایک پیشن گوئی فرمائی تھی جو اللہ کے کرم و فضل سے حرف بہ حرف پوری ہوئی۔ آپ نے فرمایا تھا ''زنجان سے ہمارے آنے کے بعد وہاں ایک ولیِ کامل پیدا ہوگا جس کو کشف و کرامات میں بہت بلند مرتبہ حاصل ہوگا اور دنیا اس کو سعد بن علی زنجانیؒ کے نام سے جانے گی۔ ان کے والد کا نام بھی میرے والدِ محترم کی طرح علیؓ ہوگا۔ چنانچہ زنجان میں حافظ الحدیث سعد بن علیؒ کی ولادت ہوئی اور انھوں نے اپنی زندگی میں امۃ المسلمہ اور اسلام کی بے پناہ خدمت کی۔ ان کا وصال ۴۷۱ھ (۱۰۷۸ء) میں ہوا۔

زندگی کے آخری ایام میں آپ بیمار رہنے لگے تھے۔ چنانچہ آپ کے حجرے سے آپ کا چہیتا عقیدت مند و مرید، رام چندر آپ کو اپنے گھر لے گیا جہاں ۱۹ر شعبان المعظم ۴۳۱ھ (۱۰۳۹ء) بروز جمعرات آپ کا وصال ہو گیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ جب آپ کا جنازہ لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں حضرت داتا گنج بخشؒ نے اس کو روا کر آپ کا چہرۂ پر نور دیکھا اور پھر انھوں نے ہی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ [قطب کی نمازِ جنازہ قطب ہی پڑھاتا ہے۔ اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت داتا گنج بخشؒ کو لاہور بھیجا

تا کہ وہ نمازِ جنازہ بھی پڑھا سکیں اور حضرت زنجانیؒ کے وصال کی وجہ سے جو قطبیت کی جگہ خالی ہو گئی تھی وہ بھی پُر کر سکیں۔]

آپ کا مزارِ اقدس چاہ میراں کی خوبصورت آبادی میں سطحِ زمین سے بلند سبز گنبد کے ساتھ ایستادہ ہے جہاں ہر وقت زائرین کا میلہ لگا رہتا ہے۔

صاحبِ ''خزینۃ الاصفیاء'' اور صاحبِ ''گلزارِ ابرار'' نے بھی سید فخر الدین حسین زنجانیؒ کے نام کے ایک بزرگ کا تذکرہ کیا ہے جو لاہور میں وارد ہوئے۔ صاحبِ ''خزینۃ الاصفیاء'' نے ان کا سنہ وصال ''عارف حسین زنجانی'' سے نکالا ہے۔ [ص ۹۰۵]

۶۰۰ ھ

صاحبِ ''گلزارِ ابرار'' نے شیخ جمالی دہلویؒ کی تصنیف ''سیر العارفین'' کے حوالے سے لکھا ہے ''جب خواجہ معین الدین چشتیؒ [م ۶۳۴ھ (۱۲۳۶ء)] ہندوارد ہوئے تو انھوں نے چند روز لاہور میں سید فخر الدین حسین زنجانیؒ کی مصاحبت میں بھی قیام فرمایا۔ [خواجۂ بزرگ ۵۶۱ھ (۱۱۶۵ء) میں لاہور، دہلی وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے اجمیر شریف وارد ہوئے تھے۔] ان دونوں کے درمیان باہم رازداری اور خداشناسی کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ شیخ سعد الدین حمویؒ (م ۱۲۵۲ء) گرچہ شیخ نجم الدین کبریٰ ولی تراشؒ (م ۱۲۲۱ء) کے مرید تھے لیکن سلوک اور توحید کے مدارج انھوں نے سید فخر الدینؒ کی ہی بدولت طے کیے اور کمال کو پہنچے۔'' [''اذکارِ ابرار'' (اردو ترجمہ) ''گلزارِ ابرار'') ص ۲۵]

ان سید فخر الدین حسنِ زنجانیؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، شیخ نجم الدین کبریٰؒ اور شیخ سعد الدین حمویؒ کے سنہ وصال کے حوالوں سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ بزرگ ایک ہی دور میں ہوئے ہیں اور اس سے صاحبِ ''خزینۃ الاصفیاء'' اور صاحبِ ''گلزارِ ابرار'' کے تذکروں کی تصدیق ہو جاتی ہے لیکن یہ دور حضرت داتا گنج بخشؒ سے کافی بعد [تقریباً دو سو سال] کا دور ہے۔ اس لئے یہ بات مشکوک ہو جاتی ہے کہ حضرت داتا گنج بخشؒ اور

حضرت سید فخر الدین حسین زنجانیؒ ایک ہی بزرگ شیخ ابو الفضل بن حسن الختلیؒ سے بیعت تھے نیز حضرت داتا گنج بخشؒ، سید فخر الدین زنجانیؒ کے وصال پر لاہور تشریف لائے۔ لیکن صاحب ''خزینۃ الاصفیاء'' نے سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف ''فوائد الفواد'' کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ سید فخر الدین حسین زنجانی بھی شیخ ابو الفضل بن حسن ختلیؒ سے بیعت اور ان کے خلفاء میں سے نیز قطبیتِ لاہور پر فائز تھے۔ اگر یہ صحیح مان لیا جائے تو صاحب ''سیر العارفین'' کا قول اور ''خزینۃ الاصفیاء'' میں سید فخر الدین حسین زنجانیؒ کا دیا گیا سنہ وصال (۶۰۰ھ) غلط ہو جاتے ہیں۔ احقر کی رائے میں ''فوائد الفواد'' میں دی گئی تفصیل، یعنی سید فخر الدینؒ، شیخ ابو الفضلؒ سے بیعت تھے، صحیح معلوم دیتی ہے۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ سید فخر الدینؒ اور داتا گنج بخشؒ آپس میں پیر بھائی تھے اور سید فخر الدینؒ کے وصال پر حضرت داتا گنج بخشؒ لاہور تشریف لائے۔ [واللہ عالم بالصواب]

لاہور میں ہی ایک اور بزرگ قاضی حسن زنجانیؒ نام کے ابدی نیند سوئے ہوئے ہیں جو سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اولاد سے تھے۔ قصبہ سیوہارہ (بجنور) کا علم دوست قاضی خاندان انھیں کی اولاد سے ہے۔ قاضی صاحب، زنجان (عراق عجم) کے رہنے والے اور ایک عارف کامل بزرگ نیز سلسلۂ ''جنیدیہ'' میں اپنے خاندانی بزرگوں سے بیعت تھے۔ آپ کو کئی ہزار احادیث ازبر تھیں۔ آپ کا شہرۂ فضل و کمال سن کر بابر نے آپ کو فرغانہ طلب کیا۔ اس طرح آپ بابر کے مصاحب اور مشیر خاص ہو کر اس کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے۔ دہلی فتح کر لینے کے بعد بابر نے باغی سرداروں کی سرکوبی کے لئے آپ اور سید ابراھیم ترمذیؒ کی قیادت میں ایک دستہ روانہ کیا۔ جہاں آج قصبہ سیوہارہ آباد ہے وہاں آپ کی جمنا رائے سے مقابلہ آرائی ہوئی۔ جمنا رائے مارا گیا اور آپ کی فتح ہوئی۔ بابر نے خوش ہو کر سیوہارہ معہ مواضعاتِ کثیر ریاست جمنا رائے آپ کو معہ عہدۂ

قضاد منصب پنج ہزاری عطا کیا۔

آپ نے سیوہارہ قیام فرمایا اور متعلقین کو بھی دہلی سے سیوہارہ لے آئے۔ بعد ازاں بحکمِ شاہی قضا اپنے فرزند، قاضی عبدالرحمنؒ کے سپرد کر کے دہلی واپس تشریف لے گئے۔ اس کے بعد لاہور کے عہدۂ قضا پر معمور کر دیئے جانے پر آپ لاہور منتقل ہو گئے۔ لاہور میں دارالقضا اور سیوہارہ میں ایک محل کی تعمیر کا کام شروع کرایا تھا کہ ۹۷۵ھ (۱۵۶۷ء) میں بہ عمر سو سال پیامِ اجل پہنچا۔ آپ دو سال لاہور رہے۔ آپ کا مزارِ مبارک محلہ میرنگ میں شاہ سریائیؒ کے مزار کے قریب تھا جس کے آثار بھی اب معدوم ہو گئے ہیں۔

شمس الفقراء، بدر النقباء، خلعتِ سروری

سید عزیز الدین مکّی ثم الاہوری [المشہور بہ پیر مکّیؒ] [م ۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء)]

آپ ساداتِ عظام، اپنے وقت کے اعظم علماء و کبرائے اولیائے کرام میں سے، بغداد کے رہنے والے اور سلسلۂ طریقت میں چند واسطوں سے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ سے وابستہ تھے۔

بغداد سے مکہ معظمہ تشریف لے جاکر آپ نے وہاں تقریباً بارہ سال قیام فرمایا اور مجاورت پر مامور رہے۔ ایک دن بیت اللہ میں معتکف تھے کہ "پیر مکّی" کے خطاب سے مخاطب ہوئے۔ اس کے بعد ۵۷۴ھ (۱۱۷۸ء) میں آپ بایمائے ربانی مکہ معظمہ سے عازمِ ہندوستان ہوکر لاہور میں مقیم ہوئے۔ ان دنوں لاہور غزنوی خاندان کا دارالسلطنت تھا اور اس پر تاج الدولہ خسرو ملک بن معز الدولہ خسرو شاہ حکمرانی کرتا تھا۔ ۵۷۶ھ (۱۱۸۰ء) میں سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر پہلا حملہ کیا اور لاہور کا محاصرہ کرلیا۔ خسرو ملک، شہاب الدین کا مقابلہ نہ کرسکا اور دعا کے لئے آپ کے پاس حاضر ہوا۔ آپ نے دعا فرمائی۔ اللہ کے حکم سے شہاب الدین بنا لاہور فتح کئے غورستان واپس چلا گیا۔ (۱)

دو سال بعد، ۵۸۰ھ (۱۱۸۴ء) میں شہاب الدین نے دوبارہ لاہور پر حملہ کیا۔ اس نے لاہور اور اس کے اطراف کو خوب جی کھول کر لوٹا اور سیالکوٹ کا قلعہ تعمیر کرکے اور وہاں کی حکومت اپنے ایک امیر کے سپرد کرکے پھر سے غورستان واپس لوٹ گیا۔ (۲)

۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں تیسری بار حملہ کرنے کی بجائے شہاب الدین نے ایک شاطرانہ چال چلی اور ظاہری طور پر دوستی کا ڈھونگ رچتے ہوئے وہ دھوکے سے ایک رات

چپ چاپ لاہور پہنچ گیا۔ خسرو ملک نے مجبوراً امان طلب کر لی اور اس طرح لاہور پر غوری کا قبضہ بنا کسی جنگ و جدل کے ہو گیا اور ساتھ ہی غزنی کی عظیم الشان حکومت محمود کے خاندان سے نکل کر خاندانِ غوری کے ہاتھ آ گئی۔

آپ بدستور لاہور میں وعظ و نصیحت فرماتے رہے اور بالآخر ۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء) میں انتقال فرمایا۔ ''آفتابِ حسین'' اور ''پیر حسن پیر مکّی'' سے آپ کا سنہ وصال

۶۱۲ھ ۶۱۲ھ

نکلتا ہے۔

جس شاہراہ پر داتا گنج بخشؒ کا مزارِ مبارک ہے، اسی پر کچھ فاصلے سے، ایک گلی کے اندر غالباً آپ ہی کا مزارِ شریف واقع ہے۔ احقر کو حاضری کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔

احقر کو آپ کی بابت بتایا گیا کہ آپ داتا گنج بخشؒ کے استاد تھے اور جب داتا گنج بخشؒ لاہور وارد ہوئے تو ان کو آپ نے آبِ دریا پر اپنی چادر بچھا کر دریا عبور کرایا۔ یہ روایت بالکل من گھڑت اور جھوٹی معلوم دیتی ہے کیوں کہ آپ کا سنہ وصال ۶۱۲ھ (۱۲۱۵ء) ہے جب کہ داتا گنج بخشؒ کا سنہ وصال ۴۶۴ھ ہے۔ یعنی آپ داتا گنج بخشؒ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد کے بزرگ ہیں۔

حواشی

(۱) لاہور میں جب معز الدولہ خسرو شاہ [بن یمین الدولہ بہرام شاہ بن علاؤ الدولہ مسعود بن ظہیر الدولہ ابراھیم بن ناصر الدولہ مسعود بن امین الملت یمین الدولہ سلطان محمود غزنوی] کا سات سال حکومت کرنے کے بعد ۵۵۵ھ (۱۱۶۰ء) میں انتقال ہوا تو اس کا بیٹا خسرو ملک اس کا جانشین ہوا۔ خسرو ملک نے لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور بڑے عدل و انصاف

سے حکومت کی اور وہ ہندوستانی علاقے جو غزنوی مملکت کے اقتدار سے نکل گئے تھے دوبارہ اپنے قبضے میں کئے۔ اُدھر شہاب الدین محمد غوری نے غزنی پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستان پر پہلی بار حملہ کیا اور ۵۷۶ھ (۱۱۸۰ء) میں افغانستان، پشاور، سندھ اور ملتان فتح کر لینے کے بعد لاہور کا رخ کیا۔ خسرو ملک اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور لاہور کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گیا۔ شہاب الدین نے خسرو ملک کے ایک نوعمر لڑکے، ملک شاہ اور لاہور کے ایک ہاتھی کو اپنے قبضے میں کیا اور پھر واپس غورستان لوٹ گیا۔

[''تاریخ فرشتہ'' (اردو ترجمہ) جلد اول ص ۲۰۳]
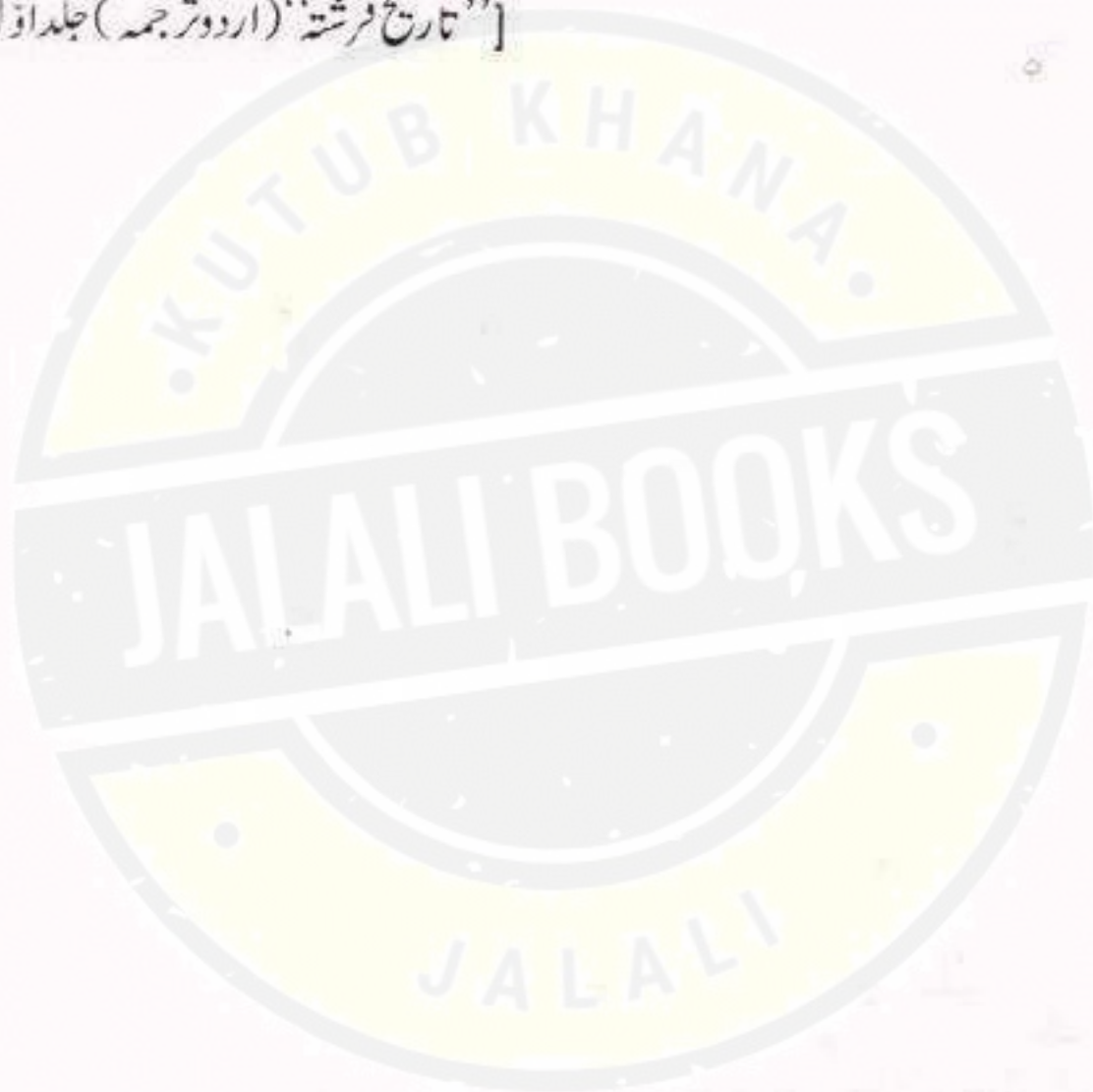
(۲) جن کے مزارات پر حاضری کاش کہ ممکن ہو سکتی!

ا۔ ''قادریہ'' سلسلہ سے وابستہ صوفیاء کرام

حضرت سید محمود حضوری لاہوریؒ = آپ سید شمس الدینؒ المشہور بہ شمس العارفین غوریؒ کے فرزند اور امام موسیٰ کاظمؒ کی اولاد سے تھے۔ حضوری اس لئے کہلاتے ہیں کہ زیارتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہوئے۔ والد کے انتقال کے بعد غور سے بغرض سیر ہندوستان وارد ہوئے اور لاہور کے محلہ حاجی سوالی میں مقیم ہو گئے۔ آپ مرید اپنے پدر بزرگوار کے، وہ اپنے پدر سید یعقوبؒ کے، وہ خلیفہ سید عبداللہ شاہ قادریؒ کے، وہ خلیفہ سید علیؒ کے، اور وہ خلیفہ سید السادات سید عبدالوہابؒ کے تھے۔

آپ کی وفات ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں ہوئی۔ ''صاحبِ مشتاق'' سے سنہ وصال ۹۴۲ھ نکلتا ہے۔ مزار شریف درگاہ سید جان محمد حضوریؒ میں واقع ہے۔

حضرت سید عبدالقادر گیلانی لاہوریؒ = آپ مرید اپنے پدر بزرگوار سید جلال الدینؒ کے تھے۔ بغداد سے آکر لاہور میں مقیم ہوئے۔ وفات ۱۸ ربیع الاول ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) کو ہوئی۔ ''عبدالقادر ثانی'' سے سنہ وصال ۹۴۲ھ نکلتا ہے۔ مزار شریف متصل محلہ قدیمی پیر عزیز نیرنگ میں واقع ہے۔

حضرت شیخ ابو اسحاق قادری لاہوریؒ = آپ خلیفہ داؤد کرمانی چونی والؒ کے اور علومِ

ظاہری و باطنی میں یگانۂ عصر، ریاضت و مجاہدہ میں بے مثال، سخاوت میں شہرۂ آفاق نیز صائم الدہر اور قائم اللیل بزرگ تھے۔ بادشاہ ابوالمعالی والیٔ کرمان آپ کا مرید تھا۔ آخیر وقت میں محلہ مغلاں (المشہور بہ محلہ پیر عزیز نیرنگ)، لاہور میں سکونت پذیر ہو کر ۵ رمحرم الحرام ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء) میں وفات پائی۔ ''شاہ عالی فقیر بو اسحاق'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ اپنے مکان میں دفن

۹۸۵ھ

ہوئے۔ وہیں آپ کے صاحبزادگان کے بھی مزارات ہیں۔ آپ کا مزار شریف محلہ نیرنگ سے جانب مشرق واقع ہے۔

حضرت شاہ نور حضوری لاہوریؒ = آپ اپنے والد سید محمود حضوری غوریؒ کے مرید تھے۔ والد کے انتقال کے بعد لاہور وارد ہوئے۔ وصال ۹۹۷ھ (۱۵۸۸ء) میں ہوا۔ ''ہادی احسن منور شاہ نور'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۹۷ھ

حضرت شیخ حسین لاہوریؒ = آپ خلیفہ حضرت بہلول دریائی کے تھے۔ آپ کے والد شیخ عثمانؒ جن کا دائرۂ اسلام میں داخل ہونے سے قبل نام کلسن رائے کائستھ تھا، لاہور کے باشندہ تھے جو سلطان فیروز شاہ کے عہد میں مسلمان ہوئے۔ آپ کا طریقہ ''ملامتیہ'' تھا۔ جمادی الثانی کی چاند رات ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) میں وصال ہوا۔ ''شیخ محمود'' اور ''شیخ زماں'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۰۸ھ   ۱۰۰۸ھ

آپ کے تقریباً نو ہزار خادم تھے جو سب کے سب ولی ہوئے۔ خلفاء کی تعداد ۱۶ بتائی گئی ہے۔ ان میں سے جن کے مزارات لاہور میں واقع ہیں ان کے نام اس طرح سے ہیں:

شاہ غریبؒ (شیخ حسنؒ کے مزار کے متصل مزار شریف واقع ہے۔)، مادھو دیوانؒ (محبوب ترین خلفاء میں سے تھے۔) گورکھ دیوانؒ، الٰہ دیوانؒ، مولا بخش خاکیؒ، شاہ رنگ بلاولؒ، بدھو بلاولؒ اور شاہ بلاولؒ (آخری تینوں شیخ حسن کے مزار کے گرد آسودہ ہیں۔)

حضرت شاہ شمس الدین قادری لاہوریؒ = آپ خلیفہ شیخ ابو اسحاق قادری لاہوریؒ کے اور وہ خلیفۂ اعظم شیخ داؤد چونی والؒ کے تھے۔ آپ عالم باعمل اور اپنے عہد میں یگانۂ روزگار تھے۔ شہنشاہ جہانگیر آپ کا بہت معتقد تھا۔ سنہ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں وصال ہوا۔ "شمعِ بُوتراب"، "فخرِ عالم"، "شیخ عالی" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۲۱ھ ۱۰۲۱ھ ۱۰۲۱ھ

حضرت سید شاہ بلاول قادری لاہوریؒ = آپ سید عثمانؒ بن سید عیسیٰؒ کے فرزند اور خلیفہ سید شمس الدین قادری لاہوریؒ کے تھے۔ سید شمس الدینؒ، شیخ ابو اسحاقؒ کے اور وہ شیخ داؤد جہنی والؒ کے خلیفہ تھے۔ آپ کے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ ہرات سے ہندوارد ہوئے تھے۔ اور انھوں نے لاہور کے قریب واقع شیخوپورہ جاگیر میں پایا تھا۔ آپ صائم الدہر اور قائم اللیل بزرگ تھے۔ ۷۰ برس کی عمر میں ۲۶ رشعبان المعظم سنہ ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶ء) بوقت عشاء وصال ہوا۔

"مقتولِ عشق"، "واعظِ بلاولؔ"، "سید ثابت بلاولؔ"، "بلاآل پیر محبوبِ بہشت"

۱۰۴۶ھ ۱۰۴۶ھ ۱۰۴۶ھ ۱۰۴۶ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

حضرت سید سرور دین حضوری لاہوریؒ = نسبتِ ارادت اپنے والد سید جان محمد حضوریؒ سے رکھتے تھے۔ ۲۱ رشوالِ المکرم سنہ ۱۱۰۰ھ (۱۶۸۸ء) بروز جمعہ وصال ہوا۔ "سحرِ فیض"، "سردار سرور سید الدین" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۰۰ھ ۱۱۰۰ھ

حضرت شاہ محمد غوث گیلانی لاہوریؒ = مرید اپنے والد سید حسن پشاوریؒ کے، علومِ ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ اور صاحبِ اجازت سلسلۂ چشتیہ، قادریہ اور نقشبندیہ سے تھے۔ روحانیتِ میر میرانؒ سے بھی تربیت پائی تھی ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں وصال ہوا۔ ''عارف مخدوم سالک'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۵۲ھ

حضرت سید عبدالقادر شاہ گیلانی گداؒ = آپ فرزند سید عمرؒ بن حاجی محمد ہاشمؒ کے، جامعِ طریقت و شریعت اور محرمِ اسرارِ حقیقت و معرفت تھے۔ سید محمد لاہوریؒ سے فیضیاب ہوئے۔ شنبہ کی رات کو ۱۱۵۴ھ (۱۷۴۱ء) میں وصال ہوا۔ ''مہدی متقی مقتدا'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ آپ کے چار ہونہار، لائق و فائق

۱۱۵۴ھ

فرزند تھے۔ نام یہ ہیں: سید یوسف شہیدؒ، سید محمد غوثؒ، سید اصغر علیؒ [صاحبِ ''شجرۃ الانوار''] اور سید ابی صالحؒ۔

حضرت شاہ فرید نوشاہی لاہوریؒ = والد کا نام سید محمد علیؒ بن سید علیؒ بن سید فتح علیؒ تھا جو سادات بھاکری حسینی سے تھے اور دریائے چناب کے کنارے واقع رسول نگر میں رہتے تھے۔ آپ خلیفہ شیخ پیر محمدؒ [المشہور بہ سچیارؒ] [م ۱۱۵۲ھ گجرات] کے تھے اور پیر روشن ضمیر کے حسب الارشاد لاہور تشریف لا کر خدمتِ خلق میں مشغول ہو گئے تھے۔ اکثر ملازمت بھی کی لیکن بعد میں دل برداشتہ ہو کر شیخ پیر محمدؒ سے بیعت ہو گئے تھے۔ لاہور میں کوٹلا شاہ فرید آپ ہی کا آباد کیا ہوا ہے۔ ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) میں وصال ہوا۔ ''آفتابِ فقرِ فرید'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۵۸ھ

حضرت شیخ محمد سلطان لاہوریؒ [المعروف بہ مرگ نینیؒ] = آپ سالک مجذوب و

صاحب سکر بزرگ اور شیخ سندی شاہؒ کے مرید تھے۔ شیخ سندی شاہؒ شیخ عاقل شاہؒ کے، وہ شیخ ملا شاہؒ کے، وہ شیخ خادم علی شاہؒ کے، وہ خادم سلیمان شاہؒ کے، وہ خادم نور جمال دہلویؒ کے، وہ شیخ محمد شفیع سدھوریؒ کے، وہ شیخ محمد حیاتؒ کے اور وہ حضرت شاہ قیص گیلانی قادریؒ کے مرید تھے۔

آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت اور دلکش تھیں۔ اسی وجہ سے آپ کے پیرِ مرشد آپ کو "مرگ نینی" [ہرن کی سی آنکھوں والا، یعنی بڑی بڑی آنکھوں والا] کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے۔

آپ کا ۹ رشوال المکرم ۱۱۵۸ھ (۱۷۴۵ء) کو وصال ہوا۔ "شیخ سلطان محمود"

۱۱۵۸ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ شاہ نواز خاں صوبہ دار لاہور نے آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔

حضرت شیخ مصاحب خاں خورد لاہوریؒ = مرید سردار شاہ قادریؒ [م ۱۱۸۴ھ بابک وال] کے تھے۔ اس وقت لاہور سے تقریباً ۶ کوس (۱۲،۱۸ کلومیٹر) [ہندوستان کے مختلف حصّوں میں کوس مختلف ہوتے تھے۔ شمالی ہندوستان اور پنجاب کے علاقے میں ایک کوس = ۲،۰۳ کلومیٹر، دریائے گنگا کے کنارے والے علاقے میں ایک کوس = ۳،۶۵ کلومیٹر اور دکن کے علاقے میں ایک کوس = ۶،۴۸ کلومیٹر] فاصلے سے واقع بابکوال میں رہتے تھے۔ ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) کو وصال ہوا۔ "زندہ دل مہربان مصائب خاں" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ احمد شاہ ابدالی

۱۱۹۰ھ

دُرّانی آپ کا بہت معتقد تھا۔

حضرت شیخ جان محمد لاہوریؒ = آپ خلیفہ شیخ مصاحب خاں خوردؒ کے تھے۔ ۱۲۰۶ھ

(۱۷۹۱ء) میں بابک وال میں انتقال ہوا۔ ''غنی جان محمد'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۰۶ھ

حضرت شیخ عبداللہ شاہ بلوچ لاہوریؒ = مرید شیخ شرف الدین پانی پتیؒ کے تھے اور وہ مرید خاندان میاں میر لاہوریؒ کے تھے ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں وصال ہوا۔ ''مہدی اعظم عبداللہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۱۲ھ

حضرت سید شادی شاہ قادری لاہوریؒ = مکھو وال علاقہ گجرات پنجاب میں رہتے تھے۔ بعد میں چلہ کشی کے ارادہ سے لاہور میں آکر مخدوم داتا گنج بخشؒ کے مزارِ مبارک پر مقیم ہوئے۔ ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں وصال ہوا۔ ''میر شادی شاہ فردوس'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۲۱ھ

حضرت سید علی شاہ قادریؒ = سادات عظام گیلانی سے تھے ۱۲۰۷ھ (۱۷۹۲ء) میں احمد آباد دکن سے لاہور تشریف لاکر دریائے راوی کے کنارے قیام کیا لیکن دریا میں آئی طغیانی کے وقت لاہور شہر میں تشریف لے آئے۔ مرید سید غازیؒ کے، وہ شاہ اعظمؒ کے، وہ شاہ اکرمؒ کے، وہ شاہ خلیلؒ کے، وہ شیخ منّا کے، وہ شاہ مصطفیٰؒ کے، وہ شاہ میاجیؒ کے، وہ سید پیرؒ کے، وہ شاہ کرم علیؒ کے، وہ شاہ مسعودؒ کے، وہ شیخ نور محمدؒ کے، وہ شیخ احمدؒ کے، وہ شیخ صوفیؒ کے، وہ شیخ رحمت اللہؒ کے، وہ شیخ فضل اللہؒ کے، وہ سید عبدالوہابؒ کے اور وہ والدِ ماجد غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تھے۔

۱۲۲۷ھ (۱۸۱۲ء) میں وصال ہوا۔ ''فضلِ نورانی'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۲۷ھ

مزار شریف بمقام جھنگی چراغ شاہ، لاہور میں واقع ہے۔

حضرت سید میر میراں شاہ لاہوریؒ = آپ مرید اپنے والد سید مبارک حقانی گیلانیؒ کے تھے۔ اوچ سے آکر لاہور میں خدمتِ خلق میں مشغول ہو گئے تھے۔ ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں وصال ہوا۔ ''مخزن الانوار'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۸۶ھ

حضرت میراں سید مبارک حقانی گیلانیؒ = فرزند و مرید محمد غوث گیلانی اوچیؒ کے، صاحب سکر بزرگ تھے۔ لاہور تشریف لاکر خدمتِ خلق میں مشغول ہو گئے تھے۔ ۹۵۶ھ (۱۵۴۹ء) میں انتقال ہوا۔ جسدِ خاکی لاہور سے اوچ لے جاکر والد کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ ''سید مبارک پیر رہبر'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۵۶

حضرت شاہ سید خیر الدین ابو المعالی قادری کرمانی لاہوریؒ = آپ فرزند سید رحمت اللہ بن سید فتح اللہؒ کے، ولیِ کامل اور صحیح النسب ساداتِ کرمانی سے نیز مرید اپنے برادر زادہ شیخ داؤد شیر گڑھیؒ کے تھے۔ خرقۂ خلافت عطا فرمانے کے بعد شیخ نے آپ کو لاہور کی سمت میں مامور فرمادیا تھا۔ چنانچہ آپ لاہور تشریف لائے اور وہاں کی سکونت اختیار کرلی۔ آپ صاحبِ دیوان اور صاحبِ تصانیف بھی تھے۔ ۱۶/ربیع الاوّل ۱۰۲۴ھ (۱۸۰۹ء) کو وصال ہوا۔ ''افضل اقطاب'' سے سنہ

۱۰۲۴ھ

وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف لاہور میں موتی دروازہ کے باہر مرجعِ خلائق ہے۔

میاں نتھا شاہ قادریؒ = آپ خلیفہ میاں میر بالا پیرؒ کے اور صاحب کشف و کرامات بزرگ ہوئے ہیں۔ پیشے سے آپ تیلی اور ناخواندہ تھے لیکن جو بھی عبارت سامنے آتی اس کو بخوبی پڑھ لیتے تھے۔ ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۷ء) میں وفات پائی۔

"محبوب بہشتِ بریں" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ آپ کے وصال پر میاں میرؒ نے

۱۰۲۷ھ

آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ رونق فقیر کی میاں نتھاؒ لے گئے اور وصیت فرمائی کہ میرے انتقال کے بعد مجھے بھی میاں نتھاؒ کے پاس دفن کر دینا۔ چنانچہ میاں نتھاؒ کا مزار مبارک درگاہ میاں میرؒ کے احاطے میں واقع ہے۔

حضرت ملاّ حامد قادریؒ = آپ علومِ ظاہری و باطنی اور رموزِ طریقت و حقیقت میں یکتا اور کلام اللہ پڑھنے میں لاثانی تھے۔ پہلے میاں میرؒ کے سخت مخالف تھے لیکن بعد میں ان کے مرید ہو کر عبادتِ معبود میں مشغول ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں ولایتِ کمال کو پہنچے۔ ۱۷ر رمضان المبارک ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) کو وصال ہوا۔ "مقتدائے اہل جنت" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف روضۂ میاں میرؒ میں

۱۰۴۴ھ

واقع ہے۔

حضرت سیّد اسماعیل گیلانیؒ = آپ مرید اپنے والد سید عبداللہ ربانیؒ کے تھے۔ جب آپ کا شہرہ ہوا تو اکبر نے برائے زیارت آپ کو لاہور میں طلب کیا اور ایک ہزار بیگھ پختہ زمین زرخیز وزرعی فیروز پور کے علاقے میں نذر کی۔ ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں وصال ہوا۔ "نیرِ نور میر اسماعیل" سے آپ کا سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۷۸ھ

مزار شریف لکھی محلہ میں متصل درگاہ حضرت میران محمد شاہ موج دریا بخاریؒ واقع ہے۔

حضرت شیخ مادھو قادری لاہوریؒ = آپ اکمل خلیفہ شیخ حسین لاہوریؒ کے تھے۔ آپ کے والد برہمن اور شاہدرہ کے رہنے والے نیز پاک صورت وطینت انسان تھے۔

۲۲/ذی الحجہ ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء) کو وصال ہوا۔ "سحر معرفت ماد ھوؒ"
۱۰۵۶ھ

"مہ اعظم"، "شمع مروّت" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۵۶ھ ۱۰۵۶ھ

حضرت خواجہ بہاریؒ = آپ میاں میرؒ کے خلیفہ، عالم، فقیہہ اور محدث تھے۔ پہلے حاجی پور میں رہتے تھے، بعدہٗ لاہور آ کر شیخ محمد فاضلؒ سے حدیث صحیح کی اور اس کے بعد میاں میرؒ کے مرید ہو گئے۔ آپ کی بہت سی کرامات مشہور ہیں سنہ ۱۰۶۰ھ (۵۰/۱۶۴۹ء) میں وصال ہوا۔ "سلطان الولی خواجہ بہاری" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۶۰ھ

سید غلام غوثؒ و شاہ حاکمؒ = دونوں بزرگ صاحب کرامات گزرے ہیں۔ سید غلام غوثؒ کی وفات ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) میں اور شاہ حاکمؒ کا وصال ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) میں ہوا۔ "شیخ حق آگاہ" اور "مکمل شیخ" سے سنہ وصال نکلتے ہیں۔ لاہور سے
۱۰۴۵ھ ۱۰۴۰ھ

کچھ فاصلے پر دریائے راوی کے کنارے بمقام علی پور دونوں بزرگوں کے مزارات واقع تھے۔ جب دریا کٹاؤ کرتا ہوا مزارات کے قریب آیا تو نعش ہائے سید غلام غوثؒ، شاہ حاکمؒ اور سید عوض علیؒ قبر سے نکال کر دیگر جگہ مدفون کر دی گئیں۔ جب میتیں نکالی گئیں تو اللہ کے کرم و فضل سے بالکل تر و تازہ تھیں حتیٰ کہ کفن تک بھی میلا نہ ہوا تھا۔

سید جان محمد حضوری لاہوریؒ = آپ مرید اپنے والد شاہ نورؒ بن سید محمود حضوریؒ [اولاد امام موسیٰ کاظمؒ] کے اور صاحب عظمت و ہیبت نیز مرجع خلائق بزرگ ہوئے

ہیں۔ ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) میں وصال ہوا۔ "فیضِ دیں سالک" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۶۵ھ

حضرت سید عبد الرزاق شاہ چراغ لاہوریؒ = آپ مرید اپنے والد سید عبد الوہاب بن سید عبد القادر ثالثؒ بن سید محمد غوث بالا پیرؒ بن سید زین العابدینؒ بن سید عبد القادر ثانیؒ بن سید محمد غوث اوچیؒ کے تھے۔ جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کے جد (دادا) نے فرمایا کہ ہمارے گھر چراغ پیدا ہوا ہے۔ پس تبھی سے شاہ چراغ مشہور ہوئے۔ آپ کو سیاحت کا بہت شوق تھا۔ شاہجہاں آپ کا بہت معتقد تھا۔ ۲۲/ ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) کو وصال ہوا۔ "سراج الاتقیاء قطبِ معلےٰ"
۱۰۶۸ھ
سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ شاہجہاں نے آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ والد کے پہلو میں دفن ہیں۔

حضرت سیّد مصطفےٰؒ = مرید اپنے والد، سید عبد الرزاق شاہ چراغ کے تھے۔ ۱۳/ شعبان المعظم ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) کو وصال ہوا۔ "سید مصطفےٰ جمالِ بہشت" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ والد کے پہلو میں دفن ہیں۔
۱۰۸۲ھ

حضرت شیخ شاہ محمد ملّا شاہ قادریؒ = خلیفۂ اعظم میاں میرؒ کے تھے۔ آپ کی کنیت اخوند اور لقب لسان اللہ تھا۔ آپ کے والد، ملّا عبدؒ علاقہ روستاق اقلیم بدخشاں میں واقع ارکسان کے رہنے والے تھے۔ آپ وہیں پیدا ہوئے لیکن بعد میں طلب حق دامن گیر ہوئی اور کشمیر ہوتے ہوئے لاہور تشریف لے آئے نیز میاں میرؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت ہوئے اور وہیں رہنے لگے۔ آپ صاحب دیوان بھی تھے۔ ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۸ء) میں وصال ہوا۔ "محبوبِ اعظم" اور "قطب شیخ اولیاء"
۱۰۶۹ھ ۱۰۶۹ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف درگاہ میاں میرؒ میں زیارت گاہِ خلق ہے۔

حضرت حاجی عبدالجمیلؒ = آپ خلیفہ شیخ زنگ بلاولؒ کے، وہ مرید شیخ مادھوؒ کے اور وہ مرید شیخ حسین لاہوریؒ کے تھے۔ "درگاہ قدم" دہلی دروازہ کے باہر آپ ہی نے تعمیر کرائی تھی۔ سنہ ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) میں وصال ہوا۔ "محبوب شیخ الجمیل" سے

۱۰۸۲ھ

سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف متصل روضۂ قدم رسولؐ واقع ہے۔

حضرت حاجی محمد ہاشم گیلانیؒ = آپ ساداتِ عظام گیلانی اور سید محمد غوثؒ کی اولاد سے تھے۔ شجرہ اس طرح سے ہے: سید محمد ہاشمؒ بن سید صفی علیؒ بن سید بدرالدینؒ بن سید اسماعیلؒ بن سید عبداللہ ربانیؒ بن سید محمد غوث حلبی اوچی گیلانیؒ۔ آپ ممالکِ عرب و عجم و شام و عراق کی سیر کرتے ہوئے نیز مشائخِ عظام سے مستفید و مستفیض ہوتے ہوئے لاہور وارد ہوئے۔ ۱۲۰ برس کی طویل عمر پائی۔ ۷/ محرم الحرام سنہ ۱۰۸۷ھ (۱۶۷۶ء) بروز جمعہ وصال پایا۔ "ماہتاب ہاشمی قطب صفا"

۱۰۸۷ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

حضرت سید محمد فاضل متوکلؒ = آپ سید ہاشم گیلانیؒ کے فرزند اور صاحبِ توکل و عبادت و ریاضت نیز دائم الصیام بزرگ تھے۔ اورنگ زیب آپ کا بہت معتقد تھا۔ ۲/ ذی الحجہ سنہ ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) کو وصال ہوا۔ "قطب الہند فاضل" سے سنہ

۱۱۱۲ھ

وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف متصل خانقاہ سید اسماعیل محدثؒ ہے۔ آپ کا بلند و بالا گنبد دار مقبرہ اور ایک خوشنما مسجد اورنگ زیب نے تعمیر کرائے تھے۔ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں دیگر مقابر کے ساتھ آپ کے مزار سے بھی پتھر اکھاڑ لئے گئے۔

حضرت شاہ رضا قادری شطاری لاہوریؒ = آپ مرید قاضی شیخ محمد فاضل لاہوریؒ کے تھے، وہ مرید شیخ الہ داد قادری اکبر آبادیؒ کے، وہ مرید شیخ محمد جلالؒ کے، وہ مرید سید نورؒ کے، وہ مرید سید زین العابدین حسینیؒ کے، وہ مرید شیخ عبدالغفورؒ کے، وہ مرید شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ کے اور وہ مرید شاہ محمد غوث گوالیاریؒ کے تھے۔

۱۲؍ جمادی الاوّل ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) کو وصال ہوا۔ ''محبوبِ جہاں رضا'' اور
۱۱۱۸ھ
''ہادی زمن رضا'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۱۱۸ھ

حضرت شاہ درگاہی قادری لاہوریؒ = آپ خلیفہ حضرت عبدالرزاق شاہ چراغ گیلانی کے تھے۔ شاہ چراغؒ کے ہمراہ لاہور وارد ہوئے۔ ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں وصال ہوا۔ ''قطب سردار شاہ درگاہی'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف
۱۱۲۲ھ
متصل چاہ پاتیانوالہ واقع ہے۔

حضرت سید عبدالوہاب لاہوریؒ = آپ مرید اپنے والد، سید سرور دینؒ بن سید جان محمد حضوریؒ کے تھے۔ ۲۱؍ شوال المکرم ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۸ء) بروز جمعہ وصال ہوا۔ ''افضل مکمل عبدوہاب'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۱۳۱ھ

حضرت سید بدرالدین گیلانی لاہوریؒ = آپ سید علیؒ بن حاجی سید محمد ہاشمؒ کے فرزند تھے۔ والدہ کا نام بی بی سید بی بیؒ تھا جو سادات بخاری سے تھیں۔ محمد معزالدین جہاندار شاہ بادشاہ آپ کا بہت معتقد تھا۔ اس نے آپ کو ایک لاکھ روپیہ اور بہت سی جاگیریں نذر کیں۔ ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۳ء) میں آپ کا وصال ہوا۔

''بدر دین پیرِ دین شریف'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۳۶ھ

حضرت شاہ عنایت قادری شطاریؒ = آپ شاہ رضا قادری شطاری لاہوریؒ کے مرید تھے سنہ ۱۱۴۱ھ (۲۸_۱۷ء) میں وصال ہوا۔ ''تاج یقینِ اہلِ عنایت'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۴۱ھ

حضرت شاہ سلیمان قادریؒ = آپ صاحبِ سجادہ شاہ معروف چشتی قادریؒ کے تھے، سُکر اور عشق و محبت میں شان عالی رکھتے تھے۔ صاحبِ کرامات اور خوارق تھے۔ ۱۳/ ذیقعدہ سنہ ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء) کو وصال ہوا۔

''شیخ دینِ کامل''، ''سلیمان پیر شاہنشاہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۶۵ھ ۱۰۶۵ھ

سید عبدالرزاق بھاکریؒ = آپ اپنے والد سید عبدالخالق بھاکریؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ وفات ۹۴۳ھ (۱۵۳۶ء) میں ہوئی۔ ''حبیب اللہ عاشق عبدرزاق'' سے

۹۴۴ھ

سنہ وصال نکلتا ہے۔ سید جان محمد حضوریؒ کے روضہ کے متصل مزار شریف واقع ہے۔

میر نعمت اللہ [المشہور بہ سید مبارک لاہوریؒ] = سید عبدالقادر ثانی اوچیؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ قادریہ سلسلہ کے اعظم مشائخ میں شمار ہوتا تھا۔ پنجاب میں تشریف لاکر لاہور کی سکونت اختیار کی۔ ہمایوں کے عہدِ حکومت میں ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) میں وصال ہوا۔ ''ولی میر جہاں والی نعمت'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۶۲ھ

رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں ایک امیرِ دربار، خوشحال سنگھ نے آپ کے مزار

شریف کے متصل اپنی حویلی تعمیر کی اور احاطہ وغیرہ مسمار کر دیا۔ مزار شریف کو بھی نقصان پہنچا۔

سید کامل شاہ لاہوریؒ = سادات عظام بخاری سے تھے۔ شیخ اللہ داد مداریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ ۷ر صفر المظفر ۱۰۰۵ھ (۱۵۹۶ء) کو وصال ہوا۔ ''شاہنشاہ کامل قطب عالم'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ موضع بابو سابو

۱۰۰۵ھ

متصل بیرون شہر میں مزار شریف واقع ہے۔

پیر عزیز الدین لاہوریؒ [المشہور بہ پیر عزیز فرنگؒ (یا نیرنگؒ)] = عہدِ اکبری میں ولایتِ غور سے لاہور تشریف لا کر مقیم ہوئے۔ فرنگ (یا نیرنگ) مغلوں کی ایک شاخ ہے۔ ۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) میں وصال ہوا۔ ''کاشفِ برکت'' سے سنہ وصال

۱۰۲۳ھ

نکلتا ہے۔

سید عبد الخالقؒ = آپ سید عبد الواسع بن سید عبد الملک بھاکریؒ کے صاحبزادے، عظیم مشائخِ قادریہ میں سے، مرید و داماد سید محمود حضوریؒ کے اور صاحبِ خوارق و کرامات تھے۔ ۹۰۷ھ (۱۵۰۱ء) میں وصال ہوا۔ ''عبد خالق اہلِ دین''

۹۰۷ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

میر سید شاہ فیروزؒ = جامع علم و حلم و سیادت و نجابت و ریاضت واز سادات عظام گیلانی تھے، لاہور کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ آپ اپنے جد، شاہ عالمؒ سے، وہ شاہ نواز الدینؒ سے، وہ شیخ احمدؒ سے، وہ شیخ حامدؒ سے، وہ شیخ عبد الرزاق سے، وہ سید عبد اللہ گیلانی سے، وہ شیخ احمد قادریؒ سے، وہ سید میرؒ سے، وہ سید مسعودؒ سے، وہ سید علیؒ سے، وہ سید صوفیؒ سے اور وہ سید عبد الوہاب نور العین سید الکونین غوث الثقلین عبد القادر جیلانیؒ سے بیعت تھے۔

آپ کا سنہ ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) میں وصال ہوا۔ ''قطب الاصفیاء فیروز شاہ'' سے

۹۳۳ھ

سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف تکیہ ڈنڈی میں واقع ہے۔

سید عبداللہ شاہ گیلانیؒ [المشہور بہ پیر روڑانوالہؒ] = سادات عظام گیلانی سے، زہد و ریاضت میں طاق بزرگ ہوئے ہیں۔ پہلے آپ بغداد سے ایران تشریف لے گئے اور پھر وہاں سے ہند وارد ہو کر لاہور کی سکونت اختیار کر لی۔ سنہ ۱۰۶۵ھ (سنہ ۱۶۵۴ء) میں وصال ہوا۔ ''شاہ عبداللہ تاج الاصفیاء'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۶۵ھ

شیخ موسیٰ قادریؒ [المشہور بہ موسیٰ کھوکھرؒ] = شیخ بہلولؒ دریائیؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تھا۔ شیخ حسینؒ لاہوریؒ آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ شیخ بہلولؒ کے چار نامی گرامی خلفاء ہوئے: اوّل شیخ حسین لاہوریؒ، دوم شیخ موسیٰ کھوکھرؒ، سوم شیخ صدر الدین انصاریؒ (مزار شریف قصبہ قصور میں واقع ہے۔) اور چہارم شیخ ارزانیؒ (پٹنہ میں مزار شریف واقع ہے۔)

۵ محرم الحرام سنہ ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) بروز پنجشنبہ وصال ہوا۔ ''محب مہربان موسیٰ ثانی''

۱۰۲۵ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف بیرونِ لاہور بطرف جنوب واقع ہے۔

سید عبدالقادر بھاکریؒ = آپ سید عبدالوہابؒ کے فرزند، لاہور کے سادات عظام و اولیائے ذوی الکرام میں سے، جامع علوم ظاہر و باطن و واقف اسرار شریعت و طریقت تھے۔ سنہ ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) میں وصال ہوا۔ ''سید محمود عبدالقادر'' سے

۱۰۴۵ھ

سنہ وصال نکلتا ہے۔

میر عنایت اللہ [المشہور بہ مسکین شاہ] امری لاہوریؒ = میاں میر بالا پیرؒ کے مرید و خلیفہ نیز کمالات ظاہری و باطنی میں یکتا تھے۔ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں وصال ہوا۔ ''ولی درویش مسکین شاہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۵۲ھ

شاہ رستم غازی لاہوریؒ = شاہ عبدالخالقؒ سے بیعت تھے جو چند واسطوں سے سید عبدالرزاقؒ خلف الصدق حضرت غوث الاعظمؒ سے بیعت تھے۔ ۱۰۶۰ھ (۵۰/۱۶۴۹ء) میں وصال ہوا۔ سنہ وصال ''رستم دین رہنما'' سے نکلتا ہے۔

۱۰۶۰ھ

مزار شریف باغ زیب النساء بیگم کے متصل واقع ہے۔

سید جعفر علی گیلانیؒ = آپ حاجی محمد ہاشم علیؒ بن صوفی علی گیلانیؒ کے صاحبزادے، صاحب کرامات اور اپنے والد سے بیعت تھے۔ ۱۹/جمادی الثانی ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) بروز پنجشنبہ پیدا ہوئے اور ۹/رجب المرجب ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵ء) بروز شنبہ وفات پائی۔ ''جعفر مقدس متقی'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف املی والے تکیہ،

۱۱۰۷ھ

لاہور میں واقع ہے۔

سید عمر گیلانیؒ = سید محمد ہاشم گیلانیؒ کے مرید و خلیفہ نیز فرزند تھے۔ ۱۶/شعبان المعظم ۱۱۱۵ھ (۱۷۰۳ء) بروز یکشنبہ وفات پائی۔ ''عمر واصل شرع حق'' سے سنہ

۱۱۱۵ھ

وصال نکلتا ہے۔

شاہ شرف لاہوریؒ = آپ کے والد جو قوم سے ہندو کھتری اور رہنے والے قصبہ بٹالہ کے تھے، نے اسلام قبول کر لیا تھا اور بٹالہ ہی میں قانونگوئی کے عہدہ پر مامور ہو گئے تھے۔ آپ بٹالہ سے لاہور آ کر شیخ محمد فاضل قادری شطاریؒ سے بیعت ہو گئے

تھے۔ ۱۱۳۷ھ (۱۷۲۴ء) میں وصال ہوا۔ ’’محبوبِ دین تاج الشرف‘‘ سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۱۱۳۷ھ

سید رحیم اللہ بھاکریؒ = آپ اپنے والد، سید عبداللہؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ ۱۷ ارمحرم الحرام سنہ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) کو وصال ہوا۔ ’’خلیلِ عشق‘‘ سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۱۱۴۰ھ

سید عبداللہ بھاکریؒ = اپنے والد، سید عبدالقادر بھاکریؒ کے مرید و خلیفہ، مستجاب الدعوات بزرگ تھے۔ لاہور میں علمِ مشیخت کا طالبانِ حق کو درس دیتے تھے۔ ۹ ررمضان المبارک سنہ ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ء) کو وصال ہوا۔ ’’نورالکرامت عبداللہ‘‘ سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۱۰۹۰ھ

سید حاجی عبداللہ گیلانیؒ = والد کا نام سید اسماعیلؒ بن سید قاسمؒ بن سید صوفیؒ بن سید بدرالدینؒ بن سید اسماعیلؒ بن سید عبداللہ ربانیؒ تھا۔ نواب ذکریا خاں ناظم لاہور آپ کا بہت معتقد اور مرید تھا۔ ۱۱ رربیع الثانی ۱۱۴۱ھ (۱۷۲۸ء) کو وصال ہوا۔ ’’اہلِ نعمت مقتدا‘‘ سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۴۱ھ

شیخ محمد عظیم قادریؒ = سید شاہ مقیم محکم الدینؒ ساکن حجرہ کی اولاد سے تھے اور بیرونِ لاہور دریائے راوی کے کنارے موضع کوٹ بیگم کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ سنہ ۱۱۸۱ھ (۱۷۶۷ء) میں وصال ہوا۔ ’’اہلِ ہدا پاک محمد عظیم‘‘ سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۸۱ھ

شیخ محمود قادریؒ = شیخ محمد عظیم قادریؒ کے فرزند اور سید صدرالدینؒ بن سید عبدالرزاقؒ کے مرید و خلیفہ تھے۔ سنہ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں وفات ہوئی۔ ’’محتشم محمود میرِ بے نیاز‘‘ سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۱۲۱۶ھ

سید عادل شاہؒ [المشہور بہ سید تھو گیلانیؒ] = آپ سید فاضلؒ بن حاجی محمد ہاشمؒ کے فرزند، عالم و عامل اور عارف و کامل بزرگ تھے سنہ ۱۱۱۰ھ (۱۶۹۸ء) میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں وصال ہو گیا۔ ''محرم اسرارِ عشق'' سے سنہ وصال ۱۲۲۰ھ نکلتا ہے۔

شاہ سردار قادری شاہیؒ = شیخ جان محمد قادریؒ کے مرید، نہایت بزرگ و عابد و زاہد تھے۔ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں وصال ہوا۔ ''سردار ملک سیرت'' سے سنہ وصال ۱۲۲۵ھ نکلتا ہے۔

حضرت سید جیو عبدالقادر ثالثؒ = اپنے والد، سید محمد غوث بالا پیرؒ کے مرید تھے۔ محلہ رسولپور میں رہتے تھے۔ ۱۰۲۲ھ (۱۶۲۳ء) میں وصال ہوا۔

آپ کی دو صاحبزادیاں، بی بی کلاںؒ اور بی بی دولتؒ تھیں جن کی شادیاں بالترتیب میراں محمد شاہ موج بخاریؒ اور سید نظام الدینؒ بن سید میر میراںؒ بن سید مبارکؒ بن سید محمد غوثؒ سے ہوئی تھیں۔

حضرت شاہ غلام نبیؒ = مرید اپنے بزرگوار کے تھے لیکن فیضان روح پاک مخدوم گنج بخشؒ سے بھی حاصل کیا تھا۔ ۱۲۴۷ھ (۱۸۳۱ء) میں وصال ہوا۔

حضرت سید جعفرؒ = آپ مرید اپنے والد، سید ہاشمؒ بن سید صوفی علی گیلانیؒ کے تھے۔ ۹ رجب المرجب ۱۱۰۷ھ (۱۶۹۵ء) کو وصال ہوا۔ مزار شریف املی والے تکیہ میں واقع ہے۔

حضرت سید عبدالحکیم گیلانیؒ = آپ سید بایزیدؒ کے فرزند تھے۔ آپ کے بزرگ ۸۴۳ھ (۱۴۳۹ء) میں ایران سے ہند وارد ہوئے اور پھر ۹۳۴ھ (۱۵۲۷ء) میں سید نجم الدینؒ بابر کے ہمراہ دہلی تشریف لے آئے۔ آپ کے دادا، نظام الدینؒ پہلے ہی لاہور آ رہے تھے۔ آپ لاہور ہی میں پیدا ہوئے۔

بعد تحصیل علومِ ظاہری شیخ عبداللہؒ جن کا سلسلۂ بیعت غوث الاعظمؒ پر منتہی ہوتا ہے، سے بیعت ہوئے۔ سنہ ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۶ء) میں وصال ہوا۔

سید شاہ بلاقؒ لاہوریؒ = آپ سید عبدالکریم لاہوریؒ المشہور بہ پیر بہاونؒ کے والد اور صاحبِ جذب و استغراق بزرگ تھے۔ سلسلۂ قادریہ میں چند واسطوں سے نسبت میاں میر بالا پیرؒ سے تھی جو اس طرح سے ہے: سید شاہ بلاقؒ مرید شاہ عبدالرشید لاہوریؒ کے، وہ مرید شیخ محسنؒ کے، وہ مرید شیخ محمد المشہور بہ ملّا شاہ کے اور وہ مرید میاں میر بالا پیرؒ کے۔ سنہ وصال معلوم نہ ہو سکا۔ مزار شریف لاہور میں متصل چوبارہ چھجو واقع بتایا گیا ہے۔

سید عبدالکریمؒ جو اپنے والد شاہ بلاقؒ کے مرید تھے، کا وصال البتہ ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں ہوا، سنہ وصال "متقی پیشوا سید کریم" سے نکالا گیا ہے۔ مزار شریف بمقام میر پور واقع ہے۔ ۱۲۱۳ھ

۲۔ ''نقشبندیہ'' (''خواجگان'') سلسلہ سے وابستہ صوفیاء کرام

حضرت شیخ محمد طاہر لاہوری نقشبندی مجددیؒ = آپ خلیفہ حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ کے تھے۔ پہلے سلسلۂ قادریہ میں شاہ سکندرؒ بن شاہ کمال کیتھلیؒ کے مرید رہ چکے تھے۔ بعد میں طریقۂ چشتیہ، نقشبندیہ اور قادریہ میں صاحبِ اجازت ہو کر لاہور میں مامور ہوئے۔ ۸؍محرم الحرام ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۰ء) بروز پنجشنبہ بوقت چاشت وصال ہوا۔ ''شیخ مکمل'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۴۰ھ

آپ کے خلفاء میں سے شیخ ابو احمد قادری نقشبندی لاہوریؒ اور شیخ مکھنؒ لاہور میں آسودہ ہیں۔

حضرت خواجہ خاوندؒ [المشہور بہ حضرت ایشاںؒ] = آپ خواجہ علاؤ الدین عطارؒ کی اولاد سے، مادرزاد ولی اور مرید خواجہ ابو اسحاق سعیدؒ کے تھے۔ فیضان خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ کی روح سے بھی حاصل کیا تھا۔ ۱۲؍شعبان المعظم ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) کو وصال ہوا۔ ''منبع فیض'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف

۱۰۵۲ھ

شالامار باغ کے متصل واقع ہے۔ بعد وصال بھی آپ کی ہزاروں کرامتیں ظہور میں آئیں۔

حضرت شیخ سعدیؒ بخاری مجددی لاہوریؒ = خلیفہ شیخ آدم بنوریؒ کے تھے۔ وہ خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے تھے۔ بعد وصال شیخ کے لاہور میں مقیم ہو کر ہدایتِ خلق میں مشغول ہو گئے تھے۔ ۳؍ربیع الثانی ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۶ء) بروز چہار شنبہ

وصال ہوا۔ ''سعدیؔ عارفِ اکبر فقیر'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف پیر
۱۱۰۸ھ
عزیز فرنگ کے نام سے مشہور ہے۔

حاجی محمد سعیدؔ لاہوریؒ = سلسلۂ مجدّدیہ میں آپ مرید حافظ سعدؔ اللہؒ کے اور سلسلۂ قادریہ میں مرید سید محمودؒ بن سید علی حسینیؒ بسلسلۂ شاہ محمد غوثؔ گوالیاریؒ کے تھے۔ ۱۱۰ سال کی عمر میں ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) میں وصال ہوا۔ ''سحرِ معرفت حاجی سعیدؔ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۱۶۶ھ

سید محرمؔ علی نقشبندی لاہوریؒ = آپ قطبِ وقت تھے۔ حضرت مولانا فخر الدین دہلویؒ نے آپ سے ملاقات کر کے آپ کے فقر اور کمال کی بہت تعریف کی ہے۔ سنہ وصال معلوم نہ ہو سکا۔

شیخ حامدؔ لاہوریؒ = آپ حضرت شیخ آدم بنوریؒ کے خلیفہ تھے۔ ۲۲؍ جمادی الآخر ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) بروز پنجشنبہ وصال ہوا۔ ''شیخ حامدؔ کامل'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۵۴ھ

شیخ محمودؔ شاہ قادری مجدّدی لاہوریؒ = شیخ عبدالکریم مجدّدیؒ کے مرید تھے اور وہ شاہ غلام علی مجدّدی دہلویؒ کے مرید تھے۔ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۶ء) میں وفات پائی۔ ''شاہ عاقبت محمودؔ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف حضرت جھوتن شاہ بخاریؒ کے مزار کے متصل ہے۔
۱۲۸۳ھ

۳۔ ''سہروردیہ'' سلسلہ سے وابستہ صوفیاء کرام

سید جلال الدین مخدوم جہانیاںؒ

سید ناصر الدین محمود نوشاہیؒ

سید علم الدینؒ — سید احمد بخاریؒ [المخاطب بہ ذی نوبہار صاحب دستارؒ]

سید جلال الدینؒ — سید رکنی الدینؒ [المخاطب بہ ابوالفتح بخاری اوچیؒ]

سید علم الدین ثانیؒ — سید محمد شاہؒ

سید نظام الدینؒ — سید حامدؒ

سید صفی الدینؒ — سید بہاؤ الدینؒ

سلطان جلال الدین حیدرؒ — میراں محمد شاہؒ [المشہور بہ موج دریا بخاریؒ] — سید محمود اوچیؒ

سید عثمان جھولا بخاریؒ

سید صفی الدینؒ

سید عبدالرحیم

سید زندہ علی

سید شہاب الدین نہراؒ — سید شاہ محمد جھولا بخاریؒ

سید عماد الملکؒ — سید بہاؤ الدینؒ — شاہ عالمؒ — سید بہاون شاہؒ — سید محمودؒ

[سید جھولن شاہ بخاریؒ

المشہور بہ گھوڑی شاہ بخاریؒ]

[المشہور بہ

نورنگ جھولا بخاریؒ]

سید عارف شاہؒ — سید شہبازؒ [مـ ۱۰۴۱ھ]

سید کھیوی شاہؒ [مـ ۱۰۵۰ھ]

[مفصل شجرہ احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') میں ملاحظہ فرمائیں۔]

حضرت سید عثمان لاہوریؒ [المشہور بہ جھولا بخاریؒ] = آپ سادات اوچ کی اولاد سے تھے۔ جب لاہور میں تشریف لائے تو مرجعِ خلائق ہوئے۔ ۱۸ ربیع الاوّل ۹۱۲ھ (۱۵۰۶ء) کو وصال ہوا۔ ''امیرِ عثمان'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ شہنشاہ

۹۱۲ھ

اکبر نے جب قلعہ تعمیر کرایا تو مزار شریف قلعہ کے اندر آ گیا۔ ''پنج پیر'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

سید شاہ محمد جھولا بخاری لاہوریؒ = ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں وصال ہوا۔ مزار شریف موضع بلکھا، علاقہ لاہور میں واقع ہے۔ ''شہِ محمد عارف ربانی'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۱۱ھ

سید بہاؤ الدینؒ [المشہور بہ سید جھوکن شاہ بخاریؒ و گھوڑی شاہ بخاریؒ] = آپ مادرزاد ولی تھے۔ محض پانچ برس کی عمر سے ہی ظہورِ کرامات ہونے لگے تھے۔ وفات ۱۰ ربیع الاوّل ۱۰۰۳ھ (۱۵۹۴ء) میں ہوئی۔ ''جھوکن شاہ نامور'' یا ''عالم اسرار جھوکن شاہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۰۳ھ ۱۰۰۳ھ

سید محمودؒ [المشہور بہ شاہ نورنگ جھولا بخاریؒ] = آپ اہلِ دنیا سے بے نیاز، فقر و تجرید میں شان عالی رکھتے تھے۔ ایک دن ارشاد فرمایا کہ جو کوئی میری قبر کی خاک کا تعویز بنا کر گلے میں ڈالے گا انشاء اللہ شفایاب ہوگا۔ چنانچہ اہلِ لاہور آپ کے مزار سے سنگریزے لے کر بیمار کے گلے میں ڈالتے ہیں۔ وفات ۱۰۵۳ھ (۱۶۴۳ء) میں ہوئی۔

''شہِ مستقیم محمود'' اور ''شمعِ عشاق سید محمود'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۵۳ھ ۱۰۵۳ھ

سید عماد الملکؒ = آپ اولیائے لاہور سے گزرے ہیں۔ آپ کی وفات ۱۰۲۹ھ (۱۶۱۹ء) میں ہوئی۔ ''عماد الملک مخدومِ زمانہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۲۹ھ

آپ کا مزار سید جھوٹن شاہ گھوڑی بخاریؒ کے مزار کے سامنے تھا۔ سکھوں کی عملداری میں جب آپ کا مزار مسمار کیا گیا تو دیکھا کہ نعش بدستور رکھی تھی۔ کفن بھی میلا نہ ہوا تھا۔

حضرت موسیٰ آہن گر لاہوریؒ = آپ شیخ عبدالجلیل چوہڑ بندگی لاہوریؒ کے خلفائے نامدار میں سے ہوئے ہیں۔ ابتدائی دور میں شیخ شہر اللہؒ بن یوسفؒ [اولاد شیخ الاسلام شیخ بہاؤ الدین ملتانیؒ] سے ملتان میں بیعت ہوئے تھے۔ شیخ شہر اللہؒ کے وصال کے بعد شیخ عبدالجلیلؒ سے بیعت ہوئے۔ صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے۔ لوہار کا کام کرتے تھے۔ سلطان ابراھیم لودی کے عہد میں ۹۲۵ھ (۱۵۱۹ء) میں وصال ہوا۔ ''اہلِ دیں موسیٰ شہِ ابرار'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ روضہ عالی کا رنگ سبز تھا۔

۹۲۵ھ

حضرت شیخ حسن کنجد [المشہور بہ حسو تیلیؒ] لاہوریؒ = آپ شاہ جمال لاہوریؒ کے خلیفہ تھے۔ اوائل دور میں غلہ فروشی کا کام کرتے تھے جو بعد میں شیخ کے کہنے پر چھوڑ دیا تھا۔ ۱۰۱۲ھ (۱۶۰۳ء) میں وصال ہوا۔ ''شیخ اہل اللہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۱۲ھ

حضرت شیخ جان محمد لاہوریؒ = مرید اسماعیل میاں کلاں لاہوریؒ کے تھے۔ لاہور میں محلہ پرویز آباد میں رہتے تھے ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں وصال ہوا۔ ''شیخ دین جان محمد'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۲۰ھ

حضرت سید عبدالرزاقؒ [المشہور بہ سید مکیؒ] = آپ مرید میراں شاہ موج دریاؒ کے تھے۔ غزنی سے آکر چندے پشاور میں قیام کیا، بعد میں دہلی میں ملازمت اختیار کرلی۔ آخیر عمر میں اہلِ دنیا سے تنفر ہوکر اور شب و روز عبادت میں مصروف رہ کر ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں لاہور میں وفات پائی۔ ''محسن فیض'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۴۸ھ

حضرت شیخ محمد اسمٰعیل مدرسؒ [المشہور بہ میاں کلاںؒ] = شیخ عبدالکریمؒ کے مرید تھے۔ ۴۵ برس کی عمر میں لاہور میں محلہ نیل پورہ آکر تعلیم و تلقین میں مصروف ہوگئے۔ ایک جائے قیام مخدوم علی ہجویریؒ پر کیا۔ بعد ازاں محلّہ کے نزدیک واقع ایک پرانی مسجد میں درسِ قرآن فرمانے لگے تھے۔ ۹ رشوال المکرم ۱۰۸۵ھ (۱۶۷۴ء) میں وصال ہوا۔ ''شیخ دینِ عالی'' اور ''خواجہ مہدی قطب'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۸۵ھ ۱۰۸۵ھ

حضرت شیخ جان محمد سہروردی لاہوریؒ = ایک مسجد جو لاہور سے باہر تھی، اس میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔ مرید شیخ محمد اسمٰعیل مدرس میاںؒ کے تھے۔ ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۱ء) میں وصال ہوا۔ ''شیخ دینِ حق'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف متصل
۱۰۸۲ھ
مسجد قصاب خانہ قدیم واقع ہے۔

حضرت سید سلطان جلال الدین حیدرؒ = آپ فرزند سید صفی الدین بخاریؒ کے نیز حقیقی بھائی میران محمد شاہ موج دریا بخاریؒ کے اور کمالِ ظاہری و باطنی اور ترک و تجرید میں اپنی مثال آپ تھے۔ ۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء) میں وصال ہوا۔ ''خواجہ کشاف'' اور ''عاشق مقتدا'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔
۱۰۱۶ھ
۱۰۱۶ھ

مزار شریف لاہور میں بی بی حاج و تاج کے پاس ہے۔ عوام آپ کے روضہ کو استاد حضرات بیبیاں کہتے ہیں۔

حضرت شیخ سکندر شاہؒ = آپ فرزند شیخ کرم شاہ قریشیؒ [م ۱۲۰۱ھ (۸۶-۱۷۸۵ء) شہید] کے نیز درویش صاحب حال و قال اور شاعر بھی تھے۔ ۱۲۱۴ھ (۱۷۹۹ء) میں وفات پائی۔ ''عارف اکبر سکندر شاہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۱۴ھ

مزار شریف شیخ عبدالجلیل قطب العالمؒ کے مزار مبارک کے متصل ہے۔ آپ کے دو بھائی اور تھے جو دونوں ولی اللہ ہوئے ہیں۔ نام ان کے یہ ہیں: شاہ مراد قریشیؒ [م ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) موضع ملک مردان کھوکھرہ] اور شیخ قلندر شاہ قریشی حارثی ہنکاریؒ [م ۱۲۰۴ھ (۱۷۸۹ء) ۲۶ رمضان المبارک]۔ شیخ قلندر شاہؒ کے بھی ایک فرزند شاہ غلام محی الدینؒ تھے جو پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔

آپ کے والد، شیخ کرم شاہؒ بن ابوالفتح بن ابوالحسن ثانی بن فخر الدینؒ بن ابوالفتح بن برخوردارؒ بن ابوالفتح بن عبدالجلیل قطب العالم لاہوریؒ تمام عمر ہدایت خلق خدا میں مشغول رہے۔ سکھوں کے خروج کی وجہ سے وہ نقل مکانی کر کے اپنے ایک عزیز، شیخ نور الحسنین قریشی عقیلیؒ کے پاس مع اہل و عیال چلے گئے تھے۔ کچھ عرصے بعد لاہور واپسی پر راستے میں شاہجہان پور کے قریب شہید کر دیے گئے۔ ''شہادت یافت'' سے ان کا سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۰۱ھ

شاہ مراد قریشی لاہوریؒ = اپنے والد، شیخ کرم شاہؒ سے بیعت، نہایت عابد و زاہد و متقی نیز صاحب تصانیف تھے۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں وصال ہوا۔ ''شاہ کرامت بامراد'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۱۵ھ

سید فضل شاہ ساگر سانڈہؒ = شیخ قلندر شاہؒ کے خلفائے نامدار ہوئے ہیں۔ ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں وصال ہوا۔ ''داخلِ خلد'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف

۱۲۶۹ھ

موضع سانڈہ متصل لاہور واقع ہے۔

حضرت میراں محمد شاہؒ [المشہور بہ موج دریا بخاریؒ] = آپ کے والد کا نامِ نامی سید صفی الدینؒ تھا جو سید جلال الدین سرخ بخاریؒ کی اولاد سے تھے اور روحانیت و معرفت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ آپ ۹۴۰ھ (۱۵۳۳ء) میں اوچ شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ ہی کی دعاؤں کے طفیل اکبر چتوڑ فتح کر سکا۔ [تفصیل ص ۱۳۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔] ۷۳ سال کی عمر میں ۷ اربیع الاوّل ۱۰۱۳ھ (۱۶۰۴ء) کو خان فتا کہ بٹالہ میں انتقال ہوا مگر حسب وصیت لاہور میں مدفون ہوئے۔ ''محمد شاہ سلطان کاشفِ دیں'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ آپکی اہلیہ بی بی فاطمہ سیدہ گیلانی (م ۱۰۱۶ھ) بنت سید عبد القادر ثالث بھی ولیہ تھیں۔

سید شہاب الدین نہراؒ = آپ حضرت میراں محمد شاہؒ کے فرزند اور قطب الوقت نیز صاحب ہدایت و کرامت و خوارق بزرگ تھے۔ ۹۶۵ھ (۱۵۵۷ء) کو پیدا ہوئے اور ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) میں وصال ہوا۔ ''شاہ شہاب الدین نہرا'' سے

۹۶۵ھ

سنہ پیدائش اور ''شہاب الدین ولی لاثانی'' سے سنہ وصال نکلتے ہیں۔

۱۰۴۱ھ

حضرت شیخ عبد الجلیل قریشی حارثی الہنکاری لاہوریؒ [المعروف بہ قطب عالم چوہڑ بندگیؒ] = آپ اپنے والد، شیخ ابو الفتحؒ کے مرید، صاحب کرامت اور قطب وقت تھے۔ سلسلۂ نسب اس طرح سے ہے: شیخ عبد الجلیلؒ بن ابو الفتحؒ بن عبد العزیزؒ بن

شہاب الدینؒ بن نورالدینؒ بن سلطان التارکین حمید الدین ابوالغیثؒ حاکم بادشاہ کچھہ۔ آپ ''دلائل الخیرات'' بہت پڑھتے تھے اور جس پر مہربان ہوتے اس کو ''دلائل الخیرات'' پڑھنے کی ہدایت فرماتے۔ یکم رجب المرجب ۹۱۰ھ (۱۵۰۴ء) کو آپ کے یہاں ایک مجلس تھی جس میں بہت سے صوفیا کرام موجود تھے کہ آپ سجدہ میں گئے اور وصال فرما گئے۔ لاہور شہر کی آبادی (اس وقت) سے باہر لا کر دفن کر دیئے گئے۔ ''مہتابِ جہاں تاب'' ۹۱۰ھ سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

حضرت شیخ حامد قادری سہروردیؒ = والد کا نام شیخ حسنؒ تھا۔ آپ عالم، علمِ شریعت وطریقت و ماہرِ قرأت تھے۔ لاہور میں طلبا کو درس دیتے تھے اور مولوی تیمور لاہوریؒ کے مرید تھے۔ وفات ۱۱۶۶ھ (۱۷۵۲ء) میں ہوئی۔ ''حافظ و حامد حسن'' ۱۱۶۶ھ سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

حضرت شیخ قلندر شاہ قریشی حارثی ہنکاریؒ = آپ اپنے والد، شیخ کرم شاہؒ کے مرید تھے اور دیگر مشائخ سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ سلسلۂ چشتیہ میں مرید شیخ بدرالدین صابریؒ اور باقی سلاسل میں شیخ اجمل الہ آبادیؒ سے بھی اجازت یافتہ تھے۔ ۲۶/۲۱ رمضان المبارک ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) کو وصال ہوا۔ ''باغِ ارم جا'' ۱۲۴۸ھ سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

حضرت شاہ جمال قادری سہروردی لاہوریؒ = آپ کا سلسلۂ طریقت یہ ہے: آپ مرید شیخ لکرا بیگؒ کے، وہ شاہ شرفؒ کے، وہ شاہ معروفؒ کے، وہ شیخ جعفر الدینؒ کے، وہ شیخ رفیع الدین سہروردیؒ کے، وہ شیخ جمالؒ کے، وہ شیخ صدرالدین عارفؒ کے، وہ شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ کے۔

آپ سادات حسینی سے تھے۔ آپ نے لاہور آکر پہلے سات منزلہ خانقاہ بنائی۔

نواب سلطان بیگم بنت اکبر بادشاہ کا باغ اور تالاب نزدیک تھا۔ اس نے اعتراض کیا تو آپ نے ہنس کر فرمایا کہ یہ عمارت آج کی رات پست ہوجائے گی اور گھر فقیر کا تا قیامت رہے گا۔ باغ چندروزہ ہے۔ رات کو آپ نے سماع کرایا اور حالتِ وجد میں کھڑے ہوکر زمین پر پیر مارا، پس تمام منزلیں بجز تین منزل کے، پست ہوگئیں۔

منقول ہے کہ جس جگہ آپ کے مزار شریف کا تعویز ہے اس کے نیچے حجرے میں آپ حسب معمول چلہ کشی میں مصروف تھے اور حجرے کے دروازے مکمل طور پر بند تھے۔ آپ مسلسل تیس دن تک حجرے میں بند رہ کر یادِ الٰہی میں مشغول رہے۔ تیسویں دن [۱۴ ربیع الثانی ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) کو] بارش اس شدت سے ہوئی کہ آپ کے حجرے کی ایک دیوار گر پڑی۔ خادموں نے چاہا کہ حجرے کا دروازہ کھول کر آپ کو باہر نکالیں کہ ناگاہ اندر سے آواز آئی کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اب اس حجرے کو ہی میرا مدفن تصور کرو اور اس کے اوپر میری قبر کا تعویز بنادو۔ چنانچہ آپ کے منہ بولے بیٹے، شیخ فخرالدینؒ نے حجرے کو ہی مزار کی شکل دے دی۔ ''فیاضِ محسن'' سے آپ کا سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۴۹ھ

سید زندہ علیؒ = والدِ بزرگوار کا نام سید عبدالرحیمؒ بن سید صفی الدینؒ بن میراں محمد شاہ موج دریا بخاریؒ تھا۔ والد کی وفات کے بعد مسند نشین ہوئے۔ بہت عابد وزاہد ومتقی بزرگ تھے۔ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں پیدا ہوئے اور ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) میں وفات پائی۔ "معظم" (۱۰۵۰ھ) سے سنہ ولادت اور "نور بہشت زندہ امام" (۱۱۱۱ھ) سے سنہ وصال نکالے گئے ہیں مقبرہ شاہ موج دریا بخاریؒ میں ابدی نیند سوئے ہیں۔

۴۔ ''چشتیہ'' سلسلے سے وابستہ صوفیاء کرام

حضرت شیخ حاجی عبدالکریم چشتی لاہوریؒ = آپ مخدوم الملک شیخ عبداللہ انصاریؒ کے صاحبزادے اور سیدنا حضرت ابوایوب انصاریؒ کی اولاد سے نیز شیخ نظام الدین بلخی صابریؒ کے مرید تھے۔ آپ اپنے پیرِ مرشد کے ہمراہ بلخ میں رہے لیکن والد کی اندوہناک موت کے بعد لاہور میں آکر ہدایتِ خلق اللہ میں مشغول ہو گئے تھے۔ تفصیل احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد اوّل (''دودمانِ عالی'') میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۷ربیع الاوّل ۱۰۴۵ھ (۱۶۳۵ء) کو وصال ہوا۔ ''مقتدائے شفیق'' سے سنہ

۱۰۴۵ھ

وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف باغ زیب النساء کے متصل ہے۔

حضرت شیخ عبدالخالق لاہوری چشتی صابریؒ = آپ شیخ جان اللہ لاہوریؒ کے خلیفہ، اعلیٰ درجہ کے درویش اور صاحبِ سماع بزرگ تھے۔ ۱۲رجب المرجب ۱۰۵۹ھ (۱۶۴۹ء) کو وصال ہوا۔

صاحبِ ''خزینتہ الاصفیاء'' نے شیخ ابوالخالق چشتی صابریؒ نام سے بھی ایک بزرگ کا ذکر کیا ہے جن کو شیخ محمد سلیم چشتیؒ کا مرید بتایا گیا ہے اور ان کا سنہ وصال ۱۶رذی الحجہ ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) تحریر کیا گیا ہے۔ نیز سنہ وصال ''جان جنانِ میر خلق'' سے نکالا گیا ہے۔

۱۱۳۸ھ

چونکہ دونوں بزرگوں کے سنہ وصال میں کافی فرق ہے اور دونوں ہی الگ الگ

شیخ کے مرید بتائے گئے ہیں اس لئے اغلب خیال یہی ہے کہ دونوں الگ الگ بزرگ ہوئے ہیں جن کے مزارات لاہور میں واقع ہیں۔

حضرت شیخ لاہوریؒ [المشہور بہ میاں عارفؒ] = آپ شیخ اسحاقؒ بن شاہ کاکو نظامی چشتیؒ کے مرید تھے۔ شہنشاہ شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں لاہور میں شیخِ وقت کے نام سے مشہور ہوئے۔ ۱۰۶۴ھ (۱۶۵۳ء) میں دورانِ اعتکاف وصال ہوا۔ "عارف چشتی" سے سنہ وصال نکالا گیا ہے۔ شیخ محمد طاہر مجددی لاہوریؒ کے

۱۰۶۴ھ

مزار کے قریب مزار شریف واقع ہے۔

حضرت شیخ محمد سلیم چشتی صابری لاہوریؒ = آپ شیخ محمد صدیق چشتی لاہوریؒ کے خلیفہ، نہایت بابرکت اور صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ ۳/ذی الحجہ ۱۰۳۰ھ (۱۶۲۰ء) کو وصال ہوا۔ مزار شریف لاہور میں متصل مزار شریف پیرِ مرشد ہے۔ "فیضِ سلیم" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۳۰ھ

حضرت شیخ محمد صدیق چشتی صابری لاہوریؒ = آپ دن میں طلباء کو علومِ ظاہری کا درس دیتے اور شب کو طالبانِ حق کی تربیت فرماتے تھے۔ مرید و خلیفہ شیخ عبدالحق لاہوریؒ کے، وہ مرید شیخ عبدالجمیلؒ کے، وہ مرید شیخ محمد عرفائیؒ، وہ مرید شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ کے تھے۔ وصال ۸/ذی الحجہ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) کو ہوا۔ "رونق خلد" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۹۹۰ھ

حضرت شیخ محمد عارف چشتی صابری لاہوریؒ = آپ شیخ عبدالخالق لاہوری چشتی صابریؒ کے خلیفہ تھے۔ ۷/ذی الحجہ ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء) کو وصال ہوا۔

حضرت شیخ جان اللہ صابری لاہوریؒ = شیخ نظام الدین بلخیؒ کے خلیفہ اور علومِ ظاہری و باطنی سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ اوائل دور میں لاہور میں طلباء کو درس دیتے تھے۔ اس کے بعد تھانیسر جا کر شیخ نظام الدینؒ کے مرید ہوئے اور شیخ کے ہمراہ حج کرنے کے بعد بلخ میں خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ پھر لاہور میں آ کر خدمتِ خلق کرنے لگے۔ ۹ر جمادی الثانی ۱۰۳۹ھ (۱۶۲۹ء) کو وصال ہوا۔

حضرت شیخ حاجی رمضان چشتی لاہوریؒ = آپ خواجہ سلیمان چشتیؒ کے خلیفہ اور عالم و زاہد نیز صائم الدہر بزرگ تھے۔ حالتِ فقر اور تجرید سے گزارتے تھے۔ ماہِ رمضان المبارک ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء) میں پیدا ہوئے اور ۳ر رمضان المبارک ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۵ء) کو وفات پائی۔ ''کامل زندہ دل رمضان'' سے سنہ وصال

۱۲۸۲ھ

نکلتا ہے۔ مزار شریف شیخ محمد طاہر لاہوریؒ [سلسلہ ''قادریہ'' میں ملاحظہ فرمائیں۔] کے متصل ہے۔

حضرت شیخ بخش لاہوریؒ = سید حیدر علی شاہؒ کے مرید تھے۔ تجرید اور تفرید کے ساتھ ایام گزاری کرتے تھے۔ پیشہ ریشم سازی کا تھا۔ نہم رجب المرجب ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) کو وصال ہوا۔

حضرت شیخ خیر الدین خیر شاہؒ [المشہور بہ چشتی لاہوریؒ] = پنجاب کے مشہور شاعر ہوئے اور مرید شیخ محمد اسلم لاہوریؒ کے تھے۔ ۱۹ر ذی الحجہ ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) کو وصال ہوا۔

مولانا ملا عبدالسلام لاہوریؒ = آپ شہر لاہور کے معتبر فاضل تھے اور علمِ فقہ میں عالی رتبہ رکھتے تھے۔ تقریباً پچاس سال مسندِ افادہ و افاضہ پر متمکن رہے۔ (تفسیر) ''بیضاوی'' پر آپ کا حاشیہ ہے۔ کچھ عرصے شاہی لشکر کے مفتی بھی رہے۔

شاہجہاں بادشاہ نے آپ سے اکثر مروجہ کتابیں بھی پڑھیں۔ غرضیکہ آپ علمائے زمانہ میں افضل تھے۔ ۹۶۷ھ (۱۵۵۹ء) میں مولانا سعید ترکستانی سفرِ حجاز کے ارادہ پر ہندوستان تشریف لائے لیکن کنہیں وجوہات کے سبب ولایتِ ماوراء النہر کی طرف لوٹ جانا پڑا۔ ان کے بقول ''عالموں میں مولانا عبدالسلام لاہوریؒ ایک ہی سر برآوردہ وقت ہیں۔'' ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) میں آپ کا وصال ہوا۔

شاہ کاکوؒ = آپ شیخ نورالدین قطب العالمؒ کے خلیفہ اور چند واسطوں سے بابا فریدالدین گنج شکرؒ کی اولاد سے تھے۔ شیخ پیر محمد لاہوریؒ سے بھی فیضان حاصل کیا تھا اور بعد تکمیل و عطائے خرقۂ خلافت لاہور میں مقرر ہوئے۔ آپ سے بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں۔ ۸۸۲ھ (۱۴۷۷ء) میں وصال ہوا۔ ''شاہ اکبر شاہ کاکو'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۸۸۲ھ

سید الٰہ بخش لاہوریؒ = آپ حضرت شیخ نظام الدین بلخیؒ کے مرید وخلیفہ تھے۔ وہ شیخ جلال الدین تھانیسریؒ کے، اور وہ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خلیفۂ اعظم تھے۔ آپ صائم الدہر، قائم اللیل بزرگ تھے۔ محض ایک مٹھی کھلیں آٹھ دن میں آپ کے افطار میں خرچ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ ترک اور تجرید کے ساتھ رہے۔ اکثر لوگ آپ کو لاہور میں ''خدا بین'' اور ''بعضے خدا نما'' کہتے تھے۔

شیخ الٰہ داد لاہوریؒ = آپ بھی حضرت شیخ نظام الدین بلخیؒ کے مرید وخلیفہ تھے۔ آپ نے اکثر کو صاحبِ ہدایت بنایا۔

شیخ عبدالکریم لاہوریؒ = آپ بھی حضرت شیخ نظام الدین بلخی کے مرید وخلیفہ تھے۔ صاحبِ کشف وکرامات بزرگ ہوئے ہیں۔

شیخ پیر محمد لاہوریؒ = شاہ کاکوؒ کے پیر ومرشد تھے۔

شاہ سر ربانی سلیم الدین لاہوریؒ = شیخ شمس الدین ترک پانی پتیؒ کے خلفائے عظام میں سے صاحبِ ذوق وشوق و وجد وسماع بزرگ تھے۔ خرقۂ خلافت عطا فرمانے کے بعد پیر روشن ضمیر نے لاہور روانہ فرمایا جہاں آپ نے طالبانِ حق کو درس دیا۔ ۷۴۹ھ (۱۳۴۸ء) میں وصال ہوا۔ ''زبدہ دین سر ربانی سعید'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ ۷۴۹ھ

۵۔ خانوادہ ہائے متفرق

سید ابوتراب [المعروف بہ شاہ گداؒ] حسینی قادری شطاری لاہوریؒ = آپ کا شجرۂ نسب اس طرح سے ہے: سید ابوترابؒ بن سید نجم الدینؒ بن شمس الدینؒ بن اسدالدینؒ بن زین الدینؒ (المشہور بہ زین العابدینؒ) بن یونسؒ بن عبدالوہابؒ بن عبدالہادیؒ بن ابوالبرکاتؒ بن انور علیؒ بن عبداللطیفؒ بن محمد شریفؒ بن ابوالمظفرؒ بن عبدالباقیؒ بن ابوالحسنؒ بن عبدالعزیز شیرازیؒ بن عبداللہؒ بن محمد امینؒ بن قدرت اللہؒ بن سید موسیٰؒ بن مسعودؒ بن صادقؒ بن احمدؒ بن سید باقرؒ بن حسنؒ بن زیدؒ بن جعفرؒ بن محمودؒ بن ہارونؒ، امام موسیٰ کاظمؒ بن امام جعفر صادقؒ

آپ کا اصل وطن شیراز تھا۔ وہاں سے مرشد کی تلاش میں ہندوستان وارد ہوئے اور گجرات میں شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ کی خدمت میں پہنچے اور مرید ہوئے۔ ان کے وصال کے بعد لاہور تشریف لے آئے۔

آپ کے چھ نامدار خلفاء ہوئے:۔

اوّل: قاضی محمد لاہوریؒ۔ مزار شریف آپ کے مزار کے متصل لاہور میں ہے۔

دوم: شیخ فاضلؒ۔ دہلی میں مدفون ہیں۔

سوم: شاہ جمالؒ۔ روہتاس میں مدفون ہیں۔

چہارم: لعل گداؒ۔
پنجم: احمد گداؒ۔
ششم: شہباز گداؒ
] تینوں کے مزارات آپ کے مزار کی حریم میں واقع ہے۔

۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء) میں وصال ہوا۔ ''شہ ولی سید گدائے بوتراب'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۷۱ھ

شیخ وجیہہ الدین [المشہور بہ پیر زہدیؒ] لاہوریؒ = آپ جامع علومِ ظاہری و باطنی، واقف اسرارِ خفی و جلی اور مقتدائے زمانہ تھے۔ مختلف سلاسل میں مختلف بزرگوں سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد آپ لاہور تشریف لائے اور سکونت اختیار کر کے ہدایتِ خلق میں مشغول ہو گئے۔ ۱۱۴۰ھ (۱۷۲۷ء) میں وصال ہوا۔ ''خلیلِ عشق'' اور ''مقدس شیخ زہدی'' سے سنہ وصال نکالا گیا ہے۔

۱۱۴۰ھ ۱۱۴۰ھ

شیخ فتح شاہ شطاری لاہوریؒ = آپ شاہ لطیف برہان پوریؒ کے اعظم خلفاء میں سے ہوئے ہیں جن کی سید محمد غوثؒ گوالیاریؒ تک نسبت اس طرح سے ہے: شاہ لطیفؒ مرید شیخ برہان سرالہیؒ کے، وہ مرید شیخ عیسیٰ زندہ دلؒ کے، وہ مرید شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ کے اور وہ مرید سید محمد غوث گوالیاریؒ کے۔ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں وصال ہوا۔ ''فتحِ دین فتاح ابوابِ زمن'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۵۰ھ

خواجہ ایوب قریشی لاہوریؒ = صاحبِ کشف و کرامات بزرگ اور ''سہروردیہ'' سلسلہ میں مولانا مفتی حافظ محمد نقی لاہوریؒ کے مرید تھے۔ ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں وصال ہوا۔ ''شیخِ حق کامل ولی'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۱۵۵ھ

میر محمد یعقوب گیلانی لاہوریؒ = آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح سے ہے: بن میر محمد زمانؒ بن میر محمد حاجیؒ بن میر صدر الدینؒ بن سید نور الدینؒ بن سید بدر الدینؒ بن سید جعفرؒ بن سید احمدؒ بن سید مومنؒ بن میر صدرؒ بن شاہ قمیص قادریؒ بن ابی الحیاتؒ

بن تاج الدین محمودؒ بن بہاؤ الدین محمدؒ بن جلال الدین احمدؒ بن سید علی جمال الدین بن قاضی ابو صالح نصرؒ بن سید الآفاق شیخ عبدالرزاقؒ بن حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ۔

آپ سلسلۂ ''قادریہ'' میں مرید سید فضل علی لاہوریؒ کے، وہ مرید شیخ عبدالرحیم جاراللہؒ کے، وہ حاجی محمد سعید لاہوریؒ کے تھے۔

آپ کی وفات ۲۹ر صفر المظفر ۱۱۷۹ھ (۱۷۶۵ء) کو ہوئی۔ سنہ وصال ''خورشیدِ جہاں'' اور ''یعقوب مخدوم الکریم'' سے نکالی گئی ہے۔

۱۱۷۹ھ ۱۱۷۹ھ

شاہ حسین لاہوریؒ = آپ کے والد کا نام سید عبدالقادرؒ بن سید حمید گیلانیؒ تھا۔ ساداتِ گیلانی سے صاحبِ خوارق و کرامت، زاہد و متقی، عالم و عامل بزرگ ہوئے ہیں۔ ۱۱ر ربیع الثانی ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) کو وصال ہوا۔ ''شاہ عاشق مکرم حسین''

۱۲۰۵

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ مزار شریف اندرونِ شہر محلہ سید مٹھہ میں واقع ہے۔

مولوی غلام فرید لاہوریؒ = لاہور کے عظیم علماء میں شمار ہوتا تھا۔ ظاہری و باطنی کمالات سے آراستہ و پیراستہ تھے۔ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں وصال ہوا۔ ''تاجِ اخیار''

۱۲۱۶ھ

سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

مفتی رحیم اللہ لاہوریؒ = آپ مفتی رحمت اللہ قریشی لاہوریؒ کے صاحبزادے، عالم و فاضل اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔ سلسۂ نسب چند واسطوں سے شیخ الاسلام مخدوم بہاؤ الدین زکریا ملتانیؒ سے ملتا ہے۔ آخیر عمر میں مسجد کوٹلی مفتیاں میں درسِ قرآن مجید دینے میں مشغول ہوگئے تھے۔ ۱۲۳۵ھ (۱۸۱۹ء) میں وصال ہوا۔ ''رحیم اللہ فاضل'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۳۵ھ

مولوی غلام رسول لاہوریؒ = آپ مولوی غلام فرید فاضل لاہوریؒ کے صاحبزادے اور مولانا باتوقیر و فاضل کبیر تھے۔ سنہ وصال معلوم نہ ہو سکا۔

سید منور علی لاہوریؒ = آپ غوث الاعظم حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد سے اور سلسلۂ ''سہروردیہ'' میں اپنے والد، سید صابرؒ سے بیعت ہوئے۔ ۱۲۶۴ھ (۱۸۴۷ء) میں وصال ہوا۔ ''منور ولی ستارۂ نور'' سے سنہ وفات نکلتی ہے۔

۱۲۶۴ھ

حسبِ وصیت شیخ محمد طاہرؒ کے مزارِ مبارک کی چہار دیواری میں دفن ہوئے۔

شیخ لدہی شاہ لاہوریؒ = عابد و زاہد و متقی و خداترس و صاحبِ علم و خلق نیز خاندان ''قادریہ'' سے تھے۔ ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں وصال ہوا۔ ''مظہرِ حق'' سے سنہ وفات نکلتی ہے۔

۱۲۵۳ھ

مولوی غلام اللہ فاضل لاہوریؒ = آپ مولوی غلام فریدؒ کے صاحبزادے اور جید عالمِ باعمل تھے ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں وصال ہوا۔ ''غلام اللہ حق آگاہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۷۲ھ

مفتی غلام محمد قریشی لاہوریؒ = آپ مفتی رحیم اللہ قریشی کے صاحبزادے اور جید عالم و فاضل بزرگ ہوئے ہیں۔ ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں وصال ہوا۔ ''خورشیدِ دینِ محمد'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۲۷۶ھ

سید حمید لاہوریؒ = آپ کے والد کا نام سید سعیدؒ تھا جو سید عبدالقادر گیلانی لاہوریؒ کی اولاد سے تھے۔ شجرہ اس طرح سے ہے: سید سعیدؒ بن فتح محمد بن حاجی ابوبکرؒ بن سید عبدالقادر گیلانی لاہوریؒ۔

آپ کی تمام عمر ہدایتِ خلق میں بسر ہوئی۔ ۴ محرم الحرام ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ء)

کو وصال ہوا۔ "صدر دین سخی حمید" اور "اعظم الاولیاء" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۱۰۹۰ھ ۱۰۹۰ھ

مولانا عبدالرحمٰن لاہوریؒ = شہر کے مشہور علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ ۹۵۰ھ (۱۵۴۳ء) میں وصال ہوا۔ خوابگاہ لاہور میں ہے۔

مولانا حسان الدین لاہوریؒ = دونوں بزرگ شہر میں مختلف فنون میں ملکہ نیز
مولانا حسام الدین سُرخ لاہوریؒ = سلسلۂ "نقشبندیہ" سے ادارت رکھتے تھے۔ دونوں کا

وصال ۹۷۰ھ (۱۵۶۲ء) میں ہوا۔

سید احمد توختہ ترمذی ثم الاہوریؒ = آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح سے ہے: سید احمدؒ بن سید علی ترمذیؒ بن سید حسین ثانیؒ بن سید حسین محمد مدنیؒ بن سید شاہ ناصر مدنیؒ بن سید موسیٰؒ بن سید علیؒ بن امام علی اصغرؒ بن امام زین العابدینؒ بن امام حسینؓ۔

آپ بایمائی ربانی واشارۂ غیبی ترمذ سے ہندوستان وارد ہوکر لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔ مشائخ عظام اور ساداتِ لاہوری میں سے تھے۔ ۶۰۲ھ (۱۲۰۵ء) میں وصال ہوا۔ "سید ولی میر کبیر" سے سنہ وصال نکلتا ہے۔ محلہ چہل

۶۰۲ھ

بے بی میں مزارِ مبارک واقع ہے۔

حضرت سید مٹھہ لاہوریؒ = آپ کا اصل نام سید ابی غفار حسینیؒ ہے۔ نسبی شجرہ اس طرح سے ہے: سید ابی غفارؒ بن سید جمال الدینؒ بن سید محمدؒ بن سید کریم الدینؒ بن سید نور الدینؒ بن سید آدمؒ بن سید علی جعفرؒ بن سید محمدؒ بن سید یوسفؒ بن سید محمودؒ بن سید احمدؒ بن سید عبداللہ اشتریؒ بن سید جعفرؒ بن سید محمد الجوادؒ بن امام علی رضاؒ بن امام موسیٰ کاظمؒ بن امام جعفر صادقؒ بن امام محمد باقرؒ بن امام علی زین العابدینؒ بن حضرت امام حسینؓ۔

جب خوارزم چنگیز خاں کی بربریت کا شکار ہوا تو آپ کے والد، جمال الدین خوارزم سے نقلِ مکانی کر کے ہندوستان تشریف لے آئے اور لاہور میں سکونت اختیار کر لی۔

آپ بہت خلیق اور شیریں کلام تھے اسی لئے مٹھہ کے نام سے مشہور ہوئے اور جس محلّہ میں آپ مقیم تھے اس کا نام بھی آپ ہی کے نام پر مشہور ہوا۔ ۶۶۱ھ (۱۲۶۲ء) میں وصال ہوا۔ ''شیریں کلام'' اور ''صاحب نعمت'' سے آپ کا سنہ وصال نکلتا ہے۔

۶۶۱ھ ۶۶۱ھ

سید اسحاق گازرونی لاہوریؒ [المشہور بہ میراں بادشاہ] = آپ صاحب مقامات و بلند کرامات اور ساداتِ عظام حسینی نیز اپنے وقت کے شیخ المشائخ و قطب الاولیاء میں سے ہوئے ہیں۔ نسبتِ ارادت شیخ اوحدالدین اصفہانی [م ۷۳۸ھ (۱۳۳۷ء)] سے تھی۔ گازرون میں مقیم تھے کہ باشاراتِ غیبی ہندوستان وارد ہو کر لاہور کی سکونت اختیار کر لی اور ہدایتِ خلق میں مشغول ہو گئے۔

طویل عمر کو پہنچنے کے بعد ۷۸۶ھ (۱۳۸۴ء) میں وصال ہوا۔

نورِ الٰہی شاہ بو اسحاق'' اور ''سید محمود میراں بادشاہ'' سے سنہ وصال نکلتا ہے۔

۷۸۶ھ ۷۸۶ھ

۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) [دورِ شاہجہانی] میں حاکم لاہور، نواب وزیر خاں نے جامع مسجد اور آپ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔

سید غیاث الدین گیلانی لاہوریؒ = آپ سید عبدالقادر گیلانی لاہوریؒ کے صاحبزادے، متقی و پارسا، صاحبِ جذب و شوق و ذوق بزرگ ہوئے ہیں۔ سلسلۂ نسب اس طرح سے ہے: سید غیاث الدین دولت شاہؒ بن سید عبدالقادر ثانیؒ بن سید جمال الدینؒ بن سید جلال الدینؒ بن سید یوسفؒ بن سید سلطان رشیدؒ بن سید ادہمؒ

بن سید محمودؒ بن سید اسمٰعیلؒ بن سید داوٗدؒ بن سید فتح نصرؒ بن سید عبدالرزاق بن غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔

آپ کی والدہ میر کفایت خاں، امیر ہمایونی کی دختر تھیں۔ آپ تین بھائی تھے۔ آپ سے بڑے سید سلطانؒ اور آپ سے چھوٹے سید ابوبکر حاجیؒ تھے۔ آپ کا ۲۱ ر رمضان المبارک سنہ ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) کو وصال ہوا۔ ''افضل الاولیاء'' سے (۹۹۰ھ) سنہ وصال نکلتا ہے۔

سید محمد غوث گیلانی لاہوریؒ = آپ کے والد کا نام سید فتح محمدؒ، ان کے والد کا نام سید ابوبکرؒ اور ان کے والد کا نام سید عبدالقادر ثانی گیلانیؒ تھا۔ صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ والد کے وصال کے بعد ان کی مسندِ ارشاد پر تشریف فرما ہوئے۔ سنہ ۱۰۰۴ھ (۱۵۹۵ء) میں وصال ہوا۔ ''تاجِ کامل سید الابرار'' سے (۱۰۰۴ھ) سنہ وصال نکلتا ہے۔ والد کے مزار کے متصل مدفون ہوئے۔ اکبری عہد کے امراء میں سے نواب محمد زماں خاں نے مزارِ مبارک پر عالیشان گنبد تعمیر کرایا۔

مولانا میر کمال نیشاپوریؒ = آپ نیشاپور سے نقلِ مکانی کر کے لاہور تشریف لائے اور وہیں مقیم ہو گئے سنہ ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء) میں انتقال ہوا۔ مزار شریف سرائے حاجی سیاح میں واقع ہے۔

مولانا حاجی یار محمدؒ = آپ بہادر شاہ اوّل کے عہد میں فضلائے لاہور میں سے سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ جب بہادر شاہ نے یہ حکم جاری کیا کہ خطبۂ جمعہ میں ''علی ولی اللہ وصی رسول اللہ'' کے الفاظ کا اضافہ کیا جائے تو اہلِ سنت والجماعت نے آگرہ، احمد آباد و دیگر شہروں میں اس حکم کی مخالفت میں پرزور احتجاج کئے۔ احمد آباد میں تو جب خطیب نے اس پر عمل کیا تو ہجوم نے برافروختہ ہو کر اسے تہ

تیغ کرڈالا۔ لاہور میں بھی صورتِ حال نازک ہو گئی لیکن بادشاہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ بادشاہ نے توپ خانہ کے افسر کو حکم دیا کہ وہ جمعہ کے دن (۲/ اکتوبر ۱۷۱۱ء) بادشاہی مسجد کے منبر سے نئے احکام کے مطابق خطبہ پڑھے۔ اس پر اہلیانِ لاہور اور زیادہ مشتعل ہو گئے اور وہ لاکھوں کی تعداد میں شاہی احکام کی مخالفت کی غرض سے شہر کے گلی کوچوں اور سڑکوں پر جمع ہو گئے۔ صورتِ حال نازک دیکھ کر بادشاہ نے سنّی علماء کو بحث و مباحثہ کے لئے مدعو کیا۔ اُن علماء کے سرگروہ آپ تھے۔ آپ نے بادشاہ کو کھری کھری سنائیں۔ جب بادشاہ نے کہا کہ آپ میرے غضب سے نہیں ڈرتے تو آپ نے فرمایا کہ میری چار آرزوئیں تھیں: حصولِ علم، حفظِ قرآن، حج اور شہادت۔ خدا کے فضل و کرم سے ان میں سے تین پوری ہو چکی ہیں؛ اب زہے قسمت کہ چوتھی بھی حاصل ہو جائے۔ بالآخر بادشاہ کو احکام واپس لینا پڑا۔

آپ کا سنہ وصال نظر سے نہیں گزرا۔

شیخ رضی الدین عبدالغفورؒ = حضرت شیخ جامیؒ کے شاگرد تھے۔ وصال ۹۱۲ھ (۱۵۰۶ء) میں ہوا۔ مزار شریف لاہور میں واقع ہے۔

حضرت یعقوب زنجانیؒ (م ۴۶۰ھ) = تفصیلات ص......۲۰۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت موسیٰ زنجانیؒ (م ۴۴۰ھ) = تفصیلات ص......۲۰۹ پر ملاحظہ فرمائیں۔

شیخ ابوالمعالی الہ آبادیؒ = "تحفۃ القادریہ" کے مصنف ہیں۔ جس میں سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی سوانح عمری ہے۔ لاہور رہتے تھے۔ وہیں ۶/ اپریل ۱۶۱۵ء [۱۶/ ربیع الاول ۱۰۲۴ھ] کو انتقال ہوا۔

احمد ملا = ٹھٹھ کے قاضی کے لڑکے تھے۔ آباء واجداد سندھ کے باشندے اور فاروقی حنفی تھے لیکن ملا خود شیعہ عقیدہ کے تھے اور سنیوں کی دل آزاری کے واسطے خلفائے

ثلاثہ کو برا بھلا کہتے تھے چنانچہ مرزا فولاد برلاس (عہدِ اکبری میں) نے قاتلانہ حملہ کیا جس میں وہ تو بچ گئے لیکن مرزا کو اس جرم کے پاداش میں لاہور میں ایک ہاتھی کے پیر سے زندہ باندھ کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے دو چار دن بعد ہی ملاّ بھی مر گئے اور لاہور میں دفن ہوئے۔ بعد میں ان کی لاش کو نکال کر جلا دیا گیا۔ یہ واقعہ ۹۹۶ھ (۱۵۸۷ء) کا ہے۔

شیخ عبدالغفور لاہوریؒ = شیخ عبدالرحمٰن جامیؒ کے شاگرد اور مشہور مصنف تھے۔ ۶۶۳ھ (۱۲۶۴ء) میں وصال ہوا۔

شیخ قطب عالم لاہوریؒ = اصل نام شیخ نورالدین احمدؒ تھا۔ لاہور میں پیدا ہوئے۔ تمام عمر ذکر و شغل میں گزاری۔ شیخ حسام الدین مانک پوریؒ آپ ہی کے خلیفہ تھے۔ ۸۴۸ھ (۱۴۴۴ء) میں وصال ہوا۔ مزار شریف موضع پنڈوا (بہار) میں واقع ہے۔

چند مجاذیب کے اسماء

ناجی شاہ مجذوبؒ = "عاشقِ مست کامل حق نما" (۱۲۶۱ھ) سے سنہ وفات نکالا گیا ہے۔

فقیر نظام شاہ مجذوبؒ = "عاشقِ ازل سرمست" (۱۲۶۹ھ) سے سنہ وفات نکالا گیا ہے۔

مستان شاہ مجذوبؒ = "ماہِ دیں شاہ مستان شاہ" (۱۲۷۳ھ) سے سنہ وفات نکالا گیا ہے۔

مستقیم شاہ مجذوبؒ = "مستقیم روشن دل" (۱۲۴۰ھ) سے سنہ وفات نکالا گیا ہے۔

معصوم شاہ مجذوبؒ = "مجذوبِ عشق" (۱۲۲۱ھ) سے سنہ وفات نکالا گیا ہے۔

درویش محمد مجذوبؒ = سادات لاہور میں سے تھے۔ سنہ وصال معلوم نہ ہو سکا۔

شیخ یوسف مجذوبؒ = بلند قامت اور جسیم شخصیت کے مالک تھے۔ سنہ وصال معلوم نہ ہو سکا۔

[4] چند بزرگ/خاندان جو باھر سے لاھور وارد ھوئے

[مسلم حکمرانوں، خاصکر مغل بادشاہوں کی نوازشات، قدردانی کی وجہ سے مشائخ، نامور شجاع، علماء اور صوفیا وغیرہ اسلامی دنیا کے گوشے گوشے سے کھنچ کر ہندوستان وارد ہوئے۔ چنگیزی حملے بھی اس کا سبب بنے۔ غرضیکہ جو بھی خاندان یا فردِ واحد ہندوستان وارد ہوا، لاہور اس کی اقامت گاہ یا پھر گزرگاہ میں سے رہا۔]

شیخ الاسلام حضرت شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے مورثِ اعلیٰ، قاضی شعیبؒ، فرخ شاہ کابلیؒ کی شہادت کے بعد اپنے تین صاحبزدگان اور دیگر متعلقین و اہل و عیال کے ساتھ کابل سے ہند وارد ہو کر پہلے لاہور تشریف لائے اور بعد ازاں قصبہ قصور میں قیام فرمایا۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے آبا و اجداد بخارا کے رہنے والے تھے۔ اُن دنوں بخارا علم و تقویٰ کا خزانہ اور کان سمجھا جاتا تھا۔ حضرت شیخؒ کے پدری جدّ، خواجہ علی بخاریؒ اور مادری جدّ، خواجہ عربؒ ایک دوسرے کے ساتھی اور دوست تھے۔ یہ دونوں ایک ساتھ ہی بخارا سے پہلے لاہور وارد ہوئے اور پھر وہاں سے بدایوں تشریف لے گئے اور سکونت اختیار کر لی۔ ان دنوں بدایوں قبۃ الاسلام تھا۔ مزید تفصیلات احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد سوم (''منبع الاسرار'') میں ملاحظہ فرمائیں۔

خواجہ علی بخاریؒ | خواجہ عرب بخاریؒ
خواجہ احمد علی الحسین + زلیخاؒ | خواجہ عبداللہؒ | فرزند
سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ | خواجہ سعیدؒ
خواجہ عبدالعزیز
خواجہ حسنؒ
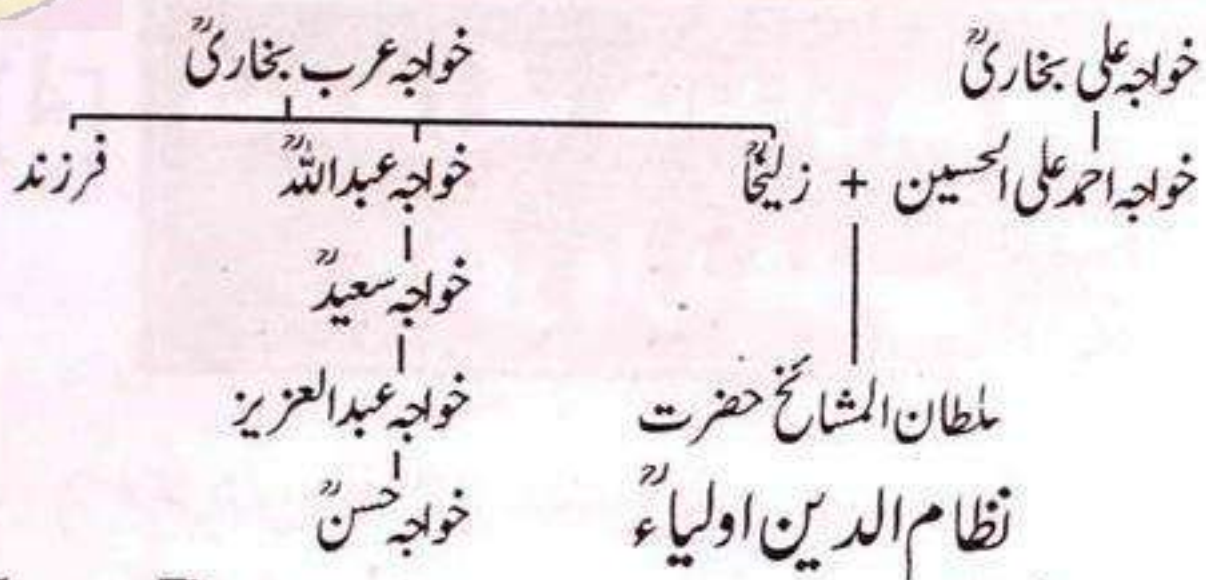
حضرت شیخ بدرالدین غزنویؒ (م ۶۵۷ھ (۱۲۵۸ء) پہلے غزنی سے لاہور تشریف لائے او پھر بعد میں دہلی آکر خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مریدین میں داخل ہو گئے۔

حضرت سید محمود حضوریؒ [م ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء)] (تفصیل ص ۲۱۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔) نے اپنے والد، سید شمس الدینؒ المشہور بہ شمس العارفین غوریؒ کے انتقال کے بعد غور سے تشریف لاکر لاہور کی سکونت اختیار کی۔

حضرت سید عبدالقادر گیلانیؒ [م ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء)] (تفصیل ص ۲۱۸ پر ملاحظہ فرمائیں) نے بغداد سے نقلِ مکانی کر کے لاہور کی سکونت اختیار کی۔

حضرت شیخ ابواسحاق قادریؒ [م ۹۸۵ھ (۱۵۷۷ء)] (تفصیل ص ۲۱۸ پر ملاحظہ فرمائی۔) کرمان سے لاہور وارد ہوئے۔

حضرت سید شاہ بلاول قادریؒ [م ۱۰۴۶ھ (۱۶۳۶ء)] (تفصیل ص ۲۲۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔) کے بزرگ ہمایوں کے ہمراہ ہرات سے وارد ہو کر لاہور میں سکونت پذیر ہوئے۔

حضرت شیخ شاہ محمد ملا شاہ قادریؒ [م ۱۰۶۹ھ (۱۶۵۸ء)] (تفصیل ص ۲۲۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔) علاقہ روستاق اقلیم بدخشاں سے تشریف لاکر لاہور میں مقیم ہوئے۔

حضرت سید عبداللہ شاہ گیلانیؒ [م ۱۰۶۵ھ (۱۶۵۴ء)] (تفصیل ص ۲۳۲ پر

ملاحظہ فرمائیں۔) نے بغداد سے تشریف لا کر لاہور کی سکونت اختیار کی۔

حضرت سید عبدالحکیم گیلانیؒ [م ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۶ء)] (تفصیل ص ۲۷۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔) کے دادا، شیخ نظام الدینؒ نے ایران سے وارد ہو کر لاہور کی سکونت اختیار کی۔

حضرت سید ابو ترابؒ (المعروف بہ شاہ گداؒ) [م ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء)] (تفصیل ص ۲۸۱ پر ملاحظہ فرمائیں۔) شیراز سے تشریف لا کر بالآخر لاہور میں مقیم ہوئے۔

حضرت سید احمد توختہ ترمذیؒ [م ۶۰۲ھ (۱۲۰۵ء)] (تفصیل ص ۲۸۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔) ترمذ سے ہند وارد ہو کر لاہور میں قیام پذیر ہوئے۔

حضرت سید مٹھہؒ [م ۶۶۱ھ (۱۲۶۲ء)] (تفصیل ص ۲۸۶ پر ملاحظہ فرمائیں۔) کے والد، سید جمال الدینؒ نے خوارزم سے نقلِ مکانی کر کے لاہور کی سکونت اختیار کی۔

حضرت سید اسحاق گازرونیؒ [م ۷۸۶ھ (۱۳۸۴ء)] (تفصیل ص ۲۵۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔) نے گازرون سے وارد ہو کر لاہور کی سکونت اختیار کی۔

مولانا میر کمال نیشاپوریؒ [م ۱۰۱۱ھ (۱۶۰۲ء)] (تفصیل ص ۲۵۸ پر ملاحظہ فرمائیں۔) نے نیشاپور سے تشریف لا کر لاہور کی سکونت اختیار کی۔

قاضی محمد اسلمؒ [م ۱۰۶۱ھ (۱۶۵۱ء)] جو ہرات میں پیدا ہوئے اور کابل میں پروان چڑھے، نے جہانگیر کے اوائل دور میں لاہور وارد ہو کر شیخ بہلولؒ جو وہاں کے مشہور علماء میں سے تھے، کی شاگردی اختیار کی۔

فغفوری گیلانیؒ (شاعر) ایران سے قندہار اور پھر لاہور آ کر مقیم ہو گیا۔

مشہور صوفی بزرگ، شیخ سراج الدین عثمانؒ المعروف بہ اخی سراجؒ جو سلاطینِ بنگال میں سے تھے، لاہور ہی سے آ کر بنگال میں آباد ہوئے تھے۔

حضرت شیخ علاؤ الحق والدینؒ (مرید شیخ اخی سراجؒ اور پیر و مرشد حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ) کے والد، حضرت شیخ عمرؒ بادشاہ بنگال کے وزیر تھے اور ان کے والد،

حضرت شیخ اسعدؒ لاہور کے رہنے والے تھے۔

قاضی سراج الدین [والد قاضی منہاج سراج جزجانی، صاحب ''طبقاتِ ناصری''] کے آبا و اجداد جوزجان کے رہنے والے تھے انھیں سلاطینِ غور کے دربار میں تقرب حاصل تھا۔ چنانچہ جب ۵۸۲ھ (۱۱۸۶ء) میں سلطان شہاب الدین محمد غوری کا لاہور پر قبضہ ہوا تو قاضی سراج الدین لاہور میں غوری افواج کے قاضی مقرر ہوئے۔

نور العین واقف نے پٹیالہ سے آ کر لاہور میں سکونت اختیار کی۔ اسی نسبت سے واقف لاہوری کے نام سے مشہور ہوا۔ وہیں اس کی شاعری نے نشو و نما پائی۔ اس کا ایک دیوان ملتا ہے۔ جس میں ۸ سو غزلیں فارسی کی درج ہیں۔ ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) میں لاہور میں انتقال ہوا۔ [''قاموس المشاہیر'' (جلد دوم) ص ۲۴۵]

منشی محبوب عالم جو ضلع گجرانوالہ میں ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے اور جنھوں نے ۱۸۸۸ء میں گجرانوالہ ہی سے ایک ہفتہ وار اخبار ''پیسہ'' نکالا، بعد میں لاہور منتقل ہو گئے تھے اور وہاں سے مذکورہ اخبار روزانہ جاری کیا۔ اس اخبار کے علاوہ انھوں نے ''شریف بی بی'' (لڑکیوں کے لئے) اور ''انتخاب لاجواب'' بھی ہفتہ وار نکالے۔ کئی وفود میں شامل ہو کر غیر ممالک کے سفر بھی کیے۔ [''قاموس المشاہیر'' (جلد دوم) ص ۱۶۱]

مولوی محمد حسین آزاد جو مولوی باقر علی (مشہور ''دہلی اردو اخبار'' کے مالک و مدیر) کے فرزند، دہلی کے باشندہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے چہیتے شاگرد تھے (آزاد تخلص شیخ ابراہیم ذوق کی ہی دین تھی)، نے ۱۸۶۴ء میں لاہور آ کر ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کے دفتر میں ملازمت کی اور ایک سرکاری اخبار ''اتالیق پنجاب'' کے سب ایڈیٹر بھی رہے۔ ۹ رمحرم ۱۳۲۸ء (۲۲ر جون ۱۹۱۰ء) کو انتقال ہوا۔ [''قاموس المشاہیر'' (جلد اوّل) ص ۷]

''العروض''، ''مشارق الانوار''، مصباح الدجیٰ''، ''کتاب الفرائض'' اور ''کتاب العبادت'' (نامکمل) وغیرہ کے مصنف مولانا صغانی (حسن) کے بزرگ اصفہان (چغان) سے آ کر لاہور میں مقیم ہوئے۔ وہیں ۱۵ر صفر ۵۷۷ھ (۱۱۸۱ء) کو مولانا موصوف پیدا ہوئے لیکن ۶۵۰ھ (۱۲۵۲ء) میں بغداد جا کر وفات پائی اور وصیت کے مطابق مکہ معظمہ میں دفن ہوئے۔ [''قاموس المشاہیر'' (جلد اوّل) ص ۱۹۴]

[۵] قابلِ دید چند یادگاریں

''بادشاہی مسجد'' = اس کو مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے ٹھیک لاہور قلعہ کے سامنے اپنے دودھ شریک بھائی اور صوبیدار لاہور مظفر حسین المعروف بہ فدائی خان کوکہ کی زیرِ نگرانی تعمیر کرایا تھا۔ تعمیراتی کام مئی ۱۶۷۱ء میں شروع ہوکر ۱۶۷۳ء میں مکمل ہوا۔ یہ سرخی چونے کے مصالحہ میں پکی لکھوری اینٹوں سے چنی ہوئی ہے۔ جس پر سنگِ سرخ لگایا ہوا ہے۔ سکھوں کے عہدِ حکومت میں اس کو بری طرح نقصان پہنچایا گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں تو اس کو فوج کے گھوڑوں کے لئے بطور اصطبل استعمال کیا گیا۔ انھوں نے اس میں سے قیمتی پتھر جیسے سنگِ مرمر، روبی اور سونا نیز دوسرا قیمتی سامان بھی نکال لیا۔ اُس دور میں تو اس میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی بھی اجازت نہیں تھی بلکہ اس مقصد کے لئے انھیں مسجد سے ملحق ایک چھوٹا سا قطعۂ آراضی دے دیا گیا تھا۔ جب انگریزوں کا لاہور پر تسلط ہوا تو انھوں نے اس پر قبضہ کرکے اس کو بندوق اور توپوں کی نشانہ بازی کے لئے استعمال کیا۔ انھوں نے اس خوف سے کہ کہیں مسلمان اس کو بطور قلعہ ان کے خلاف استعمال نہ کریں، اس کا کافی کچھ حصہ منہدم بھی کردیا لیکن بعد میں مسلمانوں کو مسجد واپس کردی گئی تھی۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۶۰ء کے عرصے میں اس کی ''بادشاہی مسجد اتھارٹی'' کے زیرِ نگرانی پوری طرح سے مرمت کرائی گئی جس پر ۴.۸ ملین روپیہ صرفہ آیا۔

یہ اسلام آباد کی ''فیصل مسجد'' کے بعد پاکستان کی دوسری سب سے بڑی مسجد ہے جس میں بیک وقت ۵۵،۰۰۰ نمازیوں کے نماز پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اس

کی ڈیزائن بالکل دہلی کی جامع مسجد جیسی ہے جس کو شاہجہاں نے ۱۶۴۸ء میں تعمیر کرایا تھا۔ فرق اتنا ہے کہ اس کی شمال والی دیوار دریائے راوی سے لگی ہونے (اس وقت) کی وجہ سے اس میں کوئی گیٹ نہیں دیا جا سکا اور Symmetry برقرار رکھنے کی خاطر اس کی جنوب والی دیوار میں بھی کوئی دروازہ نہیں دیا گیا۔

''لاہور کا قلعہ'' [شاہی قلعہ] = یہ قدیم لاہور کے شمال۔ مغربی گوشہ میں واقع اور Trapezoidal پلان میں ۲۰ ہیکٹیئر زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کو مغل شہنشاہ اکبر نے تعمیر کرایا تھا گو پہلے سے بھی اس مقام پر قلعہ رہ چکا تھا۔ (۱) بعد میں بھی مختلف حکمرانوں نے اس میں اپنے لحاظ سے ترمیمات کرائیں۔ اس میں واقع ''شیش محل''، ''عالمگیری گیٹ''، ''نولکھا پویلین'' اور ''موتی مسجد'' قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں ''شالیمار گارڈن'' اور اس پر "UNESCO" کی طرف سے World Heritage Site [عالمی وراثت والی جگہ] کندہ کرا دیا گیا ہے۔

''عالمگیری گیٹ'' = لاہور کے قلعہ میں داخل ہونے کا اس وقت یہ صدر گیٹ ہے۔ اس کو شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد میں ''بادشاہی مسجد'' کے ٹھیک سامنے تعمیر کرایا گیا تھا۔ اس کی ڈیزائن اس طرح سے کی گئی ہے کہ شاہی لشکر کے ہاتھی معہ سوار کے اس میں سے بآسانی نکل سکیں۔

یہ لاہور سے ۵ کلومیٹر فاصلے پر شمال۔ مشرق کی جانب، گرانڈ ٹرنک روڈ کے کنارے باغبان پورہ کے قریب واقع ہے۔

''شالیمار گارڈن'' = اس کو مغل شہنشاہ شاہجہاں کے عہدِ حکومت میں ۱۰۵۱ھ (۱۶۴۱ء) سے ایک سال کے عرصے میں امیر خلیل اللہ خان کی زیر نگرانی اور علی

مردان خان وملا علاؤ الملک تونی کے تعاون سے تعمیر کرایا گیا تھا۔ یہ اونچی اونچی پکی اینٹوں کی دیوار سے گھرا ایک Oblong Parallelogram (متوازی الاضلاع) کی شکل میں ہے۔ شمال سے جنوب تک اس کی لمبائی ۶۵۸ میٹر اور مشرق سے مغرب کی سمت میں اس کی لمبائی ۲۵۸ میٹر ہے۔

''لاہور قلعہ'' کے ساتھ ۱۹۸۱ء میں اس کو بھی "UNESCO" کی طرف سے بحیثیت World Heritage Site (عالمی وراثت کی جگہ) شمار کیا جا چکا ہے۔

گارڈن کی آبیاری کے لئے ۱۶۱ کلو میٹر فاصلے پر ''شاہ نہر'' (بعد میں یہ ''ہنستی نہر'' کے نام سے جانی گئی) کے نام سے ایک نہر بھی کھدوائی گئی جو گارڈن میں سے ہوتی ہوئی سنگِ مرمر کے ایک بہت بڑے حوض میں گرتی تھی۔

اس میں تقریباً ۴۱۰ فوارے بھی تھے جو دن رات سنگِ مرمر کی چوڑی چوڑی نالیوں میں ابلتے رہتے تھے۔ آجکل کے انجینیروں کے لیے یہ ایک معمہ بنا ہوا ہے کہ وہ فوارے جاری کس طرح سے ہوتے تھے۔

اس میں مختلف عمارتیں بھی تھیں، جیسے: ساون۔ بھادو، نقار خانہ، خواب گاہ، حمام، ایوان، آرام گاہ، مخصوص خوابگاہ (ملکہ کے لئے)، بارہ دریاں، دیوانِ خاص وعام وغیرہ۔ گارڈن کے دو گوشوں میں میناروں کے ساتھ آمد و رفت کے لئے دروازہ تھے۔

جس جگہ یہ گارڈن واقع ہے وہ اُس دور میں باغبان پورہ کے ایک امیر، میاں محمد یوسف کی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ انھوں نے اس مقصد کے لئے شہنشاہ کو یہ جگہ نذر کردی تھی جس پر شہنشاہ نے ان کو ''میاں'' کے خطاب سے نوازتے ہوئے اس گارڈن کا گورنر مقرر کردیا تھا۔ اس کے بعد تقریباً ۳۵۰ سالوں تک یہ ان کی

اولاد کی تحویل میں رہتا چلا آیا لیکن ''میاں فیملی'' کے ''مارشل لا'' کی مخالفت کرنے پر جنرل ایوب خاں نے اس کو Nationalised کردیا تھا۔

''مینارِ پاکستان'' = یہ ''اقبال پارک'' میں ''لاہور قرارداد'' (Lahore Resolution) کی یادگار بطور مغل اور عصرِ حاضر کے مشترکہ طرزِ تعمیر کی بنیاد پر تعمیر کرایا گیا ہے۔ اسی مقام پر ۲۳ / مارچ ۱۹۴۰ء یعنی آزادی سے تقریباً سات سال قبل، مسلم لیگ نے قیامِ پاکستان سے متعلق ایک قرارداد منظور کی تھی جو ''قراردادِ لاہور'' کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ برِ صغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ آزاد مملکت کے قیام سے متعلق پہلی باضابطہ قرارداد تھی۔ اس لئے اس دن ہر سال پاکستان میں قومی تعطیل ہوتی ہے۔

اس کا ڈیزائن ایک داغستانی نژاد پاکستانی آرکیٹیکٹ، نصیر الدین مراد خان نے تیار کیا تھا۔ ۲۳ / مارچ ۱۹۶۰ء کو اس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس کی تعمیر میں آٹھ سال کا عرصہ لگا اور کل پانچ لاکھ روپیہ صرفہ آیا۔ یہ ایک سطحِ زمین سے ۲ میٹر اونچے پلیٹ فارم پر تعمیر کیا گیا ہے۔ پلیٹ فارم کے اوپر مینار کی کل لمبائی ۶۰ میٹر ہے۔ اس کے اندر گھماؤ دار ایک زینہ (Spiral stair case) دیا گیا ہے جس میں ۱۶۲ اسیڑھیاں ہیں۔ مینار کا بالائی گنبد اسٹینلیس اسٹیل کا بنا ہے جس میں شیشے کے نازک ٹکڑے لگے ہیں۔ پورا Structure پتھر، سنگِ مرمر اور R.C.C کا بنا ہوا ہے۔ مینار کی کرسی چار چبوتروں پر مشتمل ہے۔ پہلا چبوترہ بنا تراشے تکشل اپتھر ہے، دوسرا ہتھوڑے سے تیار کئے گئے پتھر (Hammer Dressed Stone) سے، تیسرا چھینی سے تراشے گئے پتھر (Chiselled Stone) سے اور چوتھا پالش کئے گئے سنگِ مرمر جو پاکستان کی تحریک کو عیاں (Depict) کرتا ہے، سے بنایا گیا ہے۔ کرسی پر

سنگِ مرمر کی دس Converging زیبائشی تختیوں پر اردو، بنگالی اور انگریزی میں ''قراردادِ لاہور'' کا متن جو ۹ راپریل ۱۹۴۶ء کو منظور کیا گیا، کندہ کیا گیا ہے۔ کچھ زیبائشی تختیوں پر عربی میں قرآنی آیات، اللہ تبارک وتعالیٰ کے ۹۹ وصف؛ اردو اور بنگالی میں پاکستانی قومی ترانہ؛ اردو بنگالی اور انگریزی میں قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی تقاریر سے اقتباسات اور علامہ اقبالؒ کے چند اشعار کندہ کیئے گئے ہیں۔

''مقبرہ انارکلی'' = یہ لاہور قدیم کے جنوب میں، چیف سکریٹری آفس کے پشت پر اور لوور مال پر واقع پنجاب سیکریٹریٹ کے احاطے میں واقع ہے۔ اس تک جانے کے لئے سیکریٹریٹ کے صدر گیٹ سے ہو کر جانا پڑتا ہے۔ چنانچہ صرف آفس کے اوقات میں ہی یہ ممکن ہو پاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ انارکلی، شرف النساء یا نادرہ بیگم کا خطاب تھا جو حرم سرا کی ایک کنیز کی دختر تھی اور جس سے شہزادہ سلیم کو محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ اکبر نے اس کو زندہ چنوا دیا تھا۔ اس واقعہ کے ۱۶ سال بعد جب سلیم، شہنشاہ جہانگیر بنا تو اس نے یہ مقبرہ تعمیر کرایا۔ یہ کبھی ایک خوبصورت باغیچے کے بیچ و بیچ ہوا کرتا تھا لیکن اب اس کے چاروں طرف عمارتیں واقع ہیں۔ اسی مقبرہ کی وجہ سے جب انگریزوں نے یہاں فوجی چھاؤنی قائم کی تو اس پورے علاقے کا نام ہی انارکلی رکھ دیا۔

مقبرہ ''پلان'' (Plan) میں ہشت پہلو بنا ہوا ہے۔ اس کی ہر side یکے بعد دیگرے (Alternately) ۴۴ فٹ اور ۳۰ فٹ کی ہیں۔ انیسویں صدی کے پہلے وسط میں اس کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جنرل Jean Baptiste Ventura کی آرمینیائی بیوی کے لئے بطور رہائش؛ ۱۸۴۷ء سے اس کو برٹش ریسیڈینٹ، ہینری لارنس کے کلرکوں کے لئے بطور دفتر؛

۱۸۵۱ء سے بطور Divine Service اور ۱۸۵۷ء کے اوائل میں اس کو بطور ''سینٹ جیمس'' چرچ استعمال کیا گیا۔ پتھر کا تابوت جو عمدہ قسم کے سنگِ مرمر کا بنا ہوا ہے اور جس پر بہت ہی عمدہ نقاشی کا کام کیا ہوا ہے، کو جب اس مقبرہ کو بطور چرچ استعمال کیا گیا تو اٹھا کر الگ رکھ دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں اصل قبر فرش سے ۵ فٹ نیچے بالکل صحیح حالت میں پائی گئی۔ اس کے بعد قبر کو پختہ اینٹوں سے چن کر اس پر پلاسٹر کر دیا گیا جس کے اوپر چاروں جانب اللہ کے ۹۹ نام کندہ کر دیئے گئے ساتھ ہی اس کے نیچے فارسی میں ایک بیت بھی کندہ کر دیا گیا۔ اس فارسی بیت کا لطیف نے انگریزی میں یہ ترجمہ کیا ہے: "Ah! Could I be hold the face of my beloved once more, I would give thanks unto my God untill the day of resurrection"

[آہ! اگر مجھے ایک بار اور اپنی محبوبہ کا چہرہ دیکھنے کو مل جاتا تو میں تا قیامت اللہ کا شکر ادا کرتا۔]

اس پر جو سنہ ۱۰۰۸ھ (۱۵۹۹ء) اور سنہ ۱۰۲۴ھ (۱۶۱۵ء)، دو سنہ کندہ ہیں، وہ بالترتیب سنہ وفات اور تربت کے مکمل ہونے سے متعلق سنہ بتائے جاتے ہیں۔

اب تاریخ داں اس مقبرہ کو جہانگیر کی ایک بیوی، صاحبِ جمال کا بتاتے ہیں جس کا ۱۵۹۹ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔

اس میں لکڑی کا جو سجاوٹی کام تھا وہ غائب ہو چکا ہے۔ تمام روشندان بند کئے جا چکے ہیں اور اب یہ چونا پھرا ہوا محض ایک بڑا سا عماراتی ڈھانچہ بھر رہ گیا ہے۔

جب ۱۸۹۱ء میں اس میں سے گرجا گھر اپنی نئی عمارت میں چلا گیا تو اس کو پنجاب محافظ خانے کے بطور ریکارڈ آفس استعمال کیا جانے لگا تھا۔

''شاہ جہانگیر کا مقبرہ'' = اس کو شہنشاہ شاہجہاں نے جہانگیر کی وفات کے دس سال بعد تعمیر کرایا جو شاہدرہ میں پختہ چہار دیواری سے گھرے ایک خوشنما گارڈن میں واقع ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس کو نور جہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ مقبرہ کے اندر کا حصہ منقش دیواروں اور رنگین سنگِ مرمر سے مزین ہے۔ مقبرہ کے چاروں جانب والا گلیارہ رنگ برنگی سنگِ مرمر کی پھول پتیوں اور قرآنی آیات سے سجایا ہوا ہے۔ مقبرہ کے اندر، بیچ و بیچ سفید سنگِ مرمر کا تعویز ہے جس کے اطراف میں رنگین سنگِ مرمر سے دلکش پھول پتیاں بنی ہوئی ہیں؛ ٹھیک اسی طرح سے جس طرح آگرہ کے ''تاج محل'' میں موجود تابوت پر بنی ہیں۔ تابوت کے دو اطراف میں سنگِ موسیٰ سے اللہ تعالیٰ کے ۹۹ نام کندہ ہیں۔ جب خوشنما سنگِ مرمر کی جالیوں سے روشنی چھن کر آتی ہے تو اندر کا ماحول بہت دلکش معلوم دیتا ہے۔

''علامہ اقبال کا مقبرہ'' = یہ ''حضوری باغ'' میں واقع ''بادشاہی مسجد'' کے جنوب۔ مشرق والے صدر گیٹ کے پاس واقع ہے۔ اس کو حیدر آباد دکن کے چیف آرکیٹیکٹ، نواب زین یار جنگ بہادر نے ڈیزائن کیا تھا اور اس کی تعمیر میں ۱۳ سال لگے۔

علامہ کے ۱۹۳۸ء میں وصال کے ٹھیک بعد ''اقبال مقبرہ کمیٹی'' تشکیل دی گئی جس کے صدر چودھری محمد حسین منتخب ہوئے۔ انھوں نے نامور آرکیٹیکٹس سے رابطہ قائم کر کے مقبرہ کا ایک ایسا نقشہ تیار کرنے کو کہا جو لاہور میں موجود مغل دور کی تعمیرات سے ہم آہنگ ہو لیکن اس کی نقل نہ ہو بلکہ مورش طرزِ تعمیر کی افغان تشریح سے تخلیقی تحریک حاصل کرنے والا ہو۔ چنانچہ مقبرہ کا موجودہ ڈیزائن افغان اور مورش، دونوں طرزِ تعمیرات کی مشترکہ ترجمانی کرنے والا ہے۔

مقبرہ کی تعمیر میں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اوّل تو برٹش سرکار نے پروجیکٹ کو منظوری دینے میں کافی تاخیر سے کام لیا، دوئم جب علامہ کے دوستوں، شاگردوں اور مدّاحوں سے عطیات قبول کرنے کے بعد تعمیراتی کام شروع کرایا گیا تو مکرانہ (راجستھان) سے سنگِ مرمر اور جے پور (راجستھان) سے سنگِ سرخ کی درآمدات پر عارضی طور سے بندش لگ جانے کے سبب کام کو روکنا پڑ گیا۔

مقبرہ میں دو دروازے لگے ہیں جو ٹیک کی لکڑی کے ہیں۔ تعویذ جس پتھر میں بنایا گیا ہے وہ بہت قیمتی ہے جس کو افغانستان کی سرکار نے بطور عطیہ دیا تھا۔ مقبرہ کے اندر علامہ کی ایک غزل (زبور عجم جو علامہ کے پیغام کی ترجمانی کرتی ہے) کے چھ اشعار لکھے گئے ہیں۔

"نور جہاں کا مقبرہ" = شاہدرہ، جہاں کبھی با ادب، با ملاحظہ ہوشیار کے فلک شگاف نعروں سے ماحول تھرّا اٹھتا تھا وہاں آج ظلِ سبحانی کہلانے والے شہنشاہ جہانگیر اور ان کی بیگم، ملکۂ نور جہاں محوِ خواب ہیں۔

مقبرہ کے اندر دو تعویز ہیں جن میں سے ایک میں نور جہاں اور دوسری میں اس کی بیٹی، لاڈلی بیگم (پہلے شوہر، شیر افگن سے) آرام فرما ہیں۔ قبر، جس میں نور جہاں دفن ہے، کو نور جہاں نے خود اپنی زندگی ہی میں تیار کرا دیا تھا۔

دیگر مغل دور کی عمارتوں (مساجد، مقابر، درگاہوں وغیرہ) کی طرح اس مقبرہ کو بھی سکھوں کے دورِ حکومت، بالخصوص مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں بہت بے دردی، بے رحمی اور سفاکی کے ساتھ لوٹا اور تہس نہس کیا گیا۔ قیمتی پتھر اور ہیرے، جواہرات ان میں سے نکال کر امرتسر لے جائے گئے جہاں "گولڈن

ٹیمپل'' کی تعمیر میں ان کو استعمال میں لایا گیا۔ سکھوں کے لوٹنے کھسوٹنے کے بعد جو کچھ بچا کھچا تھا اس کو مزید نقصان برٹش عہدِ حکومت میں پہنچایا گیا۔ انھوں نے مقبرہ کے خوشنما گارڈن کی بے قدری کرتے ہوئے اس کے بیچ وبیچ سے انیسویں صدی کے اواخر میں ریلوے لائن نکالی اور اس کے ایک حصہ کو بطور کول ڈپو استعمال میں لایا گیا۔ پرانی شان واپس لانے کے لئے کھنڈر ہوگئے مقبرہ کی بعد میں مرمت کرائی گئی۔

''**ملک ایاز کا مقبرہ**'' = ملک آیاز کے باپ کا نام ایماق آبوالنجم (Aymaq Abu'n-Najam) تھا۔ وہ ایک ترک غلام تھا جو ایک معمولی عہدے سے ترقی کرتے کرتے جنرل کے عہدے پر پہنچا۔ ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) میں سلطان محمود غزنوی نے لاہور پر قبضہ کر کے اسے اپنی غزنوی سلطنت میں شامل کرلیا اور ملک ایاز کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ چونکہ اس حملے میں لاہور کی کافی کچھ آبادی کم ہوگئی تھی اور املاک کو بھی کافی نقصان پہنچا تھا، اس لئے ملک ایاز نے دوبارہ عمارات کی مرمت کرانے کے ساتھ ساتھ کئی اہم عمارتیں تعمیر بھی کرائیں، جیسے: حصارِ شہر کا صدر گیٹ، ایک پختہ قلعہ وغیرہ وغیرہ۔ کہتے ہیں کہ موجودہ قلعہ اسی پرانے قلعہ کے مقام پر واقع ہے۔ یہ مقبرہ رنگ محل کو مرشیل علاقے میں واقع ہے۔

کہتے ہیں کہ راجپوتوں سے مقابلہ کرنے سے پہلے محمود نے ایاز کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ لشکر کے قیام کے لئے کوئی مناسب جگہ پسند کرلے۔ چنانچہ اس نے جو جگہ پسند کی تھی وہاں آج گوجر خان شہر آباد ہے۔ اس شہر میں ایاز کے نام سے ایک شاہراہ بھی ہے۔

''مقبرہ قطب الدین ایبک'' = قطب الدین ایبک، محمد غوری کا ایک ترک غلام تھا جو ترقی کرتے کرتے ہندوستان کا ۱۲۰۶ء میں پہلا سلطان بنا۔ تفصیل احقر کی کتاب ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' جلد چہارم (''تذکرہ جہانیاں'') میں ملاحظہ فرمائیں۔ دہلی کا ''قطب مینار'' اسی کی دین ہے۔ ۱۲۱۰ء میں پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر لاہور میں اس کا انتقال ہو گیا تھا۔

''انارکلی بازار'' کی پشت پر اس کا مقبرہ واقع ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں مقبرہ کی اس وقت کے وزیر اعظم، ذوالفقار علی بھٹو کے حکم پر مرمت کرائی گئی تھی۔

[۶] مختلف مسلم ادوار میں کئے گئے چند تعمیراتی کام

[۱] مغلوں کی یلغار کے سبب لاہور شہر کی جو حصار شکستہ ہو گئی تھی اس کو ۶۶۴ھ (۱۲۶۵ء) میں جب غیاث الدین بلبن لاہور پہنچا تو اس نے اس کو از سر نو تعمیر کرایا اور نواح شہر جو بالکل برباد ہو گیا تھا، کو پھر سے آباد کیا۔

[۲] لاہور کی جامع مسجد اورنگ زیب کے عہد حکومت میں (۱۶۷۴ء میں) مکمل ہوئی۔

[۳] دورِ شاہجہانی میں حاکم لاہور، وزیر خاں حکیم علیم الدین (ص ۱۸۰) نے لاہور میں حمام، بازار، متعدد حویلیاں جامع مسجد، مقبرہ سید اسحاق گازرونی وغیرہ تعمیر کرائے۔

[۴] دورِ شاہجہانی ہی میں عنایت اللہ خاں (۲) نے لاہور میں عمارات و باغات پہ پچاس لاکھ روپیہ خرچ کئے۔

[۵] دورِ شاہجہانی ہی میں علی مردان خاں امیر الامراء [م ۱۶/اپریل ۱۶۵۷ء] (ص ۱۸۷) نے اپنے لاہور کی صوبہ داری کے زمانے میں شہر کے قریب سے ایک نہر جاری کرائی جس سے متعدد فوائد کے علاوہ شہر کی رونق میں بھی اضافہ ہوا۔ (۳) اس کے علاوہ ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں شہر سے ملحق علاقے میں ایک بہت عمدہ قسم کا باغ لگایا جس میں متعدد حوض، نہریں، فوارے اور آبشار مختلف

اوقات میں تعمیر کرائے۔ یہ باغ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں خلیل اللہ خاں (ص ۱۸۴) کے اہتمام سے تکمیل پذیر ہوا۔ اس پر اس وقت آٹھ لاکھ روپیہ صرف آیا۔ اس باغ کا نام ''شالامار'' ہے۔ (تفصیل ص ۲۶۶، ۲۶۷ پر ملاحظہ فرمائیں۔)

[۶] شیخ فرید مرتضیٰ خاں بخاری [م ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء)] (۴) نے لاہور میں ایک محلہ آباد کیا جس کا نام بھی اسی کے نام پر ہے۔ اس میں اس نے ایک حمام کلاں اور چوک بھی تعمیر کرائے۔

[۷] قطب الدین خاں (۵) جاگیر دار پنجاب نے لاہور شہر میں ''مراکزِ خیر'' (بصورت عمارات) تعمیر کرائے۔

[۸] میر معین الدین احمد امانت خاں خوافی نے عہد عالمگیری میں بہت سی عمارتیں اور حمام تعمیر کرائے۔

[۹] قلیج خاں تُورانی [م ۱۰۶۴ھ (۱۶۵۴ء) (ص ۱۷۷) نے لاہور سے ملتان تک سرائیں تعمیر کرائیں۔ (۶)

[۱۰] شہنشاہ جہانگیر نے لاہور میں ایک بہت عالی شان ''شاہی مسجد'' تعمیر کرائی جس کا مقابلہ شاہجہاں کی دہلی میں تعمیر کرائی گئی ''شاہی مسجد'' سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جہانگیر نے لاہور میں بہت خوبصورت باغ بھی لگوائے۔ جہانگیر ہی نے ۱۶۱۵ء میں انارکلی کی قبر کو سنگِ مرمر سے پختہ کرایا۔ کہتے ہیں کہ اس نے قبر پر فارسی میں یہ جملہ بھی کندہ کرایا تھا: ''اگر میں اپنی محبوبہ کا چہرہ ایک بار دوبارہ دیکھ پاتا تو قیامت تک اللہ کا شکر ادا کرتا۔'' (ترجمہ) [تفصیلات ص ۶۹، پر ملاحظہ فرمائیں۔] (۶)

[۱۱] شہنشاہ شاہجہاں نے لاہور میں جو خوشنما عمارتیں تعمیر کرائیں ان میں ''شیش محل''، ''نولکھا محل''، مساجد، حمام اور ''مسمم برج'' قابل ذکر ہیں۔ بیسویں سال جلوسِ شاہجہانی میں جب اندازہ لگایا گیا تو پتہ چلا کہ تب تک ۵۰ لاکھ روپیہ اس کے ذریعہ لگائے گئے باغات اور عمارات پر خرچ ہو چکے تھے۔(۷)

حواشی

(۱) جب ۱۹۵۹ء میں محکمہ آثار قدیمہ کی زیرِ نگرانی اس کے دیوانِ عام میں کھدائی کرائی گئی تو ۶۲ء۷ میٹر کی گہرائی پر محمود غزنوی کے عہد کے سونے کے سکے جن پر ۴۱۶ھ کندہ تھا، ملے۔ اس گہرائی کے بعد بھی ۵ میٹر آگے تک محمود غزنوی کے اسکو ۱۰۲۱ء میں فتح کر لینے سے کافی پہلے کے انسانوں کے یہاں رہنے کے آثار ملتے ہیں۔

(۲) عنایت اللہ خاں = اس کا سلسلۂ نسب سید جمال نیشاپوری تک پہنچتا ہے۔ اتفاق سے وہ کشمیر میں آکر مقیم ہو گیا۔ اس کے باپ کا نام مرزا شکر اللہ اور ماں کا نام حافظہ مریم تھا۔ حافظہ مریم، عالمگیر بادشاہ کی دختر، زیب النساء کی تعلیم پر مامور رہی۔ جہاندار شاہ کے زمانے میں وہ صوبۂ کشمیر کا ناظم رہا۔ وہ پاکیزہ صورت، خوش وضع اور ایک متین امیر تھا۔ ۱۱۳۹ھ (۱۷۲۷ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۸۲۱ تا ۸۲۴]

(۳) ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۹ء) میں علی مردان خاں نے شاہجہاں سے عرض کیا کہ اس کے آدمیوں میں سے ایک شخص جو نہر کھودنے میں مہارت رکھتا ہے، ذمہ لیتا ہے کہ ایک نہر لاہور کے

قریب و جوار میں لائے۔ چنانچہ بادشاہ نے تجویز منظور کرتے ہوئے فوراً ایک لاکھ روپیہ مرحمت فرما دیا۔ اس شخص نے دریائے راوی، جو شہر کے قریب ہی سے بہتا تھا، کے منبع سے ایک نہر کھودنے کا کام شروع کرا کر ایک سال سے کچھ ہی زائد عرصے میں کام انجام کو پہنچا دیا۔ لیکن جتنے پانی کی توقع کی گئی تھی اتنا پانی اس نہر میں نہیں آیا، اس لئے اس پر مزید ایک لاکھ روپیہ صرفہ کرنا پڑا۔ اس ایک لاکھ روپیہ سے پانچ کوس (۱۰ کلومیٹر) کا فاصلہ تو پہلے والی ہی نہر کا بحال رکھا گیا جب کہ ۲۳ کوس (۴۶ کلومیٹر) کا فاصلہ از سرِ نو کھودا گیا۔ دریائے راوی سے شہر تک نہر کی کل لمبائی ۹۸ میل (تقریباً ۱۶۱ کلومیٹر) بتائی گئی ہے۔ اس سے کافی پانی بنا کسی دقت کے حاصل ہونے لگا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۷۹۸ تا ۸۰۰]

(۴) <u>فرید مرتضیٰ خاں بخاری</u> = کمسنی میں اکبر بادشاہ کی ملازمت میں داخل ہوا۔ جلد ہی پختہ کاری، دانشمندی اور شجاعت کی بدولت وہ ترقی کرتے کرتے چالیسویں سال جلوس اکبری میں ہزار و پانصدی کے منصب تک جا پہنچا۔ دورِ جہانگیری میں ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں اس کا انتقال ہو گیا۔ دہلی میں خاندانی قبرستان میں دفن ہوا۔ لاہور کے علاوہ اس نے احمد آباد میں بھی بخارہ محلہ، مسجد اور شاہ وجیہہ الدین کا روضہ نیز دہلی کے قریب فرید آباد مع عمارات و تالاب اسی کی یادگار ہیں۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۶۳۴ ـ ۶۴۰]

(۵) <u>قطب الدین خاں</u> = شمس الدین خاں اتکہ کا بڑا بھائی اور اکبری عہد کے بڑے امیروں میں سے اور پانچ ہزاری منصب پر فائز تھا۔ لاہور کے علاوہ اس نے غزنین جو اس کا وطنِ مالوف تھا، میں بھی ایک عمارت بنوائی اور باغ لگوایا۔ ۹۸۷ھ (۱۵۷۹ء) میں وہ شہزادہ سلیم کی اتالیقی پر مقرر رہا۔ ۹۹۱ھ (۱۵۸۳ء) میں وہ بھڑوچ کی صوبیداری پر فائز

تھا تو سلطان مظفر شاہ (والئ گجرات) کے ہاتھوں دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔

[''قاموس المشاہیر'' (جلد دوم) ص ۱۳۰؛ ''مآثر الامراء'' جلد سوم (اردو ترجمہ) ص ۴۹ تا ۵۲]

(۶) اس نے شیخ الاسلام شیخ زکریا ملتانی کا روضہ جو بہت تنگ تھا، کو گردونواح کے لوگوں کے مکانات خرید کر، خوبصورت اور وسیع کرایا۔

[''مآثر الامراء'' (اردو ترجمہ) جلد دوم ص ۷۹۸ تا ۸۰۰]

(۶) ''بھارت کا برہت اتیہاس'' (ہندی) جلد دوم ص ۱۸۴

(۷) ''مآثر الامراء'' (انگریزی ترجمہ) جلد اوّل ص ۶۷۹

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرہ لایحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر!
(علامہ اقبال)

[۷] لاہور تصاویر کے آئینے میں
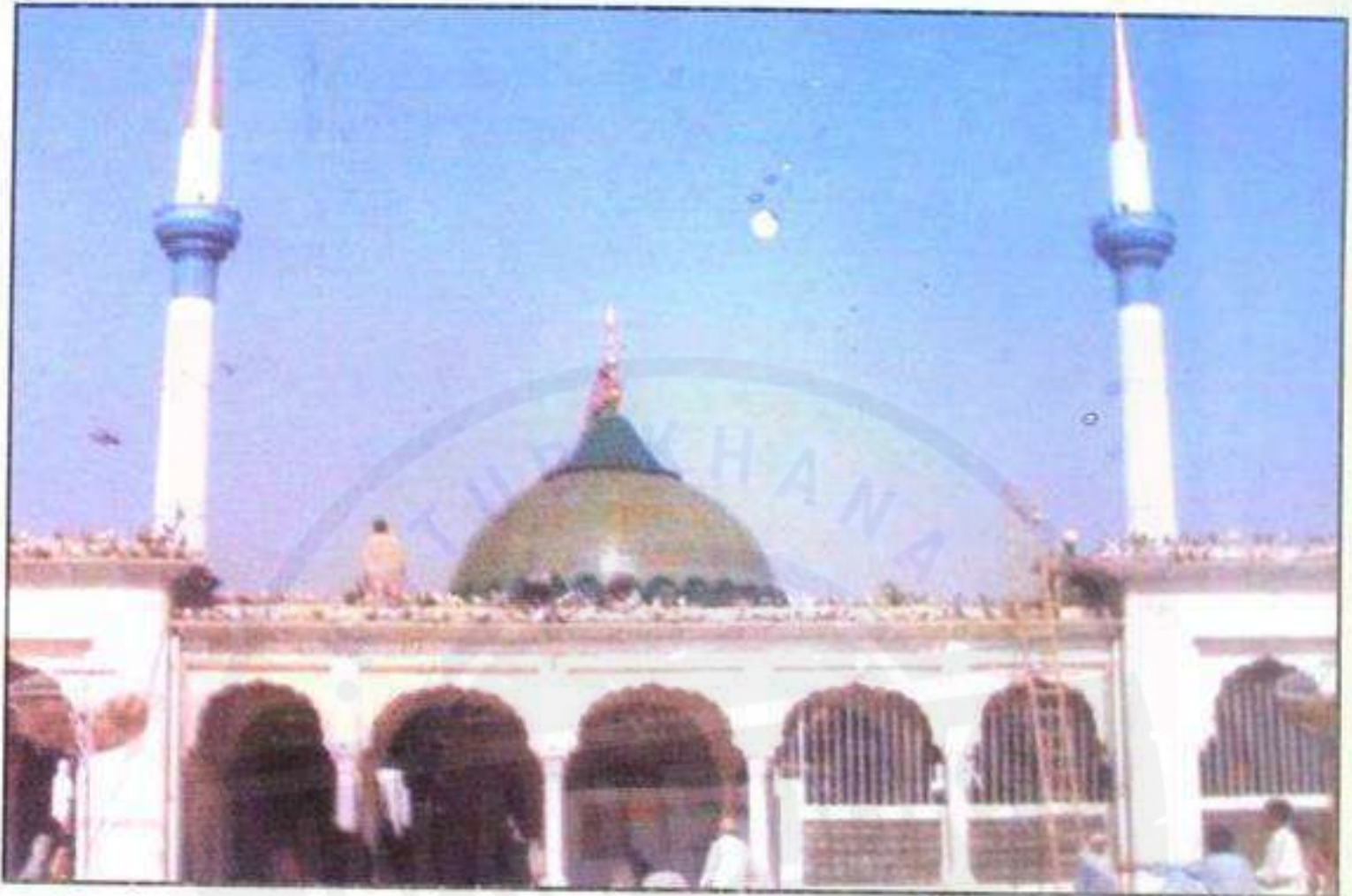
حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار شریف کا بیرونی روح پرور منظر، لاہور

حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار شریف کا ایمان افروز اندرونی منظر، لاہور
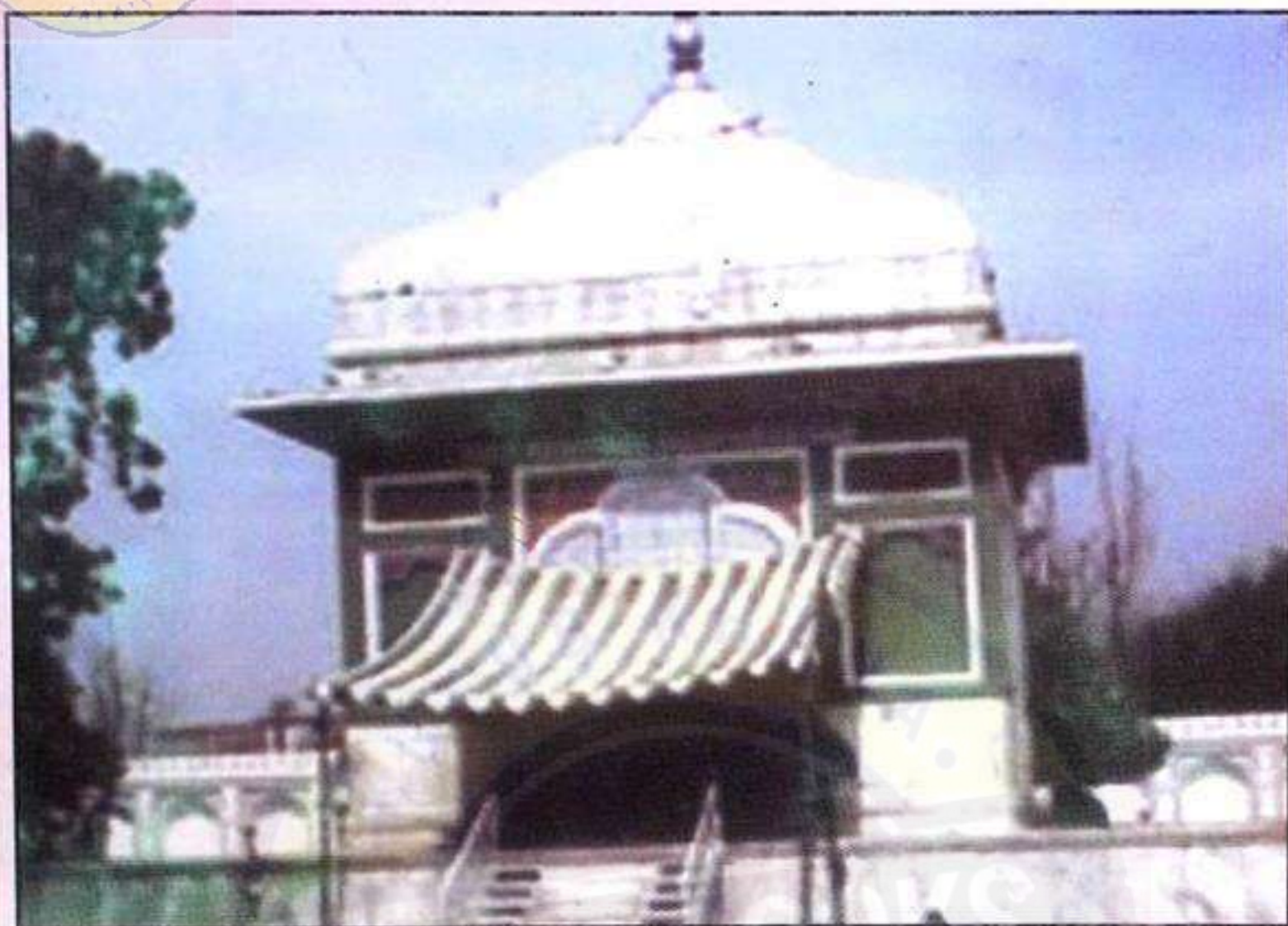
حضرت میاں میرؒ کے مزار شریف کا بیرونی منظر، لاہور
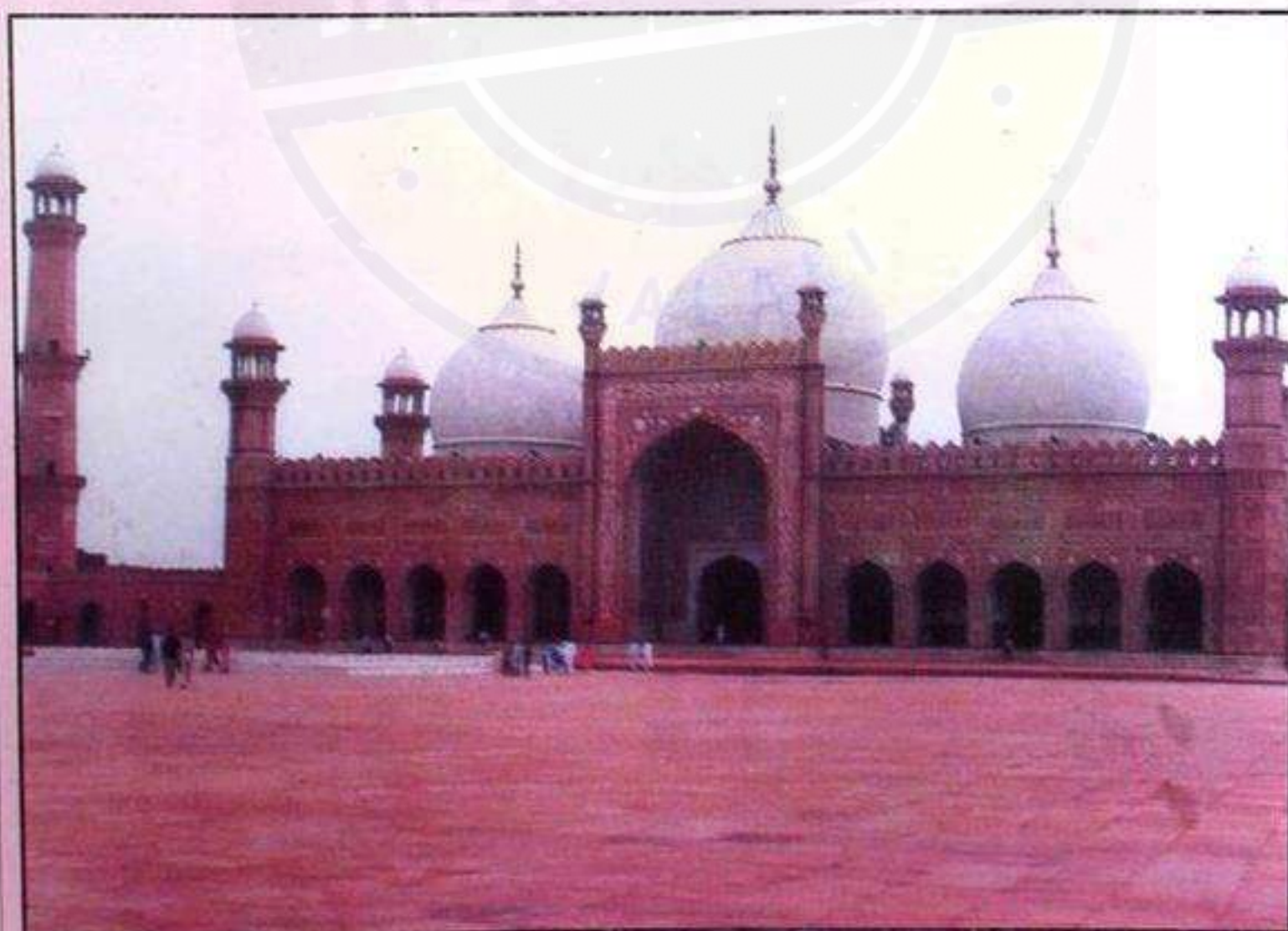
بادشاہی مسجد، لاہور

مینار پاکستان، لاہور
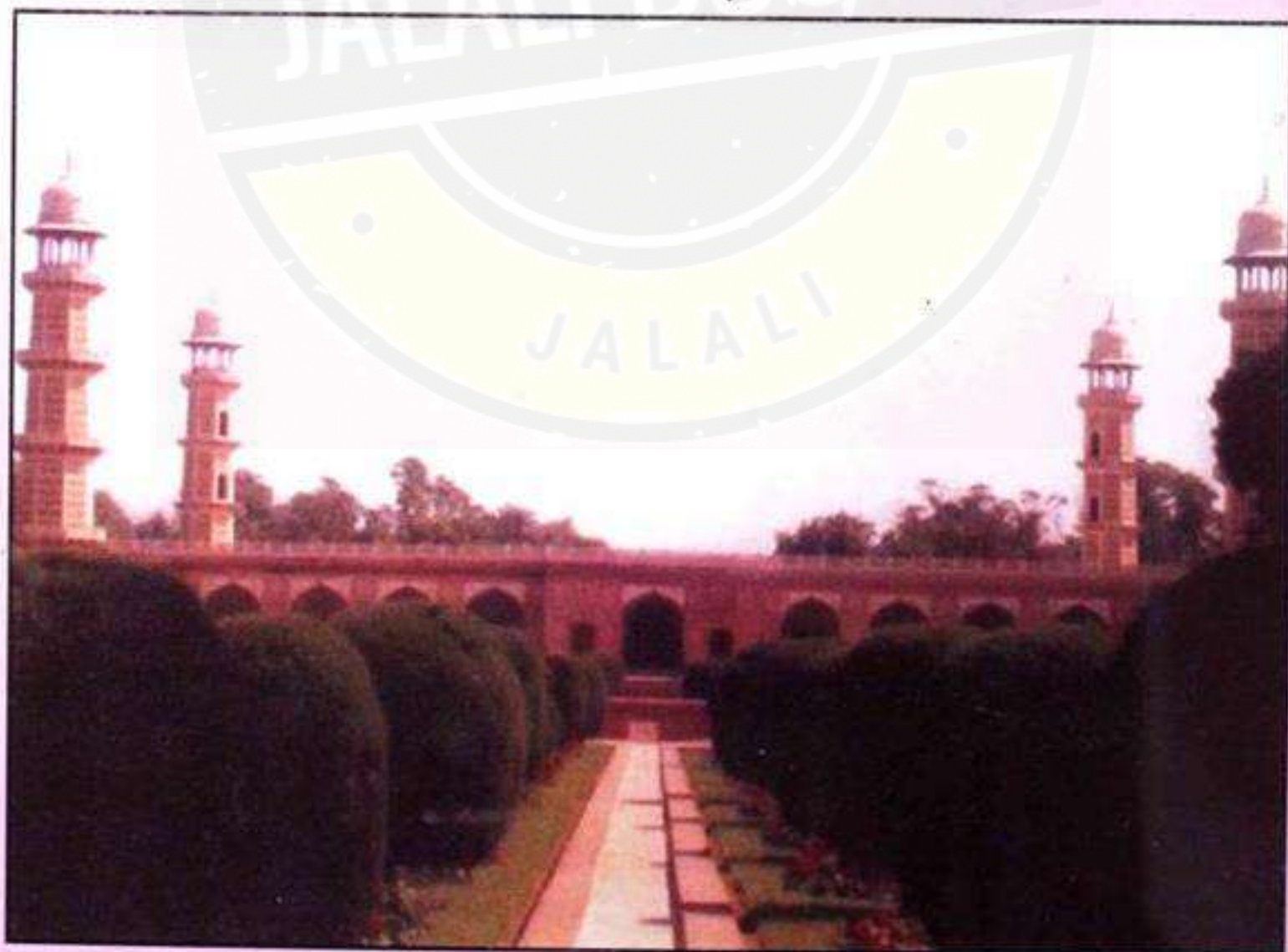
مغل شہنشاہ جہانگیر کا مقبرہ، لاہور
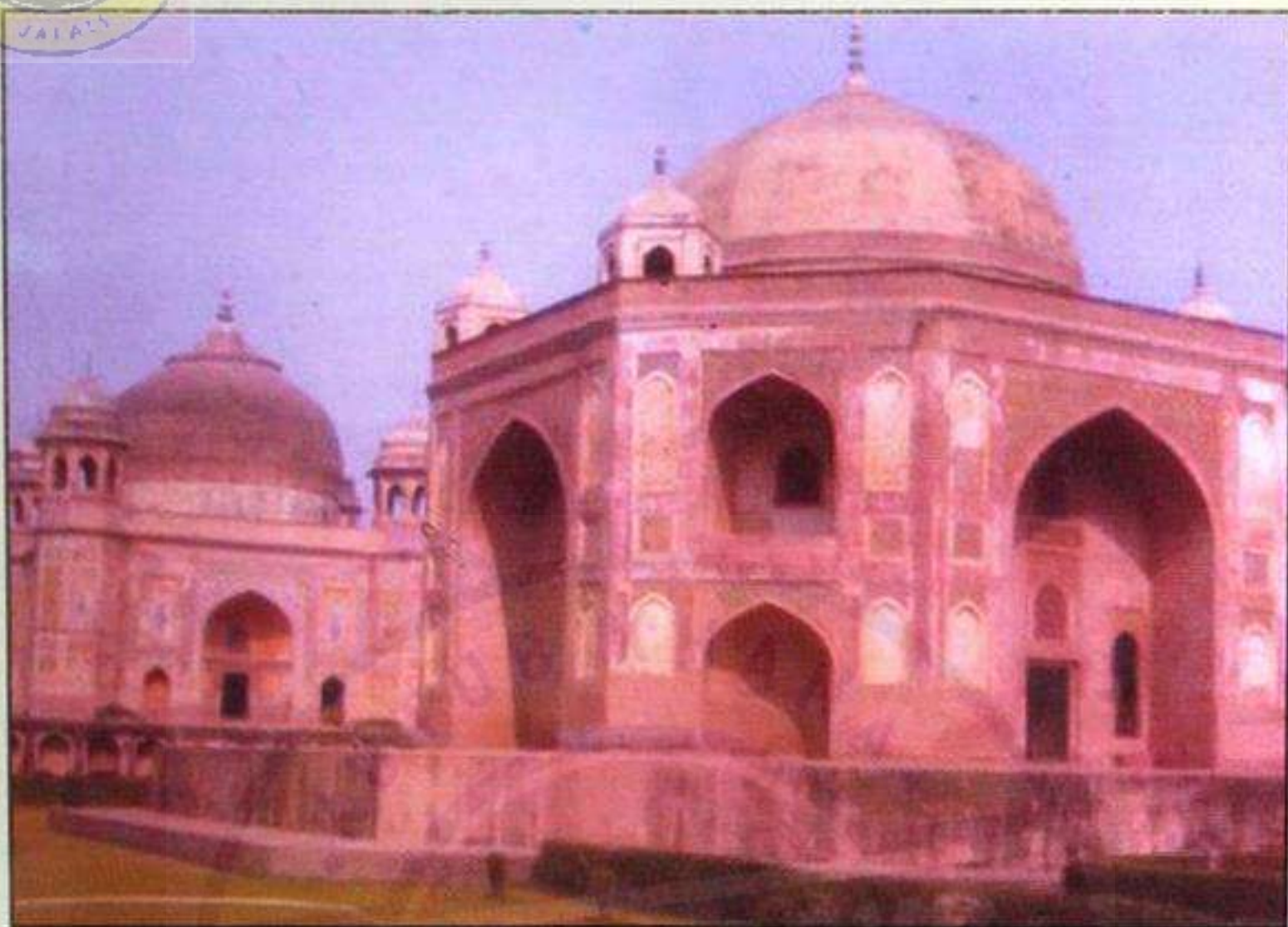
مقبرہ ملکہ نور جہاں، لاہور

مقبرہ زیب النساء، لاہور
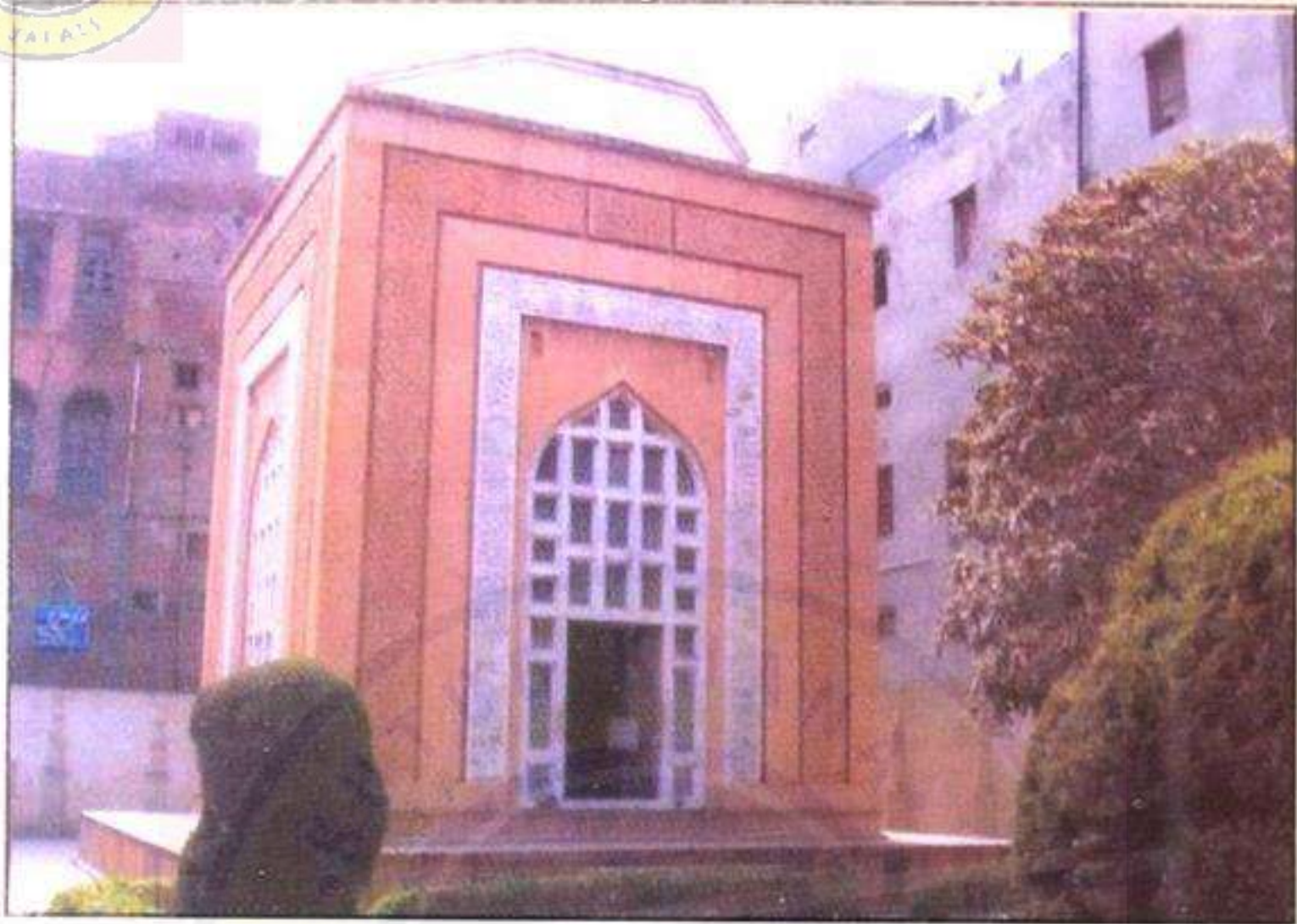
مقبرہ سلطان قطب الدین ایبک، لاہور

مقبرہ مغل شہنشاہ بہادر شاہ اول، لاہور

سمادھی راجہ رنجیت سنگھ، لاہور

ریس کورس، لاہور
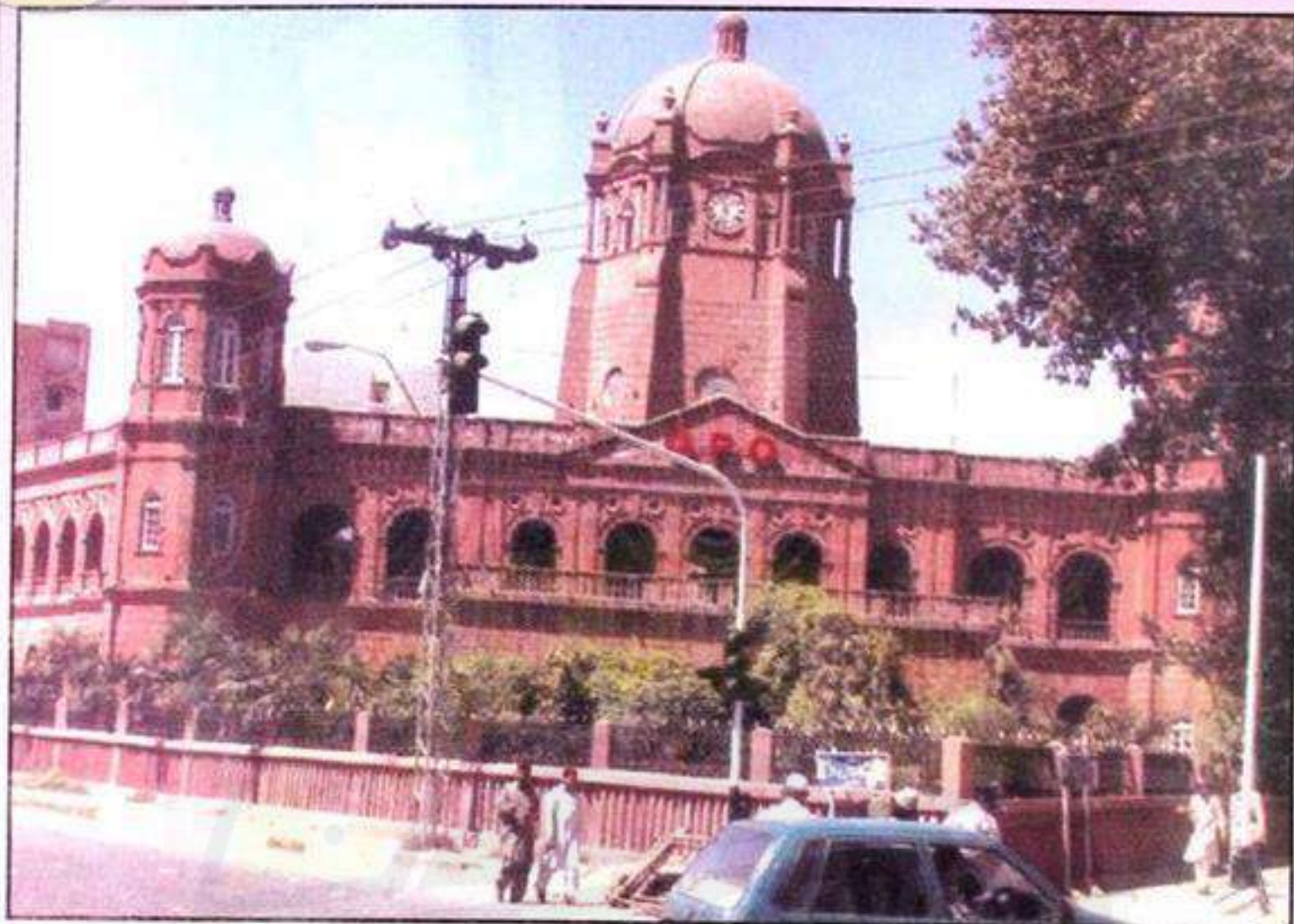
جنرل پوسٹ آفس، لاہور
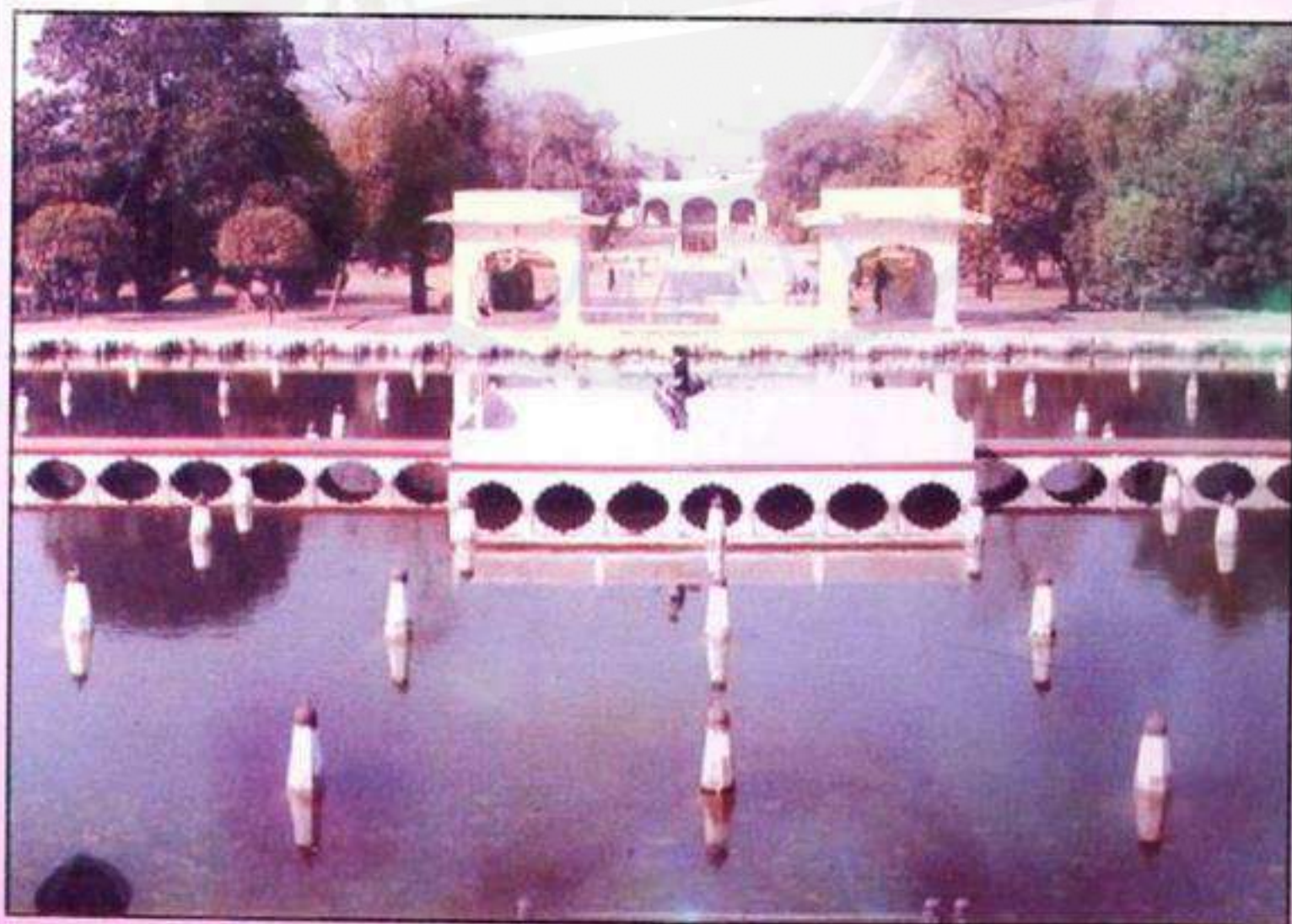
شالیمار گارڈن کا دلکش منظر، لاہور
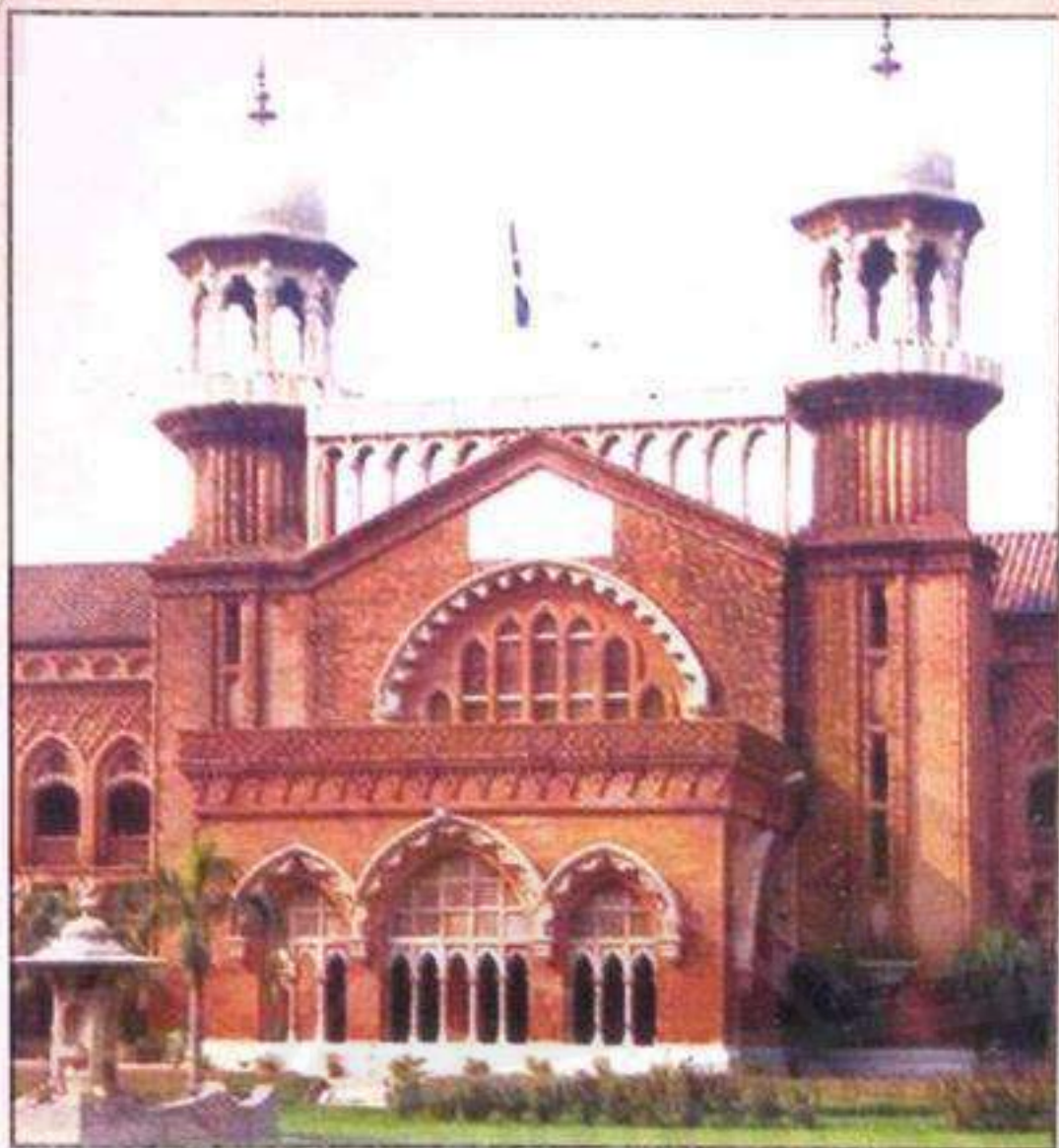
پنجاب ہائی کورٹ، لاہور
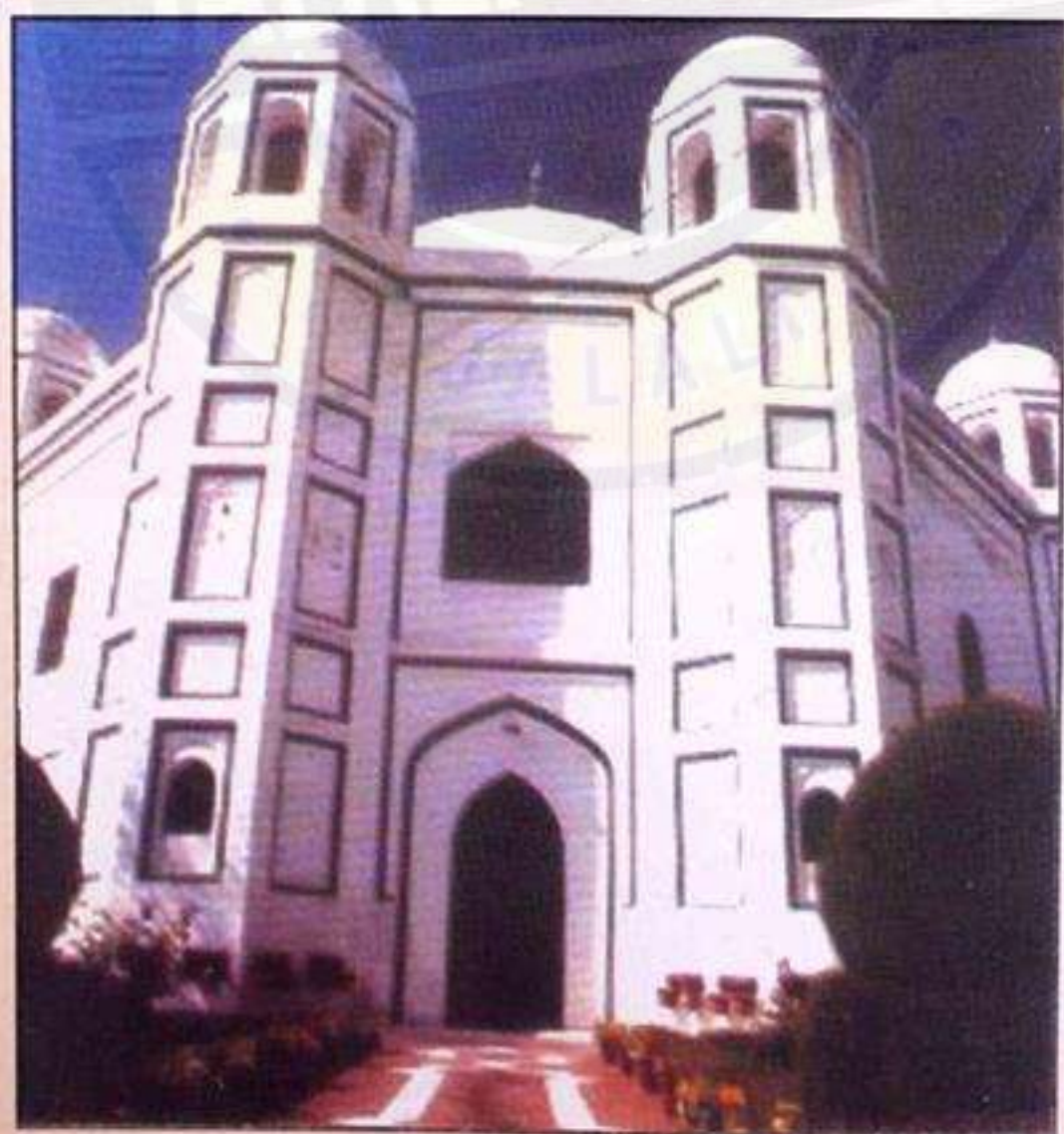
انارکلی کا مقبرہ، لاہور

باب ششم

خدا حافظ

(۱) وطن واپسی

میرا دو ماہ کا ویزا ۲۹ اپریل کو ختم ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے ہی مجھے پاکستان چھوڑ دینا تھا۔ عزیز و اقارب کا اصرار تھا کہ ایک ماہ کی توسیع اور کرالی جائے لیکن خانگی ذمہ داریوں کے پیشِ نظر میرا زیادہ عرصہ فیملی سے دور رہنا ممکن نہ تھا [تنہا پاکستان گیا تھا۔] اس لئے چاہتے ہوئے بھی میں نے مزید توسیع نہیں کرائی۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، چونکہ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' پیر اور جمعرات کو ہی لاہور سے چلتی ہے اور پیر، ۲۶ اپریل کی پڑ رہی تھی اس لئے ۲۶ اپریل کو ہی بارڈر کراس کرنے کے حساب سے میں کراچی سے روانہ ہوا۔ کراچی ریلوے اسٹیشن پر بھائی، ہمشیرہ، بھابی، بھانجے اور بھتیجوں کے علاوہ متعدد مخلصین نے بھاری من اور ڈبڈباتی آنکھوں سے الوداع کہا۔ یہ منظر ایسا جذباتی تھا کہ خواہ کوئی کتنا ہی سنگدل کیوں نہ ہو، وہ بھی اشکبار ہوئے بنا نہیں رہ سکتا۔ اس کا اندازہ بوگی میں بیٹھے دیگر غیر متعلقہ مسافروں کے چہروں کو پڑھنے سے بھی ہوا۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک ہی سوال بار بار ابھر کر پریشان کر رہا تھا، موت کا کوئی بھروسہ نہیں، کب، کس کو اور کہاں اپنی آغوش میں لے لے؟؛ خدا جانے دوبارہ ان لوگوں سے ملاقات ہو سکے گی، یا نہیں!!۔ کافی دیر تک تو میں خود پر قابو پائے رہا لیکن آخر کار مجھ پر بھی رقّت طاری ہو ہی گئی۔ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے بھائی کو دیکھا جن کی آنکھیں پہلے ہی نمناک تھیں، لیکن انھوں نے بناوٹی مسکراہٹ اور کپکپاتے ہونٹوں سے خدا حافظ کہا۔ ان کی مسکراہٹ صاف بتا رہی تھی کہ ان کے ذہن میں بھی ایک تلاطم برپا ہے اور وہ خمار بارہ بنکوی کے اس شعر کی

ترجمانی کر رہی ہے۔

ہزاروں اشک صدقے اس کے افسردہ تبسم پر
چھپالی مسکرا کر جس نے شدت دردِ پنہاں کی

بالآخر ٹرین نے سیٹی دی، گارڈ نے ہری جھنڈی ہلائی اور پھر ٹرین پٹریوں پر پہلے آہستہ آہستہ اور پھر تیز رفتار سے دوڑنے لگی۔ میں کافی دیر تک بوگی کے گیٹ پر کھڑا تب تک ہاتھ ہلا ہلا کر خدا حافظ کہتا رہا جب تک کہ سب آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ اس کے بعد جب میں اپنی سیٹ پر آیا تو دیکھا کہ وہاں ایک دوسرے صاحب قبضہ کئے ہوئے ہیں اور میرا سامان انھوں نے وہاں سے ہٹا کر الگ رکھ دیا ہے۔ جب میں نے ان سے کہا کہ یہ سیٹ تو میرے نام Reserve ہے تو انھوں نے مجھے دھمکاتے ہوئے ڈانٹ دیا۔ میں حالات کے پیشِ نظر اس شعر کا مصداق خاموشی سے فرش پر ایک کونے میں بستر بند رکھ کر اس پر بیٹھ گیا۔

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے!
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے!!

ذہن پہلے ہی سے بوجھل تھا، اس واقعہ نے مزید ''آگ میں گھی'' ڈالنے کا کام کیا۔ مصلحت اسی میں تھی کہ ''گاندھی گیری'' جس کا مجھے پہلے ہی سے بخوبی تجربہ تھا(۱)، سے کام لیتے ہوئے مناسب وقت کا انتظار کیا جائے۔ میں ابھی اسی ''ادھیڑ۔ بُن'' میں تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد پولیس فورس کے ساتھ ریلوے ٹکٹ چیکر (.T.C) آ گیا اور مسافروں کے ٹکٹ چیک کرنے لگا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر ٹی۔ سی کو اپنا ٹکٹ اور رزرویشن سلپ دکھاتے ہوئے اُس سے اپنی سیٹ پوچھی۔ اُس نے اُسی سیٹ کی طرف اشارہ کیا جس پر سے مجھے ہٹایا جا چکا تھا، تو میں نے کہا کہ اس سیٹ پر تو جو صاحب بیٹھے

ہوئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ ان کے نام رزرو ہے۔ میں نے یہ بھی شکایت کی کہ ان صاحب کا کہنا ہے کہ اگر میں نے ان سے زیادہ کچھ بات کی تو وہ میرے پیٹ میں سے چاقو نکال دیں گے؛ مجھے ویسے تو موت کا کوئی ڈر نہیں لیکن میں ایک ہندوستانی شہری ہوں، یہاں پردیس میں مرنا نہیں چاہتا۔ ٹی۔ سی نے ان صاحب کا ٹکٹ دیکھ کر قدرِ شرمندگی کے عالم میں مجھے بتایا کہ یہ غلطی انھیں کے محکمے (ریلوے) کی ہے جس نے ایک ہی سیٹ دو کے نام رزرو کر دی ہے؛ لیکن ساتھ ہی اُن صاحب کو وہاں سے ہٹاتے ہوئے کہا کہ تمہیں مہمان کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ آخر وہ کیا تاثر لے کر یہاں سے جائیں گے!، اور پھر اُن صاحب کو ایک دوسری سیٹ پر Adjust کرتے ہوئے مجھ سے معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ واقعہ کو بھول جانے کی درخواست کی۔ ٹی۔ سی کے ساتھ جو پولیس سب انسپکٹر تھا اس نے بھی معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ قدرِ طنزیہ لہجے میں مجھے یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہاں (پاکستان میں) ایسی لاقانونیت نہیں ہے کہ محض سیٹ کو لے کر کسی کو بوگی سے نیچے پھینک دیا جائے یا اس کو زدوکوب کیا جائے۔ (گویا کہ یہ بات ہندوستان میں عام ہے۔) اس پر میں نے برجستہ سوال کیا، ''تو پھر کیا یہ غلط ہے کہ آپ کے یہاں مساجد میں نمازیوں پر بے دریغ فائرنگ نہیں کی جاتی، حتیٰ کہ میتوں اور سوگواروں کو بھی نہیں بخشا جاتا؟'' میرے اس سوال پر وہ سب انسپکٹر ''لال۔ پیلا'' ہو کر آگے بڑھا اور اُن صاحب کے دو طمانچے رسید کرتے ہوئے ان سے کہا کہ اگر انھوں نے چاقو وغیرہ کی بات نہ کہی ہوتی تو آج پوری قوم کو یوں شرمندہ نہ ہونا پڑتا، اور پھر انھیں مجبور کر دیا کہ وہ مجھ سے معافی مانگیں۔ انسپکٹر کی اس بات کی تائید بوگی میں بیٹھے مسافروں نے بھی کی۔ ٹی۔ سی اور پولس کے عملے کے چلے جانے کے بعد میں نے اُن صاحب سے کہا ''میاں! یہ ہے ہماری ''گاندھی گیری'' کہ بنا تشدد یا زبان کو خراب کیے مقصد حاصل کر لیں، یعنی ''ہلدی لگے نہ پھٹکی اور رنگ چوکھا آجائے۔'' ان صاحب نے شرمندگی سے

سر نیچے جھکا لیا۔ دراصل کوئی بھی معاشرہ پورے کا پورا برا نہیں ہوتا، محض ''ایک مچھلی پورے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے۔''

اس کے بعد وہ ٹی۔سی دیگر ریلوے اہلکاران اور پولس افسران کے ساتھ کئی بار میرے پاس آیا اور ہر بار سب نے معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ واقعہ کو بھول جانے کی درخواست کی۔ اس واقعہ کو میں ان ریلوے اور پولس اہلکاران کی شرافت، حسنِ اخلاق اور جذبۂ خیر سگالی کے روپ میں دیکھتا ہوں۔

لاہور میں میں نے کچھ ٹیکسیوں کے پیچھے ایک بہت ہی غیر مہذبانہ، نفرت انگیز اور اسلامی تعلیمات کے منافی نعرہ لکھا ہوا دیکھا جس کو قلم لکھنے سے قاصر ہے۔ تعجب تو اس بات کا تھا کہ حکومتِ پاکستان نے ایسے شر انگیز نعرے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ میں نے ایسی ٹیکسیوں میں سے ایک کے ڈرائیور سے پوچھا ''میاں! جو نعرہ آپ کی ٹیکسی کے پیچھے لکھا ہوا ہے وہ کیا آپ نے لکھوایا ہے یا پھر یونہی کسی دوسرے نے لکھ دیا ہے؟'' [عموماً ٹرکوں کے پیچھے بھی کچھ نہ کچھ لکھا ہوتا ہے، جیسے: ''بری نظر والے تیرا منہ کالا''، یا پھر کوئی بے تکا سا شعر وغیرہ وغیرہ] اس نے مجھے اوپر سے نیچے گھورتے [شاید لب ولہجہ کی وجہ سے] ہوئے سوال کیا ''کیا انڈیا سے آئے ہو؟''۔ میں نے جواب دیا ''جی''۔ اس نے پھر سوال کیا ''آپ کو اس میں کیا پریشانی ہے؟''۔ میں نے جواب دیا ''مجھے پریشانی تو کوئی نہیں، البتہ افسوس ضرور ہے۔ آپ اسلام کے ماننے والے اور ایک مسلم ملک کے شہری ہیں۔ آپ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ نفرت کی پیروی کریں یا کسی کو حقیر سمجھیں۔ کیا آپ ایسے نعروں سے کشمیر حاصل کر سکتے ہیں؟، ویسے بھی آپ کا ایسا کچھ لکھنا اندھیرے میں باندی کے منہ چڑانے سے زیادہ کچھ نہیں۔'' میں یہ کلمات کچھ ایسے جوش میں کہہ گیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز قدرے تیز ہو گئی جس کو سن کر وہاں کچھ اور لوگ بھی جمع ہو گئے۔ مجمع میں سے ایک صاحب نے سوال کیا ''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ انڈیا نے ہمارے ملک کے دو ٹکڑے

کر دیئے؟۔'' میں نے جواب دیا ''یہ محض آپ کی غلط فہمی ہے۔ جغرافیائی، معاشی، لسانی اور ثقافتی، غرضیکہ ہر اعتبار سے وہ پہلے ہی سے دو حصوں میں منقسم تھا۔ اس کے علاوہ دونوں حصوں کے درمیان سیکڑوں میل کا فاصلہ بھی تھا۔ دراصل وہ ایک بنا ہی غلط تھا۔ اگر الگ بننے ہی تھے تو پہلے ہی سے دو ملک بننے چاہئے تھے جن میں بے شک نیم وفاق (Confederation) ہو سکتا تھا۔ پھر اگر اپنا پیسہ کھوٹا ہو تو پرکھنے والے کی کیا غلطی!۔ جب جنرل یحییٰ خاں نے صاف ستھرے الیکشن کرائے تو اس میں شیخ مجیب الرحمٰن کی پارٹی اکثریت میں آ گئی تھی۔ ایمانداری سے تو شیخ مجیب کو سرکار بنانی چاہئے تھی لیکن جنرل یحییٰ خاں، مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے بے جا دباؤ میں آ گئے۔ ویسے بھی مسلم لیگ مشرقی حصے میں ہی وہاں کے رہنماؤں کی کاوشوں سے وجود میں آئی تھی۔'' [مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں کرسمس کے موقعہ پر ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے اجلاس کے دوران نواب مشتاق حسین کی کوششوں سے ڈھاکہ میں عمل میں آیا تھا۔] وہ صاحب بولے ''یہ تو سب درست ہے لیکن شیخ مجیب کو آپس میں مل بیٹھ کر معاملہ طے کر لینا چاہئے تھا۔ آخر کو تو ہم سب ایک ہی مذہب کے ماننے والے تھے!۔'' میں نے کہا ''مذہب کو بیچ میں نہ لائیں تو بہتر رہے گا۔ کیا عراق نے کویت پر قبضہ نہیں کیا تھا؟ کیا ایران اور عراق کے درمیان خونریز جنگ نہیں ہوئی تھی؟! ان کا مذہب کیا تھا؟۔ دراصل سب کی ''اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ'' ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو بھی تو سوچنا چاہئے تھا کہ مجیب اور مشرقی حصے کے عوام آپ ہی کے ہم مذہب ہیں۔ پھر، اس کے رہتے ہوئے آپ کی معیشت پر دباؤ بھی تھا۔ [ہر سال مشرقی حصے میں تباہ کن سیلاب آتے ہیں۔] ان سب کے علاوہ آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ بنگلہ دیش بن جانے سے اقوام متحدہ میں ایک مسلم ووٹ کا اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اگر آپ کے اس سے برادرانہ تعلقات قائم رہتے ہیں تو آپ اسے کیش کر سکتے ہیں۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے، ہماری سرحد بنگلہ دیش سے ملتی ہے۔ جن ممالک کی سرحدیں آپس میں ملتی

ہیں، ان میں کسی نہ کسی وجہ سے کشیدگی ہو ہی جاتی ہے۔ جیسے مثال آپ اپنے ملک اور افغانستان کی ہی لے لیجئے۔ اس لحاظ سے ہم تو خسارہ ہی میں رہے۔ اسی اندیشے کا اظہار ۱۹۷۱ء میں (بنگلہ دیش کے قیام کے وقت) ہمارے کچھ دانشوروں نے کیا بھی تھا۔'' وہ صاحب بولے ''ارے صاحب! یہ بات نہیں، بلکہ ہندوستان نے ابھی تک ہمارے ملک کو دل سے تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا ''یہ بھی آپ کا خام خیال ہے۔ کیا ہمارے وزیرِ اعظم، جناب اٹل بہاری باجپئی جب فروری ۱۹۹۹ء میں خیر سگالی مشن پر لاہور تشریف لے گئے تھے تو کیا وہ ''مینارِ پاکستان'' پر نہیں گئے؟، لیکن ان کے اس جذبے کا آپ نے کیا بدلہ دیا، یہی نہ کہ آپ نے اس مقام کو عرقِ گلاب سے دھویا، گویا کہ وہ نجس ہو گیا تھا؟؛ آپ نے در پردہ سازش کر کے ہمیں کارگل میں الجھا دیا۔ اس کے علاوہ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ محض مسلم لیگ کی مانگ پر ہی پاکستان بن گیا تھا؟ محترم! مولانا ابوالکلام آزاد نے "India Wins Freedom" میں صاف الفاظ میں اُن حالات و واقعات کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کانگریسی نیتاؤں کے نام تک دیئے ہیں جن کی مرضی سے پاکستان وجود میں آیا۔'' (۲) جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو دکھتی رگ پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ صاحب بولے ''وہاں آپ کی املاک تباہ کی جاتی ہے، آپ کو قتل کیا جاتا ہے اور پھر جیلیں بھی آپ ہی سے بھری جاتی ہیں، لیکن پھر بھی آپ وہاں کی وکالت کر رہے ہیں!۔'' میں نے اس طنزیہ فقرے کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا ''میں وکالت نہیں کر رہا ہوں بلکہ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ وہاں کچھ فسطائی طاقتوں اور ان کے غنڈہ عناصر کے سبب ہم پر عرصۂ حیات تنگ ہے لیکن وہ ہمارا وطن ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ آزادی کے بعد جب قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا تو ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء کو اس کے خلاف بابائے قوم مہاتما گاندھی نے ''مرن برت'' رکھا (۳) اور تب تک نہیں توڑا جب تک کہ خون خرابہ رُک نہ گیا اور املاک کی مسماری بند نہیں ہوگئی حالانکہ اسی کی پاداش میں انھیں ۳۰ر جنوری

۱۹۴۸ء کو انھیں کے مذہب کی ایک فرقہ پرست تنظیم کے وحشی کی گولیوں کا نشانہ بننا پڑا (۴)۔ اس کے علاوہ بھائی صاحب! ہم مریں یا زندہ رہیں، جیل جائیں یا آزاد رہیں؛ آپ کی بلا سے؛ آپ نے تو اپنی ''ڈیڑھ اینٹ کی مسجد'' الگ بنا ہی لی ہے لیکن اب اگر ہم مرتے ہیں تو شہید کا درجہ پاتے ہیں (اگر کوئی بے قصور مسلمان کسی غیر مسلم کے ہاتھ سے محض اس لئے مارا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہے، تو وہ درجۂ شہادت کو پہنچتا ہے) لیکن آپ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں، کیا یہاں ایک کلمہ گو ہی دوسرے کلمہ گو کو ہلاک نہیں کر رہا ہے؟ آپ سے اچھے تو ہمارے غیر مسلم ہم وطن ہیں جو کم از کم ہماری میت پر تو گولی نہیں چلاتے۔ اب رہا اس نعرہ کے بارے میں جو آپ نے کشمیر کے حوالے سے لکھا ہے، تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کشمیری عوام آپ کے ساتھ ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو ۱۹۶۵ء میں "Operation Gibraltor" ناکام نہ ہوتا۔ [جنرل ایوب خاں نے جو Infiltrators کشمیر بھیجے تھے وہ کشمیری عوام کی ہی نشاندہانیوں پر پکڑے گئے تھے۔] اب رہا ہماری عافیت، تو آپ کا ہی نزلہ ہم پر ڈھلتا ہے۔ اگر واقعی آپ ہمارے خیر خواہ ہیں تو خود کو چھوٹا مان کر اپنے بڑے بھائی سے تعلقات برادرانہ رکھیں۔ اس میں ہماری، تمھاری، اس پورے خطے کی بقا کا راز مضمر ہے۔ تم نے کئی جنگیں لڑ کر دیکھ لیں، کیا نتیجہ نکلا، اپنی ہی معیشت تباہ کر لی۔ یاد رکھو! جو بھی گزرتا ہے وہ دولھا اور دلھن پر ہی گزرتا ہے باقی تو باراتی ہوتے ہیں جو کوئی نمک زیادہ تو کوئی مرچ زیادہ کا شکوہ ہی کر کے چلا جاتا ہے۔'' میں کہتا رہا اور وہ سب خاموشی سے سنتے رہے۔ ڈرائیور، جس سے میں نے بات کرنی شروع کی تھی، وہ آگے بڑھا اور بولا ''بھائی صاحب! آپ سچ کہتے ہیں۔ میں آج ہی یہ نعرہ اپنی ٹیکسی پر سے مٹوا دونگا۔''

۲۶ر اپریل کو میں نے لاہور سے ٹکٹ لیا جو محض پاکستان بارڈر، واگھا تک ہی ملا۔ تقریباً دس بجے ہماری ٹرین واگھا پہنچی۔ پھر پہلے کی طرح Emigration کے لئے

لائن میں کھڑا ہونا پڑا۔ گرمی شدت کی تھی۔ میں لائن میں سب سے پیچھے کھڑا بار بار رومال سے پسینہ پونچھ رہا تھا [جیسے ہی لائن کچھ آگے بڑھتی کہ میں مسافروں کے ریلے سے پھر سے پیچھے آجاتا تھا۔] کہ Counter کے پاس کھڑے ایک شخص نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ وہ ''رینجرس'' میں سے کوئی آفیسر تھا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے قدرِ ہمدردی کے انداز میں مجھ سے میرا پاسپورٹ لے کر اور ضابطہ کی کارروائی کرانے کے بعد مجھے واپس کر دیا۔ یہ اللہ کی طرف سے میری غیبی مدد تھی کہ اس نے اس افسر کے دل میں میری ہمدردی پیدا کردی۔ میں نے اس افسر کا شکریہ ادا کیا اور پھر سامان کے ساتھ Custom والے کمرے میں داخل ہوا۔ میرے پاس دو سوٹ کیس تھے۔ جن میں کچھ بھی غیر قانونی سامان نہیں تھا۔ Screening کے مرحلے سے گزرتا ہوا جب میں کاؤنٹر پر پہنچا تو کاؤنٹر پر بیٹھے اہلکار نے مجھ سے ایک سوٹ کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے کھولنے کے لئے کہا۔ میں نے فوراً سوٹ کیس کھول کر اس کے آگے کر دیا۔ سوٹ کیس میں سب سے اوپر تصوف سے متعلق ایک کتاب رکھی تھی۔ اس نے اس کو کھول کر دیکھا اور پھر یہ معلوم ہو جانے پر کہ مجھے علی گڑھ جانا ہے اور میں ''علیگ'' ہوں اُس نے فوراً میرا سوٹ کیس بند کرتے ہوئے میرا کسٹم کلیر کر دیا۔ میں نے سُن رکھا تھا کہ پاکستان میں علی گڑھ والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس بات کی اُس اہلکار کے ایکشن سے بھی تصدیق ہوگئی۔ یہ سبھی مانتے ہیں کہ سرسید احمد خاںؒ کے مسلم قوم پر جو احسانات ہیں وہ تا قیامت فراموش نہیں کئے جاسکتے۔ اسی جذبے سے سرشار ہو کر ۱۹۹۱ء میں ''علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، کراچی'' نے کراچی میں ایک ''سرسید یونیورسٹی آف انجینیرنگ اینڈ ٹیکنالوجی'' کی بنیاد رکھی۔

غرض یہ کہ Custom سے میں نے بہت جلد فراغت حاصل کر لی اور پھر معہ سامان پلیٹ فارم پر کھڑی ٹرین میں آکر بیٹھ گیا۔ جب سب مسافر کسٹم سے فارغ ہو کر

ٹرین میں آ کر بیٹھ گئے تو تقریباً دو بجے واگھا سے اٹاری کے لئے ٹرین روانہ ہوئی اور جس انداز سے آئی تھی اسی انداز میں اٹاری پہنچی۔

اٹاری پر پہلے میں نے علی گڑھ کا ٹکٹ لیا اور پھر Emigration کی لائن میں اسی کاؤنٹر پر لگ گیا جس پر آتے وقت لگا تھا کیوں کہ جس کاؤنٹر پر آمد ہوتی ہے اسی پر روانگی کرانی پڑتی ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ آمد پر رجسٹر میں جو Entry کی جاتی ہے اسی کے آگے واپسی بھی درج کردی جاتی ہوگی تا کہ یہ کنٹرول رکھا جا سکے کہ کون کب واپس لوٹا اور کون نہیں۔

Emigration کے بعد جب میں کسٹم کے لئے آگے بڑھا تو کسٹم سے وابستہ اُس اہلکار نے مجھے پہچان لیا جس کو پاکستان جاتے وقت میں نے کتاب نذر کی تھی۔ حالانکہ میں فوراً اس اہلکار کو نہیں پہچان سکا تھا۔[کسی مولانا یا سردار جی کو ایک ہی نظر میں پہچاننے میں پریشانی تو ہوتی ہی ہے۔وہ صاحب سردار جی تھے۔] وہ بہت گرم جوشی سے میری طرف بڑھا، میرا سامان بنا کھلوائے کلیر کردیا اور پھر چائے پلائی اور خلوص کا مظاہرہ کیا۔میرے یہ پوچھنے پر کہ کتاب کیسی لگی، اس نے کہا ''او جی، رائٹر جی! بلّے بلّے، مینوُ توُ آڈِی کتاب بڑی سوہنڑی لاگی مگر میری بیوی نے اُوتّے قبضہ کرلیا؛ ہور راُو مینوُ دیکھن بھی نہیں دے ندی۔ مینوُ دوُجی کتاب بھیج دینڑا۔ توُ آڈِی بڑی مہربانڑی ہوگی۔''

یہ قابلِ ذکر ہے کہ کسٹم کے کاؤنٹر پر چیکنگ کرتے وقت کسی بھی مسافر کے ساتھ کوئی پاکستانی واٹر کولر Clear نہیں کیا جارہا تھا بلکہ انھیں توڑ دیا جاتا تھا۔میرے پاس بھی ایک چھوٹا سا کولر تھا جس میں پانی تھا۔سامان کے ساتھ ہی میرا تو کولر Clear کردیا گیا۔

کسٹم سے فراغت کے بعد میں اس پلیٹ فارم پر معہ سامان کے آبیٹھا جہاں سے ٹرین دہلی کے لئے روانہ ہونی تھی۔جب سب کا Clearance ہوگیا اور ٹرین بھی

آ گئی تو ہم سب اس ٹرین میں بیٹھ گئے۔ رات کے تقریباً دو بجے ٹرین اٹاری سے روانہ ہوئی اور اگلے دن ۲۷/اپریل بروز جمعہ صبح کے تقریباً دس بجے پرانی دہلی ریلوے اسٹیشن پہ پہنچی۔

دہلی کا اسٹیشن آنے سے پہلے ہی ریلوے اور کسٹم حکام نے چلتی ٹرین میں مسافروں کا سامان ٹٹولنا شروع کر دیا تھا اور جس کے پاس مقررہ وزن سے زائد اور غیر قانونی سامان تھا ان سے قانونی نیز غیر قانونی دونوں طریقوں سے بات کرنی شروع کر دی تھی۔ ایک صاحب غلطی سے میری طرف بھی لپکے لیکن جب احساس ہوا تو ''سوری'' کہہ کر آگے بڑھ لئے۔ جب ٹرین اسٹیشن پر رُکی تو میں نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر مزید کافی تعداد میں سرکاری عملہ موجود ہے اور انھوں نے encounter کے انداز میں ٹرین کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ جیسے ہی سامان سے لدے پھندے مسافروں نے ٹرین سے اترنا شروع کیا کہ وہ عملہ بھی اپنے پسندیدہ مسافروں کی طرف تیزی سے لپکا۔ میں تو وہاں سے دوسرے پلیٹ فارم پر آ گیا جہاں سے مجھے علی گڑھ (منزل مقصود) کے لئے ٹرین مل گئی، اور پھر ''جان بچی لاکھوں پائے، خیر سے بدھو گھر کو آئے۔''

یہاں دہلی سے لاہور یا لاہور سے دہلی کے درمیان ٹرین کے اندر کا منظر بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کافی کچھ مسافر بڑے بڑے تھیلوں، بوریوں، پیٹیوں اور بکسوں میں اتنا زیادہ سامان لاتے اور لے جاتے ہیں کہ ٹرین میں جگہ نہیں رہتی اور جس سے ان کی نیت اور مقصد کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ ایسے مسافر گروپ کی شکل میں ہوتے ہیں اور ایک ساتھ بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ راستے میں اپنا اپنا سامان آزادی اور دلیری کے ساتھ کھول کر پھر سے ایک دوسرے کے مشورے سے سیٹ کرتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا ہم ٹرین میں نہیں بلکہ مینا بازار میں بیٹھے ہوں۔ ایسے مسافروں میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ آپس میں وہ جس طرح باتیں کرتے ہیں اُن سے یہ اندازہ لگانا

بھی مشکل نہیں ہوتا کہ وہ مستقل جلدی جلدی چکّر لگاتے رہتے ہیں۔ ایسے مسافروں کو کسٹم والے بھی خوب جانتے اور پہچانتے ہیں حتیٰ کہ By name بھی۔ باتوں باتوں میں ہی ایسے مسافروں میں سے ایک شخص سے میں مانوس ہوگیا۔ میں نے اُس سے جو مختلف سوالات کئے اُن کا لبِّ لباب یہ ہے:—

ہندوستان اور پاکستان کے بڑے بڑے شہروں جیسے: دہلی، بمبئی، لاہور اور کراچی میں کچھ بااثر کاروباری اشخاص رہتے ہیں۔ ان سب کا آپس میں ربط رہتا ہے۔ مختلف اشیاء کے بازار بھاؤ پر ان لوگوں کی نگاہ رہتی ہے۔ جب کسی Item کے دونوں ممالک کے بازار بھاؤ میں کافی فرق ہوجاتا ہے تو زیادہ نرخ والے ملک کا بندہ کم نرخ والے ملک کے بندے کو خبر کر دیتا ہے۔ اس پر کم نرخ والے ملک کا بندہ اپنے لوگوں کے ویزے متعلقہ سفارت خانہ سے حاصل کر کے اپنے اُن لوگوں کو پاسپورٹ اور ویزے دے کر مطلوبہ سامان کے ساتھ زیادہ نرخ والے ملک کو روانہ کر دیتا ہے۔ جب وہ لوگ اپنی منزل کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچتے ہیں تو اُس ملک کا بندہ اسٹیشن پر آ کر ان سے سامان لے لیتا ہے اور ان لوگوں کو مناسب جگہ ٹھہرادیا جاتا ہے۔ چند دن وہ آرام کرتے ہیں اور تفریح بھی۔ پھر وہاں سے اُن Items کے ساتھ واپس لوٹتے ہیں جن کا بازار بھاؤ وہاں کم اور دوسرے ملک میں (جہاں سے وہ آئے تھے۔) زیادہ ہوتا ہے۔ اب اگر چیک پوسٹ پر مال ضبط ہوجائے یا اس پر کسٹم ڈیوٹی لگ جائے تو اس کا مال لے جانے والوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا اور اگر کچھ لینا دینا پڑ جائے تو آپس میں مل کر مطلوبہ رقم آناً فاناً میں جمع کر لیتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ کسٹم اہلکار چند بار سامان لانے اور لے جانے دینے کے بعد وقفے وقفے سے اسے ضبط کرتے یا توڑتے پھوڑتے رہتے ہیں جس سے حساب کتاب برابر ہوجاتا ہے۔ [آخر کسٹم اہلکار کو بھی تو اپنی کارکردگی دکھانی ہوتی ہوگی۔]

یہاں یہ قابلِ ذکر ہے کہ ایسے کارندوں کے پاسپورٹ کاروباری سرغنوں کے پاس ہی جمع رہتے ہیں۔ محض جب جو کارندہ مہم پر روانہ ہوتا ہے تو اُس کو پاسپورٹ عارضی طور سے دے دیا جاتا ہے۔ (واللہ عالم بالصواب۔)

Smugglers کا ایک فرقہ اور بھی ہوتا ہے جو منظم طریقے سے Smuggling نہ کر کے محض اپنے آنے جانے کا خرچہ نکالنے کی نیت سے مناسب سامان لاتا اور لے جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ ہندوستان سے Helmets، چھالی، کتھ، گرم مصالحہ، ناریل اور پان پاکستان لے جایا جاتا ہے جب کہ پاکستان سے کپڑا، سلے سلائے کپڑے، منقہ، کشمش، خشک میوے، جوتے، پلاسٹک کے چپل اور کولر وغیرہ ہندوستان لائے جاتے ہیں۔ یہ اشیاء بازار بھاؤ کے حساب سے بدلتی بھی رہتی ہیں۔ جس وقت اسمگلرس سامان کے ساتھ چیک پوسٹوں (اٹاری، واگھا)، دہلی اور لاہور کے ریلوے اسٹیشنوں پر پہنچتے ہیں تو گویا سرکاری عملے کی لاٹری کھل جاتی ہے۔

یہ بھی جانتے ہیں کہ باہمی تحائف کے تبادلوں سے خیر سگالی کے ماحول کو تقویت ملتی ہے اور آپس میں اتحاد و اتفاق، خلوص و محبت نیز یکانگت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اسی جذبے کے پیشِ نظر سربراہانِ مملکت بھی آپس میں ایک دوسرے کو تحائف پیش کرتے رہتے ہیں۔ ایسے تحائف کسی بھی ملک میں خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جیسے جب اندراجی نے ضیاء الحق صاحب کو ہندوستانی آم کی پسندیدہ قسم روانہ کی تو اس کے جواب میں ضیاء الحق صاحب نے بھی اندراجی کو پاکستانی آم کی ایک نئی اور نایاب نسل کا تحفہ ارسال فرمایا تھا۔ اسی طرح دونوں ممالک، ہندوستان اور پاکستان کے مابین کوئی ایسا معاہدہ ضرور ہونا چاہیے کہ ایک دوسرے کے عوام بھی جائز طریقوں سے معقول تعداد میں

تحفے لا اور لے جا سکیں اور کسٹم پر انھیں کسی قسم کی پریشانی یا شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔
اب جیسے میں پہلی بار پاکستان گیا اور بہت سے عزیز و اقارب سے تو زندگی میں پہلی بار ملاقات ہوئی۔ وہاں میرے حقیقی اور نزدیکی عزیز ہی تقریباً پچاس ہوں گے۔ میرے لئے یہ لازم تھا کہ میں ان کے لئے اپنے ملک کے بہترین اور چیدہ چیدہ تحفے لے جاتا لیکن قانون کی بالادستی کو اہمیت دینے کی وجہ سے میں وہاں خالی ہاتھ جا کھڑا ہوا۔ اس سے ذہنی طور پر مجھے کتنی خفت اور ندامت ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ لگانا بھی آسان نہیں۔ ایک حقیقت اور، وہ یہ کہ ہم جاتے تو ہیں اپنے احباب سے ملاقات کرنے لیکن آخر کہلاتے تو ہیں ہندوستانی یا پاکستانی، یعنی تحفے دینے یا نہ دینے سے متعلقہ شخص کے ملک کی ناموری بھی جڑی ہوتی ہے۔ چنانچہ مناسب ہوگا اگر ویزا جاری کرنے والا سفارت خانہ دونوں ملکوں کے مابین طے شدہ اشیاء کی فہرست جس میں فی ویزا ان کی تعداد یا وزن بھی درج ہو، ویزا حاصل کرنے والے شخص کو ویزا فارم کے ساتھ دیدے جس کی بنا پر وہ شخص کوئی طے شدہ فارم بھر کر سفارت خانہ میں اپنی درخواست کے ساتھ منسلک کر کے دے اور سفارت خانہ ویزا کے ساتھ ایسی Allowed اشیاء کا اجازت نامہ بھی معہ تعداد یا وزن کے مرحمت فرمادے۔ اس سے عوامی سطح پر تعلقات خوشگوار ہوں گے جن کا حکومتی سطح پر اثر پڑنا لازمی بات ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ تاجِ برطانیہ سے آزادی حاصل کئے ہوئے ہمیں ایک عرصہ ہو گیا پھر بھی ابھی تک ہم نے Queen سے ناطہ نہیں توڑا۔ ٹرین چلائیں گے تو نام رکھیں گے ''دکن کوئین'' (Daccan Queen)، پکچر بنائیں گے تو نام رکھیں گے ''بینڈت کوئین'' (Bandet Queen)، مسوری جائیں گے تو کہیں گے ''ہل کوئین'' (Hill Queen) اور جب اللہ حُسن سے نوازے گا تو صنفِ نازک بننا چاہیں گی

''بیوٹی کوئین'' (Beauty Queen)۔ویسے اس میدان میں ہم دنیا سے اپنا لوہا منوا چکے ہیں اور متعدد بار سہرا ہمارے سر رہا ہے۔تو پھر کیوں نہ ایک ''کوئین'' کو اور گلے لگا لیں اور رکھ دیں۔ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' کا نام ''راحت کوئین'' یا ''حاجات کوئین'' کیوں کہ اس سے ہر طبقے کی ترجمانی ہوتی ہے،لیکن پھر سوچتا ہوں۔

''تو گدھا کمہار کا تجھے رام سے کیا کام''

حواشی

(۱) ۱۹۸۲ء میں میرا تبادلہ بلند شہر سے دہرہ دون کو ہوگیا۔میں نے کچھ کوشش تبادلہ ملتوی کرانے کی کی لیکن وقفے وقفے سے وہ کبھی ملتوی،تو کبھی پھر وہیں ہوتا رہا۔کچھ ماجرہ سمجھ میں نہ آیا تو میں نے اللہ کی طرف سے بہتری ہی سمجھ کر دہرہ دون جانے کا فیصلہ کرلیا۔وہاں جا کر جوائن کرنے کے بعد جب متعلقہ سپرنٹینڈنگ انجینیر ،مسٹر بی۔ڈی۔فنکیے سے ملا تو راز سمجھ میں آیا۔میرے آداب بجالانے پر انھوں نے فرمایا ''سمیع صاحب!کوشش تو آپ نے بہت کی کہ آپ کا تبادلہ ملتوی ہو جائے لیکن اس میں میں ہی مانع رہا۔'' میں نے عرض کیا ''سر!میری آپ سے یہ پہلی ملاقات ہے،اور اس سے پہلے تک غالباً ہم غائبانہ طور بھی ایک دوسرے سے متعارف نہیں تھے،پھر آپ کی اس ناراضگی کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟۔'' انھوں نے قدرِ مسکراتے ہوئے فرمایا ''نہیں،نہیں،ناراضگی نہیں،بلکہ میری خود غرضی،دراصل جب میں نے ٹرانسفر لسٹ میں تمھارا نام دیکھا تو نہ معلوم کیوں مجھے ایسا لگا کہ وہ تم ہی ہو سکتے ہو جو میری پریشانی دور کرسکو گے۔'' میں نے سر جھکاتے ہوئے ایک فرمانبردار فرزند کی طرح پوچھا ''سر!کام بتائیں،اگر میری جان بھی چلی جائے گی تو کوئی پرواہ نہیں!۔'' انھوں نے بہت افسردگی کے عالم میں بیان کرنا شروع کیا، ''میرے چارج میں ایک زیر زمین سرنگ [Under Ground Tunnel] ایک عرصے سے زیر تعمیر ہے لیکن کوئی خاص Progress نہیں ہو پا رہی ہے۔عالم یہ ہے کہ ہمارے Engineers محض

دو روپیہ کے عوض ایک سیمنٹ کی بوری کمپنی کی ملی بھگت سے پانی میں بہا دیتے ہیں۔ [کمپنی کو Cement Consumption basis ، Payment پر ہوتا تھا۔] نتیجتاً اصل ملبے سے بھی کہیں زیادہ ملبے کا ایک پہاڑ سا بنتا جا رہا ہے۔ میرا من کہتا ہے کہ تم اس کو کنٹرول کر سکو گے۔'' اس کے بعد انھوں نے تجسس بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر جھکاتے ہوئے عرض کیا ''سر! آپ بے فکر رہیں۔ میں آپ کے اعتبار پر پورا اترنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔'' میں نے دیکھا کی ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ انھوں نے فرمایا ''تو پھر میں آپ کی پوسٹنگ ''کھودری ٹنل'' [Khodri Tunnel] پر ڈاک پتھر [ضلع دہرہ دون میں جمنا اور ٹونس دریاؤں کے سنگم پر واقع ایک بہت پُر فضا مقام ہے۔ تفصیل کے لئے احقر کی کتاب ''آبگینہ ملاحظہ فرمائیں۔] میں کر رہا ہوں، اور ہاں! ایک اور بات، تم حالانکہ ایک سینیر انجینیر (Senior Enginner) ہو لیکن میں تمھیں جنرل شفٹ میں رکھ رہا ہوں؛ منع یا اعتراض نہ کرنا۔'' میں نے انھیں ہر طرح کا یقین دلایا اور پھر ڈاک پتھر میں جا کر ڈیوٹی جوائن کر لی۔ مجھے سُرنگ (Tunnel) کی کلاور سائٹ [Kalawar Site] پر رکھا گیا۔

ہمارا کام یہ تھا کہ ہیلمیٹ اور گم بوٹ پہن کر، ناک پر ایک مہین سا کپڑا باندھ کر [تا کہ سیمنٹ اور گرد و غبار سے بچا جا سکے۔ اس کے علاوہ سرنگ میں کام کرنے والے زیادہ تر مزدوروں کا تعلق اڑیسہ سے تھا جن میں سے زیادہ تر .T.B کے مریض ہو گئے تھے۔] اور ہاتھ میں ٹارچ لے کر سُرنگ میں جائیں اور وہاں چل رہے کام کا Technically معائنہ کریں نیز آگے کے کام کے لئے .O.K دیں۔ اندر سُرنگ میں جانے کے لئے ایک دوسری کم حجم والی سُرنگ میں سے ہو کر جانا پڑتا تھا جس میں کمپنی [''پٹیل کنسٹرکشن کمپنی''] نے ''ٹریک'' [Track] بچھایا ہوا تھا ان tracks پر باہر رکھے ہوئے بڑے بڑے Compressors کی مدد سے چھوٹے سائز کی ٹرالیاں چلائی جاتی تھیں۔ ہم لوگ بھی ان ٹرالیوں کے ذریعہ اندر خاص سرنگ [Main Tunnel]، جس میں کام چل رہا تھا، میں آیا، جایا کرتے تھے۔ ایک دن حسبِ معمول جیسے ہی ہم خاص سُرنگ میں جانے کے

لئے تیار ہو کر ٹرالی میں بیٹھے کہ کمپنی کے ایک سپروائزر نے ہم سے آ کر کہا کہ آج آپ لوگوں کو لے کر یہ ٹرالی نہیں جائے گی بلکہ چیف انجینیر کا پروگرام ہے لحاظہ ان کے لئے یہ ٹرالیاں مخصوص کر دی گئیں ہیں، آپ لوگ پیدل چلے جائیں۔ میرے کچھ ساتھی تو بُرا مانتے ہوئے بضد ہوئے بھی کہ وہ ٹرالی ہی سے جائیں گے لیکن میں نے انھیں سمجھایا کہ یہ شرط Contract میں نہیں ہے، لحاظہ ہم کمپنی کو مجبور نہیں کر سکتے، اور پھر میں پیدل ہی ان کو لے کر اندر کی طرف بڑھ لیا۔ [خاص سرنگ تقریباً ڈھائی کلومیٹر فاصلے سے تھی۔] ظاہر ہے کہ کام تک پیدل جانے میں وقت تو لگے گا ہی۔ ہم جب تک کام پر پہنچے لیبر O.K کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ اس دن کمپنی کی پروگریس (Progress) بہت کم نکلی۔ چنانچہ سرنگ سے واپسی کے وقت کمپنی کا منیجر میرے پاس آیا اور مجھ سے درخواست کی کہ ہم ٹرالی ہی سے واپس جائیں۔ اس نے معافی طلب کرتے ہوئے یہ بھی انکشاف کیا کہ اس کے سپروائزر نے شرارتاً جھوٹ بولا تھا کہ چیف انجینیر کا پروگرام ہے اور انھوں نے اس سپروائزر کو اب اس سائٹ سے ہٹا دیا ہے۔ میں نے قدرِ لاپرواہی سے جواب دیا ''مسٹر! ہم گاندھی جی کے ملک کے رہنے والے اور ''گاندھی گیری'' پر یقین رکھنے والے ہیں۔ ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ ٹرالی کی سہولت مہیا کرائیں یا نہ کرائیں۔ اس کے بعد میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر آنے کے لئے پیدل ہی اوپر کی جانب چل دیا۔ اس نے ازحد خوشامد کی لیکن ہم نے خود کو تکلیف دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ لیکن اس دن کے بعد سے کمپنی کا پورا عملہ ہمیں اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ باقی تفصیلات آنے والی کتاب ''یادِ ماضی عذاب ہے یارب!'' میں ''گردِ سفر'' ملاحظہ فرمائیگا۔

(۲) عام تاثر یہ پایا جاتا ہے کہ پاکستان ''مسلم لیگ''، یعنی مسلمانوں نے بنایا۔ [ہندی غیر مسلم، بالخصوص فسطائی طاقتیں برِصغیر کے پورے مسلمانوں کو اس کے لئے ذمہ دار ٹھہراتی ہیں (۵) جب کہ پاکستانی مسلمانوں کا ماننا ہے کہ یہ ان کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔] اگر تاریخ کا بغور مطالعہ کریں اور اس دور کے حالات و واقعات (٦) کا جائزہ لیں اور تجزیہ کریں تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کے بنانے میں ''کانگریس'' اور اس کے صفِ اوّل کے چند رہنماؤں کا بھی ہاتھ رہا ہے (٦)۔ اب خواہ انھوں نے بادل

ناخواستہ چاہا ہو، یا مخصوص ذہنیت کے سبب، یا پھر کسی سازش (۷) کا شکار ہو کر۔ یہاں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ''کانگریس'' ہمیشہ سے دو دھڑوں میں بٹی رہی ہے۔ ایک وہ دھڑا جو واقعی ٹیسکولر رہا ہے اور دوسرا وہ جو ہمیشہ سے Non-Secular اور فرقہ پرست طاقتوں کا دمساز نیز اُن کے زیرِ اثر رہا ہے۔ [اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ۱۹۹۲ء میں کانگریس کے ہی وزیرِ اعظم، نرسمہا راؤ کے دورِ اقتدار میں ''بابری مسجد'' کی شہادت کا واقعہ کافی ہے۔] یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ آخر الذکر، اوّل الذکر پر حاوی رہا ہے وگرنہ، نہ تو ملک تقسیم ہوتا اور نہ ہی عوام کے گاڑھے خون کی کمائی دونوں ممالک کو اپنے دفاعی بجٹ پر خرچ کرنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ انھیں کی وجہ سے تقسیم سے پہلے، اس کے وقت اور اس کے بعد جو کچھ ہوا اس نے تقسیم کو دائمی اور ابدی بنا دیا ہے ورنہ ہو سکتا تھا کہ پاکستان خود ہندوستان کے ساتھ اتحاد کا خواہشمند ہو جاتا۔ مگر اب دونوں کے درمیان نفرت و بے اعتمادی کی وہ خلیج حائل ہو چکی ہے جو انھیں صدیوں تک ایک دوسرے سے جدا رکھے گی اور ان کی ایک ہی سمت ہوتے ہوئے بھی وہ ندی کے دو کنارے اور ایک دوسرے کے لئے دردِ سر بن کر رہ گئے ہیں۔ آخر الذکر نے ہی ''برطانوی Conservative پارٹی'' اور اس کے وزیرِ اعظم، مسٹر ونسن چرچل کی یہ پیشن گوئی سچ ثابت کر دکھائی کہ ہمارے (برطانیہ کے) ہندوستان سے ہٹتے ہی وہاں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑیں گے۔ اسی دھڑے کی وجہ سے مسٹر جناح کو کانگریس پر یہ الزام لگانے کا موقع ملا کہ کانگریس دراصل ایک متعصب ہندو قوم پرست جماعت ہے اور اس نے محض منافقت کے ساتھ ہندوستانی قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ [مسٹر جناح نے ۱۹۰۶ء میں سیاست میں قدم رکھا اور سب سے پہلے کانگریس ہی جوائن کی لیکن بعد میں چند کانگریسی لیڈران سے بدظن ہو کر انھوں نے کانگریس چھوڑ کر ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ جوائن کر لی تھی۔ (اس سے پہلے ہی ۱۹۰۹ء میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی۔) اس کے باوجود بھی وہ ہندو۔ مسلم اتحاد کے لئے کوشاں رہے۔ انھیں کی کوششوں سے ۱۹۱۵ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کا بمبئی میں ایک مشترکہ اجلاس بلایا گیا۔ (اسی سال گاندھی جی نے جنوبی افریقہ سے آکر ہندوستانی سیاست میں قدم رکھا۔ یعنی ہندوستانی سیاست کے حوالے سے مسٹر جناح، گاندھی جی سے

سینیر تھے اور غالباً اسی وجہ سے گاندھی جی مسٹر جناح کو قائدِ اعظم کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔)
اس کے بعد ۱۹۱۶ء میں انھوں نے لکھنؤ میں کانگریس۔ مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس سے
خطاب کیا۔ ۱۹۳۷ء میں انھوں نے مسٹر بی۔ جی کھیر، وزیرِ اعلیٰ بمبئی کے ذریعہ گاندھی جی
سے ہندو۔ مسلم اتحاد کی اپیل کی۔ وہ سیاست میں دادا بھائی نوروجی اور بی۔ کے۔ گوکھلے
کے شاگرد تھے۔ یہ دونوں ہی انھیں ہندو۔ مسلم اتحاد کا علمبردار کہا کرتے تھے۔ شری
لال کرشن اڈوانی جو فرقہ پرست تنظیم، ''راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (R.S.S.) کی ایک
شاخ (سیاسی)، ''بھارتیہ جنتا پارٹی'' (B.J.P.) کے صفِ اول کے نیتا اور سخت گیر موقف
رکھنے والے فرد تسلیم کیے جاتے ہیں، کو بھی مسٹر جناح کے مقبرہ پر گل پوشی کرنے اور انھیں
سیکولر کہنے پر مجبور ہونا پڑا۔] اس کے علاوہ فرنگی چالوں، ان کی سازشوں اور ریشہ
دوانیوں (۷) کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل یہودی اسلام کے ازلی دشمن رہے
ہیں اور خود ساختہ انسانیت کے علمبردار ممالک معاشی اعتبار سے ہمیشہ ان کے شکنجے میں
رہے ہیں۔ بقول علامہ اقبالؔ ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے'' [اللہ تبارک وتعالیٰ
نے اس قوم کو تین چیزیں: عقل، دولت اور حسن خصوصیت سے عطا فرمائی ہیں جس کا وہ
شاطرانہ انداز میں بھرپور طریقے سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔] لہٰذا ان ممالک سے کسی ایسے
انصاف کی توقع کرنا عبث ہے جس سے اسلام کو فروغ اور اس کو تقویت حاصل ہو۔

(۳) ملک کی تقسیم کے بعد جب مسلمانوں کو قتل اور ان کی املاک کو لوٹا جانے لگا تو گاندھی جی نے اس کی
مخالفت میں ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء سے ''مرن برت'' شروع کر دیا۔ ان کو اس وقت کے وزیرِ داخلہ،
سردار پٹیل کے جانبدارانہ رویے [قتل وغارتگری کے ضمن میں] سے بھی سخت دلی صدمہ پہنچا تھا۔
جب سردار پٹیل نے قدرِ تلخ لہجے میں گاندھی جی سے ان کے اس سلسلے میں برت رکھنے پر اعتراض
کیا تو گاندھی جی نے جواب دیا کہ وہ اس وقت چین میں نہیں بلکہ پورے ہوش و حواس کے
ساتھ دہلی میں موجود ہیں، اور انھوں نے خود مسلمانوں کو قتل ہوتے اور ان کی املاک کو لٹتے دیکھا
ہے۔ جب گاندھی جی کے برت کی خبر دہلی کے عوام میں پہنچی تو انھوں نے جتھوں کی شکل میں ''برلا
ہاؤس'' جہاں گاندھی جی رکے ہوئے تھے، پہنچ کر ان کو منانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ گاندھی
جی نے اپنے برت ختم کرنے کے عوض ان کے سامنے مندرجہ ذیل شرائط رکھیں:۔۔۔

۱۔ ہندو اور سکھ فوراً مسلمانوں پر حملے کرنے بند کردیں اور انھیں یہ یقین دلائیں کہ وہ ایک بھائی کی طرح ان کے ساتھ رہیں گے۔

۲۔ ہندو اور سکھ ہر ممکن اس بات کی کوشش کریں گے کہ ایک بھی مسلمان خود کو اور اپنی املاک کو غیر محفوظ جان کر ہندوستان سے نہیں جائے گا۔

۳۔ چلتی ٹرینوں میں مسلمانوں پر جو حملے ہو رہے ہیں وہ فوراً روک دیئے جائیں گے اور جو ایسا کر رہے ہیں ان کو باز رکھا جائے گا۔

۴۔ جو مسلمان دہشت کے سبب اپنے اپنے گھروں اور علاقوں کو چھوڑ کر حضرت نظام اولیاءؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی درگاہوں کے پاس چلے گئے ہیں ان کو پھر سے ان کے علاقوں، گھروں میں لایا جائے گا۔

۵۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی مرمت حکومت کی بجائے خود ہندو اور سکھ کریں گے۔

۶۔ مذکورہ بالا اقدامات سے زیادہ اہم یہ بات ہوگی کہ ہندو اور سکھ اقوام کے لیڈران مجھے (گاندھی جی کو) یہ یقین دہانی کرائیں گے کہ پھر سے مجھے اس مسئلے سے نپٹنے کے لئے برت رکھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اس وقت وہاں موجود تقریباً ۲۰،۰۰۰ عورتوں اور مردوں نے یک زبان ہو کر گاندھی جی کی شرائط کو پورا کرنے کا وعدہ اور عہد کیا۔ وہاں موجود ڈپٹی کمشنر، مسٹر رندھاوا تو فوراً ہندؤں اور سکھوں کے ایک گروپ کے ساتھ خواجہ بختیار کاکیؒ کی درگاہ کی مرمت کے لئے چلے بھی گئے۔ اس کے بھی دو دن بعد گاندھی جی نے پورے طور مطمئن ہو جانے پر پوری کیبنٹ [محض سردار پٹیل موجود نہیں تھے۔] کے سامنے اپنا برت توڑا۔ [گاندھی جی کی پوتی ایک گلاس سنترے کا جوس لائیں جو گاندھی جی کے اشارے پر مولانا ابوالکلام آزاد کو دے دیا گیا اور انھوں نے گلاس گاندھی جی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔]

[''انڈیا ونس فریڈم'' ص ۲۳۴ تا ۲۴۰]

(۴) آزادی کے بعد سخت گیر ہندوؤں کی تنظیمیں، ''ہندو مہا سبھا'' اور ''راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ''

گاندھی جی کے انصاف پسندانہ رویئے سے خوش نہیں تھیں۔ انھوں نے کھلے بندوں یہ پروپیگنڈہ کرنا شروع کردیا تھا کہ گاندھی جی ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کررہے ہیں۔ انھوں نے گاندھی جی کی Prayer Meetings میں بھی جاکر قرآن شریف اور بائبل کی verses کے پڑھے جانے کی مخالفت شروع کردی تھی۔ اس ضمن میں انھوں نے اشتہارات اور Hand Bills بھی تقسیم کرتے ہوئے گاندھی جی کے خلاف عوام کو اکسانا شروع کردیا تھا، یہاں تک کہ ایک اشتہار کے ذریعہ تو انھوں نے گاندھی جی کو یہ بھی وارننگ دے ڈالی تھی کہ اگر وہ اپنے رویئے میں بدلاؤ نہیں لائے تو ان کو قتل کردیا جائے گا۔ گاندھی جی نے مسلم کش فسادات کو رکوانے کے لئے جو ''مرن برت'' رکھا تھا اس سے مذکورہ تنظیمیں اور زیادہ برانگیختہ ہوگئی تھیں۔ چنانچہ ایک دن صبح کو جیسے ہی انھوں نے اپنی Prayer Meeting شروع کی، ان پر ایک بم پھینکا گیا۔ اس سے گو کسی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا لیکن عوام میں ایک بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ پولس نے تحقیقات تو کیں لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کے بعد بھی کوئی حفاظتی اقدامات نہیں کئے گئے اور بالآخر چند ہی دنوں بعد، ۳۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو جب گاندھی جی کچھ توقف سے Prayer Meeting میں تشریف لائے تو ناتھورام گوڈسے نامی ایک شخص نے ریوالور سے ان پر تین گولیاں چلائیں جس سے گاندھی جی وہیں انتقال کرگئے۔ اس سے جہاں ملک میں ایک ماتم کی لہر دوڑ گئی وہیں کچھ شہروں، خاص کر گوالیار اور جے پور میں ایک انتہا پسند ہندو گروپ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے مٹھائیاں تک تقسیم کیں اور ان کی خواتین نے قاتل کو اپنے ہاتھ سے سوئٹر تک بن کر بھیجے۔ جب مقدمہ چلا تو اسی گروپ نے پورے شدومد کے ساتھ عدالت میں قاتل کی پیروی کی لیکن جب قاتل کو پھانسی کی سزا ہوگئی تو انھوں نے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے یہ اپیل جاری کی کہ چونکہ گاندھی جی عدم تشدد کے پیرو تھے اس لئے قاتل کی سزائے موت، عمر قید میں تبدیل کردی جائے۔ [''انڈیا ونس فریڈم'' ص ۲۳۴ تا ۲۴۰]

(۵) ملک تقسیم ہوئے ساٹھ سال سے زائد کا عرصہ ہوچکا ہے۔ اُس دور کی نسل تقریباً اللہ کو پیاری ہوچکی ہے اور اس کے بعد کی بھی نسل جوانی کی دہلیز کو عبور کرچکی ہے لیکن فسطائی طاقتوں کے طعنہ و تشنیع ہیں کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتے! اب بھی وہ ہندی مسلمانوں کو پاکستان کے

حوالے سے مستقل مطعون و مرعوب کرتی رہتی ہیں۔ ایسے ہی دو واقعات میرے ساتھ بھی پیش آئے۔ ایک بار جب میں مرادآباد میں [۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۶ء] تعینات تھا تو میں نے ایک ایسے شاطر اور نکمے ''کمپیوٹر'' (ایک پوسٹ کا نام ہے) کی Charge Sheet بنا دی جو اپنے افسران کو بلیک میل کرنے میں ماہر تھا۔ چنانچہ کسی محکمہ جاتی کارروائی سے بچنے کی غرض سے اس نے وہاں سے میرے تبادلے کی کوشش کی۔ جب وہ ناکام ہو گیا تو اس نے یہ شرارت آمیز اور جھوٹی شکایت کر ڈالی کہ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے جیتنے پر میں نے مٹھائی تقسیم کی، پاکستانی جھنڈا لہرایا اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے وغیرہ وغیرہ۔ اس پر میرا جواب طلب کر لیا گیا۔ پہلے تو میں گھبرایا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ کسی کے لمحوں کی غلطیوں سے ہم کیوں صدیوں تک سزا پائیں، میں نے حقیقت پسندانہ اور دنداں شکن جواب دینے کا من بنا لیا۔ میں نے جو جواب دیا وہ کچھ اس طرح سے تھا'' ہر دوا ساز کمپنی کے لئے قانوناً یہ لازمی ہے کہ وہ ہر دوا پر date of manufacturing اور date of expiry کا لیبل چسپاں کرے۔ ان دونوں dates کے درمیان عموماً دو سے تین سال تک کا وقفہ ہوتا ہے۔ [دوا کے لحاظ سے] جس نوعیت کی شکایت کی گئی ہے اس کی date of manufacturing اگست ۱۹۴۷ء رہی ہے، یعنی اس کو manufacture ہوئے تقریباً ۴۸ سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ [یہ واقعہ ۱۹۹۵ء کا ہے۔] اس طرح اس کی ڈیٹ expire ہو چکی ہے۔ اس کے بعد مجھ سے مزید کوئی معلومات نہیں کی گئی۔

اسی طرح ۱۹۶۹ء میں جب میں دہلی میں مرکزی وزارت ''ورکس اینڈ ہاؤسنگ'' کی ایک "National Buildings Construction ،Undertaking Corporation" (N.B.C.C.) میں سروس کرتا تھا تو ایک دن صبح کو جیسے ہی میں دفتر پہنچا کہ میرے ہی ماتحت ایک نقشہ نویس (D'man) نے مجھے مبارکباد دی۔ میں نے جب وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ آج ۱۴/اگست ہے۔ میں تب بھی نہیں سمجھا۔ میری خاموشی پر اس نے پھر کہا کہ سر! آج پاکستان کا یومِ آزادی ہے۔ اس کا یہ طنز سن کر گویا میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ وہ تیر چھوڑ چکا تھا۔ میں نے بمشکل تمام غصہ پیتے ہوئے شکریہ کے ساتھ ترکی بہ ترکی جواب دیا کہ تعجب ہے کہ تم ابھی تک اپنے وطن کو نہیں بھولے!!

[وہ سندھ کا رہنے والا تھا جواب پاکستان کا حصہ ہے۔]

(۶) مولانا ابوالکلام آزاد نے "India Wins Freedom" میں تفصیل سے ان حالات و واقعات نیز کانگریس کی غلطیوں کا ذکر کیا ہے جن کے سبب پاکستان عالم وجود میں آیا۔ بقول مولانا موصوف **''دو قومی نظریہ'' ["Two Nation Theory"] پیش ضرور مسٹر جناح نے کیا تھا لیکن اس کو جلاء سردار پٹیل نے بخشی؛ پرچم تقسیم ھند بلند بے شک مسٹر جناح نے کیا تھا لیکن اس کو لھرایا سردار پٹیل نے۔** سردار پٹیل اس حد تک تقسیم ہند کے حامی ہو گئے تھے کہ انھوں نے بابائے قوم مہاتما گاندھی کو بھی اس کے حق میں کر لیا تھا جو پہلے یہ کہا کرتے تھے کہ اگر تقسیم ہوگی تو وہ میری ارتھی پر سے ہوگی اور میں کانگریس کو بھی کسی حال میں اس پر رضامند نہیں ہونے دوں گا۔ سردار پٹیل اپنے موقف میں اس حد تک سخت گیر ہو گئے تھے کہ وہ تقسیم کے علاوہ مسائل کا کوئی حل سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ ان دا س حد تک ورغلانے کا کام ہندوستان کے وائسرائے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا تھا۔ (۔) وہ یہ سوچنے لگے تھے کہ کچھ علاقہ دے کر مسلم لیگ کو سبق سکھایا جا سکتا ہے: کچھ ہی عرصے بعد پاکستان خود Collaps ہو جائے گا اور جو صوبے اس میں ہوں گے وہ مصیبت میں گرفتار ہو کر بالآخر ہندوستان میں شامل ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

["India Wins Freedom" ص ۱۹۵ تا ۲۲۵]

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کو تقسیم پر راضی کرنے کے بعد لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور کرشنا مینن کے توسل سے جواہر لال نہرو کو بھی آمادہ کرایا تھا۔ جب مولانا نے جواہر لال جی سے اس سلسلے میں مخالفانہ بات کی تو انھوں نے قدرے جذباتی انداز میں مولانا ہی کو سمجھایا کہ جذبات میں نہ بہہ کر وہ حقیقت پسندانہ روش اختیار کریں اور تقسیم کی مخالفت ترک کر دیں۔ انھوں نے یہاں تک کہا کہ اب میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی مخالفت کروں۔

["India Wins Freedom" ص ۱۹۸ تا ۲۰۲]

''صوبائی خودمختاری اعلانیہ''["Govt. of India Act 1935"] کے بعد ۱۹۳۷ء میں پہلی بار جو انتخابات ہوئے اس میں زیادہ تر صوبوں میں کانگریس کی، یا اس کے تعاون سے حکومتیں بنیں۔ [پانچ اہم صوبوں میں تو وہ Absolute Majority میں اور چار صوبوں میں Single Largest پارٹی کی شکل میں برسرِ اقتدار آئی تھی۔] پنجاب میں کانگریس کے تعاون سے "Unionist" پارٹی برسرِ اقتدار آئی اور خضر حیات خاں وزیرِ اعلیٰ منتخب ہوئے۔ انھوں نے ''ہندومہاسبھا'' [اس وقت کی ہندو وادی تنظیم] کو بھی وزارت میں شامل کیا۔ بنگال میں کانگریس کے تعاون سے ''کرشک پرجا پارٹی'' [اس پارٹی کو اے۔ کے۔ فضل الحق جو ۱۹۳۵ء میں کلکتہ کے Mayor رہ چکے تھے، نے ۱۹۳۶ء میں قائم کیا تھا۔] برسرِ اقتدار آئی اور اے۔ کے۔ فضل الحق وزیرِ اعلیٰ منتخب ہوئے۔ انھوں نے شیاما پرساد مکھرجی [ایک کٹر ہندو] کو بھی وزارت میں شامل کیا لیکن اسی سال کانگریس نے Horse Trading کرنے کے بعد فضل الحق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ [اسی وجہ سے فضل الحق ۱۹۴۵ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔] یو۔ پی میں کانگریس کی سرکار بنی۔ یو۔ پی میں چودھری خلیق الزماں اور نواب اسمٰعیل خاں مسلم لیگ کے صفِ اول کے لیڈران میں سے تھے۔ مولانا آزاد جب حکومت سازی کے سلسلے میں لکھنؤ گئے تو انھوں نے مذکورہ دونوں لیڈران کو یہ یقین دہانی کرادی تھی کہ انھیں وزارت میں شامل کرلیا جائے گا۔ اس کے بعد مولانا تو حکومت سازی ہی کے سلسلے میں پٹنہ چلے گئے اور جواہر لعل جی نے مولانا کی یقین دہانیوں کے برعکس ان دونوں کو لکھا کہ ان میں سے محض ایک ہی کو وزارت میں شامل کیا جاسکتا ہے، وہ بھی جس کا نام ان کی پارٹی، مسلم لیگ طے کرے گی۔ اس پر دونوں ہی نے وزارت میں شمولیت سے انکار کردیا۔ [یو۔ پی میں مسلم لیگ کے ۲۶ ممبر منتخب ہو کر آئے تھے جو ایک بڑی کامیابی تھی۔ یہ کامیابی جمعیۃ العلماء کے تعاون کے سبب حاصل ہوگئی تھی۔] اس واقعہ کا مسٹر جناح نے فائدہ اٹھایا۔

["India Wins Freedom" ص ۱۷۰، ۱۷۱]

بہار میں کانگریس Absolute majority میں جیت کر آئی تھی۔ وہاں ڈاکٹر سید محمود سب سے زیادہ سینیر کانگریسی ہونے کے ساتھ ساتھ ''آل انڈیا کانگریس کمیٹی'' کے جنرل

سکریٹری بھی تھے۔ چنانچہ یہ سمجھا جا رہا تھا کہ وہ ہی وہاں کے وزیرِ اعلیٰ منتخب کیے جائیں گے لیکن ڈاکٹر راجندر پرشاد نے وہی کام کیا جو بقول مولانا آزاد، سردار پٹیل بمبئی میں کر چکے تھے۔[بمبئی میں مسٹر نریمن سب سے زیادہ جانی پہچانی کانگریسی شخصیت تھے۔ امید یہ کی جا رہی تھی کہ وہ ہی وزیرِ اعلیٰ منتخب کیے جائیں گے لیکن جب وقت آیا تو ان کے پارسی (اقلیتی فرقے سے) ہونے کی وجہ سے سردار پٹیل اور ان کے ساتھیوں نے ان کے نام کی مخالفت کی اور بی۔ جی کھیر کو وزیرِ اعلیٰ بنا دیا گیا۔ مسٹر نریمن نے احتجاج بھی کیا لیکن اسے مسترد کر دیا گیا۔] ڈاکٹر راجندر پرساد نے بھی ڈاکٹر سید محمود کے اقلیتی فرقے سے ہونے کے سبب انکی حق تلفی کرتے ہوئے شری کرشن سنہا اور انوگرہ نرائن سنہا جو مرکزی اسمبلی کے ارکان تھے، کو بہار واپس بلا کر شری کرشن سنہا کو وزیرِ اعلیٰ بنوا دیا۔

اسی طرح کی تنگ نظری کا ایک اور واقعہ اس سے پہلے بھی رونما ہو چکا تھا۔ ۱۹۲۱ء کے عشرے میں مسٹر سی۔ آر۔ داس جو ایک کھلے ذہن کے اور کلکتہ کے ایک مشہور وکیل تھے، نے یہ اعلان کیا کہ اگر کانگریس اقتدار میں آئی تو وہ مسلمانوں کے لئے تب تک نئی سرکاری ملازمتوں میں ساٹھ فی صد کو نہ مختص کرے گی جب تک کہ ان کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب تک نہ ہو جائے۔[بنگال میں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن سیاسی اور تعلیمی اعتبار سے وہ ہندوؤں کے مقابلے میں پسماندہ تھے۔ بمشکل تمام ۳۰ فیصد ہی وہ سرکاری ملازمتوں میں تھے۔] انھوں نے کلکتہ کارپوریشن میں تو اسّی فیصدی تک reservation رکھنے کی بات کہی۔ حالانکہ بنگالی کانگریسیوں نے ان کی اس بات پر سخت مخالفت بھی کی حتیٰ کہ انھیں مسلم نواز تک کہا گیا لیکن وہ اپنے فیصلے پر تاحیات قائم رہے۔ تقریباً ۱۹۲۵ء میں ان کے انتقال کے بعد ان کے ساتھیوں نے ان کے اعلانات کو پسِ پشت ڈال دیا۔ نتیجتاً بنگال کے مسلمان جو کانگریس کے ہمنوا ہو گئے تھے، اس سے دور ہو گئے اور **تقسیم کا پہلا بیج بویا گیا۔**

دوسری جنگِ عظیم [جو ۱۹۳۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی] کے دوران برٹش حکومت نے جو جنگی حکمت عملی اختیار کی اس کے گاندھی جی سخت مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جرمنی سے یہ لڑائی عدم تشدد (Non-Violance) کے ہتھیار سے لڑی جائی

چاہیے۔ چنانچہ جب اپریل ۱۹۴۲ء میں "Cripps Mission" ہندوستان آیا اور اس نے کانگریسی رہنماؤں سے بات کی ["Cripps Mission" نے یہ تجویز رکھی کہ اگر ہندوستان جنگ میں شمولیت اختیار کر لینے پر رضامند ہو جاتا ہے تو لڑائی ختم ہو جانے کے بعد اس کو آزاد کر دیئے جانے کے سلسلے میں برٹش حکومت غور کرے گی۔] تو کافی غور وخوض کے بعد ''کانگریس ورکنگ کمیٹی'' نے یہ قرارداد منظور کی کہ اگر برٹش حکومت ہندوستان کو آزاد کر دینے کا اعلان کر دیتی ہے تبھی کانگریس برٹش حکومت کی مدد کرے گی۔ اس قرارداد کی مخالفت میں گاندھی جی کے قریبی مداحوں: سردار پٹیل، ڈاکٹر راجندر پرساد، آچاریہ کرپلانی، ڈاکٹر پرفل گھوش وغیرہ نے یہ کہتے ہوئے ''ورکنگ کمیٹی'' سے استعفے دے دیے تھے کہ عدم تشدد آزادی سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ ہے۔ [بالآخر یہ مشن ناکام ہو گیا تھا۔] لیکن جب **۱۹۴۷ء میں آزادی کے وقت فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کی غرض سے اس وقت کے کمانڈر ان چیف نے یہ مشورہ دیا کہ ملک کی تقسیم کے بعد بھی کم سے کم تین سال تک فوج کو ایک ہی رہنے دیا جائے** تو انھیں مذکورہ لیڈران نے اس تجویز کی مخالفت کی، نتیجتاً ملک کے ساتھ ساتھ فوج بھی تقسیم ہوئی اور اس کے منفی اثرات فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے میں حائل ہوئے۔

۱۹۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم ختم ہو جانے پر جب برطانیہ میں "Labour Party" برسرِ اقتدار آئی تو اس نے ہندوستان کو آزادی دینے کے حوالے سے ایک مشن ("British Cabinet Mission") ہندوستان بھیجا جو ۲۳؍مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان آیا۔ [اس مشن میں شامل افراد کے نام آگے دیئے جا رہے ہیں۔] ۱۶؍مئی کو اس مشن کا متن شائع کر دیا گیا جس کو کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں نے مان لیا تھا۔ اس کے بعد ۱۰؍جولائی کو جواہر لعل نہرو جو اس وقت کانگریس کے صدر تھے، نے بمبئی میں ایک پریس کانفرنس بلا کر ایک بیان دے دیا جس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ کانگریس نے محض اصولی طور پر "Constituent Assembly" میں شمولیت اختیار کی ہے۔ چنانچہ وہ

"Cabinet Mission Plan" میں کوئی بھی ترمیم وتنسیخ کرنے میں خودکوآزاد سمجھتی ہے۔ اس پر مسلم لیگ کو یہ اعتراض کرنے کا موقع مل گیا کہ ''مسلم لیگ کونسل'' نے اس یقین دہانی پر دہلی میں مذکورہ پلان کو منظور کیا تھا کہ اس کو کانگریس نے بھی منظور کرلیا ہے اور یہ پلان ماضی میں Indian Constitution کی بنیاد ہوگا۔ لیکن اب کانگریس پریسیڈینٹ کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ Constituent Assembly میں اپنی اکثریت کی بنیاد پر اس میں ردوبدل کردیں گے۔ جس کے یہ معنی ہوئے کہ اقلیت اکثریت کے رحم وکرم پر ہوگی۔ اس کے بعد ۲۷ر جولائی کو ''مسلم لیگ کونسل'' کی بمبئی میں میٹنگ ہوئی جس کی افتتاحی تقریب میں مسٹر جناح نے پھر سے پاکستان کی مانگ کرتے ہوئے کہا کہ اب محض یہی راستہ بچا ہے۔ غرضیکہ تین دنوں کے بحث ومباحثہ کے بعد مسلم لیگ نے "Cabinet Mission Plan" مسترد کردیا اور پاکستان کے حصول کے لئے ۱۶ر اگست کو سیدھی کارروائی (Direct Action) کے لئے ایک Resolution منظور کیا۔ ["India Wins Freedom" ص ۱۴۳ تا ۱۶۶]

اسی کے بعد نواکھالی، کلکتہ، بہار، یو۔پی (گڈھ مکتیشر)، پنجاب (لاہور، تکشلہ، امرتسر، راولپنڈی وغیرہ) وغیرہ میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔

بقول مولانا ابوالکلام آزاد، **جواھر لل جی کا مذکورہ بیان بے وقت اور نامناسب تھا۔ اس کی وجہ سے غلط فہمیوں اور تلخیوں میں اضافہ ھوا نیز دوریاں بڑھیں۔**

مذکورہ واقعہ کے بعد مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شامل ہونے سے منع کردیا تھا لیکن بعد میں وائسرائے، Lord Wavell کے سمجھانے پر وہ ۱۵ر اکتوبر کو عبوری حکومت میں شامل ہونے پر رضامند ہوگئی۔ [کانگریس ارکان پہلے ہی ۲ر ستمبر کو حلف لے چکے تھے۔] وائسرائے نے یہ تجویز رکھی کہ کلیدی وزارت میں سے ایک مسلم لیگ کو دے دی جائے اور اس ضمن میں انھوں نے وزارت داخلہ کا مشورہ دیا۔ [مولانا آزاد بھی اس کے حق میں تھے کیوں کہ وزارت داخلہ میں کرنے کو کوئی زیادہ اہم کام نہیں تھا کیوں کہ نظم ونسق کی

ذمہ داریاں صوبائی حکومتوں کے پاس تھیں۔] لیکن سردار پٹیل جو اس وقت وزیر داخلہ تھے، اس پر آمادہ نہیں ہوئے اور وزارت ہی سے مستعفی ہو جانے کی دھمکی دے ڈالی۔ بعد میں رفیع احمد قدوائی کی تجویز جس کی سردار پٹیل نے پُرزور الفاظ میں تائید کی، پر مسلم لیگ کو وزارتِ خزانہ سپرد کر دیا گیا۔ [سردار پٹیل کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کے پاس اس وزارت کا اہل کوئی شخص نہیں ہے۔] مسلم لیگ نے اس وزارت کے لئے نواب زادہ لیاقت علی خاں [ان کا تعلق یو۔ پی میں واقع مظفر نگر ضلع کے زمیندار گھرانے سے تھا۔ ۱۹۲۳ء میں وہ سیاست میں آئے تھے۔] کا نام پیش کر دیا۔ [لیاقت علی خاں کے علاوہ مسلم لیگ کی طرف سے آئی۔ آئی چندریگر، عبدالرب نشتر، غضنفر علی اور جوگیندر ناتھ منڈل کے نام وزارت میں شامل کئے جانے کے لئے وائسرائے کو بھیجے گئے تھے۔] اس کے بعد لیاقت علی خاں نے کانگریسی وزراء کا ناطقہ تنگ کر دیا۔ [وزارتِ خزانہ اتنی اہم ہوتی ہے کہ ہر وزارت کا اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ حد یہ ہو گئی تھی کہ سردار پٹیل اپنی مرضی سے ایک چپراسی تک نہیں رکھ سکتے تھے۔ ["India Wins Freedom" ص ۱۷۷، ۱۷۸]

اس طرح **سردار پٹیل کی ضد کی وجہ سے کانگریسی وزراء کو عجیب و غریب حالات سے دوچار ہونا پڑا اور تلخیوں میں مزید اضافہ ہوا۔** بات یہیں ختم نہیں ہوئی، لیاقت علی خاں نے جو بجٹ پیش کیا اس کی سردار پٹیل اور راج گوپال آچاریہ نے یہ کہتے ہوئے زبردست مخالفت کی کہ لیاقت علی خاں ملک کے مفادات کی فکر نہ کر کے سرمایہ داروں کے خلاف ہیں۔ ان کا یہ بھی الزام تھا کہ چونکہ سرمایہ داروں کی اکثریت ہندو ہے اس لئے وہ ان کے خلاف ہیں اور بجٹ فرقہ وارانہ بنیاد پر تیار کیا گیا ہے۔ اس کا لیاقت علی خاں نے یہ کہہ کر جواب دیا کہ بجٹ کانگریس کے declaration کی بنیاد پر ہی تو تیار کیا گیا ہے۔ غرضیکہ mis-trust اور فرقہ وارانہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔

ایک غلط فہمی اور تلخی جواہر لال جی کی اس بات سے بھی پیدا ہوئی کہ وہ حکومت سازی کے بعد "Council of Ministers" کی میٹنگ کے لئے وزراء کو چائے پر مدعو کرنے کے واسطے دعوت نامے

اپنے پرائیوٹ سکریٹری کی طرف سے بھجوایا کرتے تھے۔ اس پر لیاقت علی خاں نے اپنی توہین محسوس کی کہ ایک پرائیوٹ سکریٹری انھیں چائے کی دعوت دے۔ اس کے علاوہ ان کا یہ بھی اعتراض تھا کہ کونسل کا نائب صدر (جواہر لعل جی) میٹنگ طلب کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ الغرض انھوں نے الگ سے مسلم لیگ کے وزراء کی میٹنگ طلب کرنی شروع کر دیں۔ ["India Wins Freedom" ص۱۸۰]

(۷) برطانیہ کی Conservative پارٹی، اس کے وزیرِ اعظم مسٹر چرچل اور دیگر انگریز مدبرین ہندوستان کو آزاد کرنے کے حوالے سے یہ کہہ کر مخالفت کرتے رہے تھے کہ ہمارے ہٹتے ہی وہاں فرقہ وارانہ فسادت پھوٹ پڑیں گے۔ لیکن دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے [یہ جنگ جرمن کے پولینڈ پر یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو حملہ کر دینے سے شروع ہو کر امریکہ کی جاپانی شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر بالترتیب ۶/اگست اور ۹/اگست ۱۹۴۵ء کو بمباری کر دینے سے ۱۵/اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کے surrender کرنے کے بعد ۲/ستمبر کو اس کے جنگ بندی معاہدے پر دستخط کر دینے پر ختم ہوئی۔] کے بعد جب برطانیہ میں "لیبر پارٹی" برسرِ اقتدار آئی تو اس کے وزیرِ اعظم، مسٹر ایٹلی نے ۲۰ رفروری ۱۹۴۷ء کو دارالعوام میں ایک بیان دیا جس کی رو سے اہلِ ہند کو اقتدار منتقل کرنے کی آخری تاریخ یکم جون ۱۹۴۸ء مقرر کی گئی تھی۔ وائسرائے ہند، Lord Wavell [لارڈ ویول کو ۱۹۴۳ء میں ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہندوستان ہی میں برطانوی فوج کے Commander-in-Chief تھے۔] نے یہ کہتے ہوئے کسی تاریخ کے تعین کی مخالفت کی کہ ابھی حالات سدھرنے دیں اور جلد بازی نہ کریں۔ [لارڈ ویول کو "British Cabinet Mission" جو ۳۰/مارچ ۱۹۴۶ء کو ہندوستان آیا تھا اور جس کے فیصلے کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے تسلیم کرتے ہوئے اکتوبر ۱۹۴۶ء میں مرکزی عبوری حکومت تشکیل دے لی تھی، سے یہ توقع تھی کہ دونوں پارٹیاں بالآخر ایک ایسا Constitution وضع کر لیں گی جس سے آزادی کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات نہیں ہوں گے۔] "Conservative پارٹی" نے بھی اس فیصلے کی یہ کہتے ہوئے مخالفت کی کہ اتنے بڑے تغیر کو روبعمل لانے کے انتظامات کرنے کے لئے محض پندرہ ماہ کی

مہلت ناکافی ہے۔ لیکن مسٹر ایٹلی اپنی ضد پر قائم رہے تو لارڈ ویول استعفیٰ دے کر ہندوستان سے واپس اپنے وطن چلے گئے۔ [روانگی سے ایک دن قبل انھوں نے آخری بار Cabinet کی میٹنگ کی صدارت کرنے کے بعد ایک مختصر سی تقریر کی۔ سب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ میں نے ایک بہت نازک وقت میں وائسرائے ہند کا عہدہ سنبھالا تھا۔ میں نے نہایت دیانتداری سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں لیکن حالات کے پیش نظر مجھے استعفیٰ دینا پڑا۔ یہ وقت ہی بتائے گا کہ استعفیٰ دینے میں میں کس حد تک صحیح ہوں۔ میری آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ لوگ کسی جلد بازی سے کام نہ لیں۔ وغیرہ وغیرہ]

لارڈ ویول کے بعد Lord Mount Batton [وہ ملکۂ برطانیہ کے شوہر، پرنس فلپ کے چچا ہوتے تھے۔] نے ۲۲/ مارچ ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچ کر ۲۴/ مارچ کو ہند کے وائسرائے اور گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال لیا۔

ہندوستان کو آزاد کرنے کے حوالے سے برطانیہ کے سامنے دو ہی راستے تھے؛ یا تو وہ خود خوشی خوشی (بظاہر) آزادی دے کر ماضی میں اپنے مفادات کی حفاظت کرتا رہے؛ یا پھر نکال دئے جانے کی صورت میں ماضی کے مفادات سے بھی محروم ہو جائے۔ اس نے پہلے راستے کو اختیار کیا۔ چنانچہ لارڈ ماونٹ بیٹن نے بہت شاطرانہ انداز میں مئی کے وسط تک تقسیمِ ہند کا خاکہ جس میں پنجاب، بنگال اور آسام کی تقسیم کا تصور بھی موجود تھا [۱۹۴۶ء تک پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا تخیل تک بھی نہ تھا۔] مکمل کر کے اور برطانوی حکومت سے بھی منظوری لینے کے بعد ۳/ جون ۱۹۴۷ء کو یہ اعلان کر دیا کہ ہندوستان کو ۱۵/ اگست ۱۹۴۷ء تک دو آزاد مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح جس کام کے لئے پندرہ ماہ کا عرصہ ناکافی سمجھا جا رہا تھا اس کے لئے بنا کسی پیشگی تیاری کے اور جان بوجھ کر جلد بازی میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ وہ ۷۲ دنوں میں مکمل کر دیا جائے گا۔ بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی "**یہ صریحاً ایک ارادی شرارت تھی تاکہ تقسیم سخت افراتفری کے عالم میں ہو اور کشت و خون سے یہ سرزمین لالہ زار بن جائے۔ اگر آدمیت سے تقسیم**

کا معاملہ طے پاتا۔ شرافت سے اس پر عمل در آمد ہوتا اور اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے بھی منصفانہ سلوک کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ کچھ مدت بعد پاکستان خود ہندوستان کے ساتھ اتحاد کا خواہشمند ہوتا۔ مگر اب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان دو دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں جو صدیوں تک انہیں ایک دوسرے سے جدا رکھیں گی۔"

[''تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان'' حصہ دوم ص ۲۹۵ تا ۲۹۸]

تقسیم سے پہلے، تقسیم کے وقت اور تقسیم سے اب تک جو حالات رونما ہوئے یا ہو رہے ہیں وہ سب ایک سوچی سمجھی صیہونی سازش کے تحت انجام پائے یا انجام پا رہے ہیں اور انجام پاتے رہیں گے (خدا نہ کرے)۔ اس ضمن میں چند واقعات نقل کئے جا رہے ہیں:

برطانیہ کا مفاد اس میں تھا کہ ہندوستان متحد نہ رہنے پائے۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سب سے پہلے سردار پٹیل پر ہاتھ رکھا۔ [کیوں کہ وہ ایک مرد آہن ہونے کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کے بھی بہت قریب تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ظاہرہ پیار میں ان کو walnut (اخروٹ، جو اوپر سے سخت لیکن اندر سے شیریں اور ملائم ہو) کہتے تھے۔] ان کو تقسیم ہند پر راضی کرنے کے لئے یہ پٹی پڑھائی کہ ہندوستان کا شمال۔ مشرقی اور شمال۔ مغربی کچھ علاقہ مسلم لیگ کو دے کر باقی ملک کو متحد، مضبوط اور خوشحال بنالیا جائے۔

سردار پٹیل کو ہموار کر لینے سے گاندھی جی بھی تقسیم ہند پر راضی ہو گئے تھے حالانکہ اس سے پہلے تک وہ یہ کہتے رہے تھے کہ تقسیم ان کی ارتھی پر سے ہوگی اور وہ کسی بھی حال میں کانگریس پارٹی کو بھی اس پر راضی نہیں ہونے دیں گے۔

سردار پٹیل کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواہر لعل جی پر ڈورے ڈالے۔ پہلے تو نہرو جی نے تقسیمِ ہند کی سخت مخالفت کی لیکن پھر قدم بقدم لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی کوششوں سے انھوں نے بھی تقسیم کی مخالفت ترک کر دی تھی۔ بقول مولانا آزاد، نہرو جی کو رام کرنے کے لئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور کرشنا مینن کی Services استعمال کیں۔

اس طرح ایک ماہ کے اندر اندر لارڈ ماؤنٹ بیٹن تقسیم کے حوالے سے اپنے مشن میں کامیاب ہوگیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مولانا آزاد کو بھی ہمنوا بنانا چاہا لیکن مولانا نے جب مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ بنا تقسیم کے ہی کلکتہ، نواکھالی، بہار، یوپی (گڈھ مکٹیسر)، بمبئی اور پنجاب (لاہور، امرتسر، راولپنڈی، تکشلہ وغیرہ) وغیرہ میں فرقہ وارانہ فسادات ہو گئے ہیں تو پھر تقسیم سے تو اور بھی خون کی ندیاں بہہ نکلیں گی جس کے لئے برطانیہ کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا، تو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا کہ **میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ فسادات اور خون خرابہ نہیں ہونے دوں گا۔ میں ایک سپاہی ہوں، عام شہری نہیں۔ ایک بار بنیادی طور سے تقسیم طے پا جانے تو پھر میں یہ احکامات جاری کردوں گا کہ ملک میں کہیں بھی فرقہ وارانہ فسادات نہ ہونے پائیں۔ اگر کہیں تھوڑی سی بھی کسی نے حرکت کی تو میں اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں گا۔ میں مسلح پولس استعمال نہیں کروں گا بلکہ ہوائی اور پیدل فوج کو حکم دوں گا کہ وہ ہوائی جہازوں اور ٹینکوں سے بمباری کرکے ہر فسادی کا قلع قمع کردیں۔** ["India Wins Freedom" ص ۲۰۷]

لیکن ان یقین دہانیوں کے برعکس ملک کے دارالخلافہ دہلی میں بھی مسلمانوں کا خون ارزاں ہوا؛ خواتین کی آبروریزی کی گئی؛ دن کی روشنی میں بھی سڑکیں، گلی، کوچے ان کی لاشوں سے پٹ گئے غرضیکہ ان پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا، تب لارڈ ماؤنٹ بیٹن کہاں چلے گئے تھے؟ وہ تو تب بھی گورنر جنرل کے عہدے پر فائز تھے!۔

بنگال اور پنجاب صوبوں کی تقسیم میں بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ہی شرارت تھی۔ ورنہ ۱۹۴۶ء تک تو ان صوبوں کی تقسیم کا تخیل تک بھی نہ تھا۔ مسلم لیگ کے تجویز کردہ مسلم علاقے میں آسام بھی پورا پورا شامل تھا۔ اس وقت مجوزہ پاکستان کے مغربی حصے میں غیر مسلموں کی تعداد ۳۷،۹۳ فیصدی اور مشرقی حصے میں (بشمولیت آسام) ۴۸،۳۱ فیصدی تھی۔ [''تحریکِ آزادئ ہند اور مسلمان'' حصہ دوم] اس ضمن میں **لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریسی لیڈران کو یہ تاکید کردی تھی کہ وہ اپنے طور ان صوبوں کی تقسیم کا مسئلہ نہ اٹھائیں اور یہ یقین دہانی کرادی تھی کہ وہ (لارڈ ماؤنٹ بیٹن) خود مناسب وقت پر اس سے نپٹ لیں گے۔**

یہاں یہ قابلِ ذکر ہے کہ "Cabinet Mission Plan" [اس مشن کو ہندوستان بھیجنے کا اعلان برطانوی وزیرِ اعظم، مسٹر ایٹلی نے ۱۹؍فروری ۱۹۴۶ء کو کیا تھا۔ اس میں برطانوی وزارتِ کونسل کے تین ممبران Lord Pethick Lawrance (Secretary of State for India)، Sir Stafford Cripps (President of Board of Trade) اور Mr. A.V. Alexander (First Lord of Admiralty) شامل تھے۔ یہ مشن ۲۳؍مارچ ۱۹۴۶ء کو دہلی پہنچا، ۱۶؍مئی کو اس نے ایک بیان جاری کیا جس میں اس نے ماضی میں ہندوستانی حکومت کے بارے میں مختصراً اظہارِ خیال کرتے ہوئے ایک detailed constitution بنانے کی حکمت عملی وضع کرنے کی بات کہی۔ اس کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے منظور کر لیا تھا۔ اس کے بعد ۲۹؍جون ۱۹۴۶ء کو یہ مشن ہندوستان سے واپس چلا گیا۔] میں جو Grouping کی گئی تھی اس کی رو سے پورے ملک کو تین گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک میں پنجاب، شمالی۔ مغربی صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان؛ دوسرے میں بنگال اور آسام اور تیسرے میں ہندوستان کا باقی علاقہ رکھا گیا تھا۔ [''بھارت کا برہت اتیہاس'' (ہندی) حصہ سوم ص ۳۵۷] جب ''آسام کانگریس'' نے یہ کہتے ہوئے گروپ سے علیحدگی اختیار کرنی چاہی کہ شروع ہی سے کوئی بھی یونٹ کسی گروپ سے نکل کر کسی بھی دوسرے گروپ میں شمولیت اختیار کر لینے کی مجاز ہے اور اس کی گاندھی جی نے بھی تائید کر دی تھی، تو مسٹر جناح نے یہ کہتے ہوئے اس کی مخالفت کی [کیوں کہ وہ آسام پر بھی اپنا حق سمجھتے تھے] کہ مذکورہ پلان میں کوئی بھی ردوبدل کرنے سے معاہدے کی بنیاد ہی تبدیل ہو جائے گی۔ پلان کی رو سے قانون سازی کے بعد ہی کوئی صوبہ علیحدگی اختیار کر سکتا ہے۔ اس سے ہی کسی صوبے کو کافی اختیارات مل جاتے ہیں کہ وہ جس گروپ میں جانا چاہے اس میں شمولیت اختیار کر لے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مسٹر جناح کے اس موقف کی تائید کی ہے۔ ۶؍دسمبر ۱۹۴۶ء کو برطانوی کیبنیٹ نے بھی اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنا فیصلہ دے دیا تھا۔ ["India Wins Freedom" ص ۱۸۷]

بہر حال، تقسیم کے حوالے سے ۳؍جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جو پالیسی اعلانیہ

جاری کیا اس کے مختصراً اہم نکات اس طرح سے ہیں :۔

۱۔ اگر مسلم اکثریتی والے علاقے چاہیں، تو وے ایک علیحدہ Dominion بنا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس مقصد کے لئے ایک نئی آئین ساز (Constituent) (सविधान निर्मात्री) اسمبلی بیٹھے گی۔ مگر ایسا ہونے پر، اگر ان صوبوں کی اسمبلیوں کے ہندو اکثریتی اضلاع کے نمائندوں نے چاہا، تو بنگال اور پنجاب کی تقسیم ہوگی۔ [یہی وہ شق ہے جس کی بنا پر پنجاب اور بنگال کا بٹوارہ ہوا اور جس کی بابت لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا۔]

۲۔ شمال۔ مغرب سرحدی صوبے میں استصوابِ رائے (Refrendum) ہوگا جس کے ذریعہ یہ طے کیا جائے گا کہ اسے پاکستان میں شامل ہونا شاہئے یا نہیں۔

۳۔ استصوابِ رائے کے ذریعہ عوام کا رجحان جاننے کے بعد ضلع سہلٹ، بنگال کے مسلم اکثریتی علاقے کے ساتھ ملا دیا جائے گا۔

۴۔ بنگال اور پنجاب میں ہندو اور مسلم صوبوں کی سرحدیں متعین کرنے کے لئے ''سرحدی کمیشن'' تشکیل دئے جائیں گے۔

۵۔ پارلیامنٹ کے موجودہ اجلاس میں فوراً ہندوستان کو Dominion Status دینے کے لئے (یا پھر اگر تقسیم کا فیصلہ لیا جاتا ہے تو دو Dominion بنانے کے لئے) قانون بنایا جائے گا۔ اس سلسلے میں قانون ساز اسمبلی (یا اسمبلیاں) کے آخری فیصلے پر اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس تاریخی اعلانیہ کا عوام میں ملا جلا ردِ عمل ہوا۔ کانگریس نے افسوس اور مسلم لیگ نے غیر اطمینانی کا اظہار کیا۔ [''بھارت کا برہت اتیہاس'' (ہندی) حصہ سوم ص ۳۵۹]

(۲) "دُعائیہ کلمات"

خدا کرے وہ دن جلد آئیں جب دونوں کے مابین اس حد تک تعلقات اُستوار وخوشگوار ہو جائیں کہ:۔

۱۔ دونوں اپنی اپنی سرحدوں سے فوجیں ہٹا کر اور بھاری دفاعی بجٹ میں مناسب حد تک کٹوتی کرتے ہوئے اپنے وسائل کو اپنے عوام کی فلاح و بہبود اور ان کے معیارِ زندگی بلند کرنے میں صرف کریں۔

[خدا کا شکر ہے کہ دعا قبول ہوئی اور ۲/اکتوبر سے دونوں ممالک کے درمیان سری نگر۔ مظفر آباد اور پونچھ۔ راولکوٹ کے راستوں سے تجارت شروع ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ اٹاری۔ واگہہ (پنجاب سیکٹر) اور کھوکھراپار۔ منا بادہ (راجستھان سیکٹر) کے راستوں سے بھی بذریعہ ریلوے تجارت پر اتفاق ہو گیا ہے نیز اسکردو۔ کرگل (کشمیر سیکٹر) راستہ کھولنے پر بھی غور کیا جا رہا ہے۔ خدا کرے کہ اسی طرح دو بھائیوں کے درمیان رشتے استوار ہوتے رہیں۔]

۲۔ دونوں ممالک کے بیچ "Most Favourable Nations" کی بنیادوں پر تجارت ہو سکے اور وہ ایک دوسرے کی مصنوعات کی کھپت کر سکیں۔

۳۔ دونوں ممالک کے سائنسی، تعلیمی، ثقافتی، حتیٰ کہ نیوکلیائی اور عسکری وفود جذبۂ خیر سگالی سے سرشار ہو کر Regularly باہمی تبادلۂ خیالات کر سکیں تا کہ ایک دوسرے کے تجربات سے وہ استفادہ حاصل کر سکیں۔ ویسے تو یکم جنوری ۲۰۰۳ء کے اعلانیہ کے مطابق دونوں ممالک ہر سال اپنے اپنے نیوکلیائی انسٹالیشن کے بارے میں ایک دوسرے کو جانکاری دے ہی رہے ہیں۔

[خدا کا شکر ہے کہ تعلیمی اور ثقافتی وفود کا آنا جانا تو شروع ہو گیا ہے۔ کاش کہ ایٹمی اور دفاعی وفود کا بھی سلسلہ شروع ہو جائے۔]

۴۔ سفر میں حائل تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں اور جو صورتِ حال ہندوستان۔ نیپال، امریکہ۔ کنیڈا اور یورپین ممالک کے بیچ ہے وہ یہاں بھی میسر آ سکے۔ یا کم از کم

(i) دونوں ممالک میں مزید Visa Offices کھل جائیں۔ جیسے

ہندوستان میں ممبئی (بمبئی)، حیدرآباد، چینئی (مدراس)، پٹنہ اور لکھنؤ اور پاکستان میں کراچی، کوئٹہ اور لاہور یا ملتان۔

(ii) اٹاری۔واگھا بارڈر کے علاوہ کم سے کم ایک بارڈر اور کھل جائے تاکہ کراچی کی مسافت بھی کم ہو سکے۔

[اللہ کا شکر ہے کہ یہ دعا قبول ہوئی اور اب آمد و رفت کے لئے ایک اور ریلوے راستہ، کھوکھراپار۔مناباوہ (راجستھان سیکٹر) کا کھل گیا ہے اور ۷ر اپریل ۲۰۰۵ء کو سری نگر۔مظفر آباد کے مابین بس سروس کو منموہن سنگھ اور سونیا گاندھی ہری جھنڈی دکھا ہی چکے ہیں۔ایک دیگر راستے، اسکردو۔کرگل (کشمیر سیکٹر) پر گفت و شنید جاری ہے۔خدا اس میں بھی جلد کامیابی عطا فرمادے۔]

(iii) دہلی۔لاہور کے بیچ کے Check Posts (اٹاری اور واگھا) ہفتہ میں دو دن کھلنے کی بجائے روزانہ کھلنے لگیں اور ''سمجھوتہ ایکسپریس'' بھی روز چلنے لگے۔ نیز دہلی۔لاہور بس سروس بھی Daily ہو جائے۔

[دہلی۔لاہور بس سروس جس تعطل کا شکار ہو گئی تھی، شکر ہے کہ وہ ۲۶ر مئی ۲۰۰۳ء سے پھر سے بحال ہو گئی ہے۔]

(iv) دہلی اور لاہور ریلوے اسٹیشنوں پر بالترتیب ہندوستانی اور پاکستانی ریلوں میں ان ممالک کے Visa Holders کے لئے مناسب Reservation Quota مقرر کر دیا جائے۔

(v) جس طرح پاسپورٹ کی میعاد دس سال ہوتی ہے اسی طرح ویزا کی میعاد بھی دس سال کر دی جائے اور اس عرصے میں جب چاہے اور جتنی بار چاہے Visa Holder سفر کر سکے۔ بے شک اس کے زیادہ سے زیادہ قیام (Stay) پر پابندی لگا دی جائے۔

{آمین ثمہ آمین}

باب ہفتم

مآخذ

نمبر شمار	نام کتاب	زبان	نام مصنف	نام مترجم
۱	۲	۳	۴	۵
۱۔	''منقبت سلطانی'' [مخطوطہ]	فارسی/اردو	علامہ عبدالحمیدؒ	مولانا خورشید علیؒ
۲۔	''کشف المحجوب''	فارسی/اردو	شیخ علی ہجویریؒ	محمد الطاف نیروی
۳۔	''اخبار الاخیار''	فارسی/اردو	شیخ عبدالحقؒ	مولانا سبحان محمود
۴۔	''خزینۃ الاصفیاء''	فارسی	مفتی غلام سرورؒ	—
۵۔	''نفحات الانس''	فارسی/اردو	شیخ عبدالرحمٰن جامیؒ	شمس بریلوی
۶۔	''اذکارِ ابرار'' [''گلزارِ ابرار'' کا اردو ترجمہ]	فارسی/اردو	محمد غوثی شطاریؒ	فضل احمد جیوری
۷۔	''سفینۃ الاولیاء''	فارسی/اردو	شہزادہ داراشکوہؒ	محمد اقبال سلیم گاہندی
۸۔	''مرآۃ الاسرار''	فارسی/اردو	شیخ عبدالرحمٰن چشتیؒ	کپتان واحد بخش سیال
۹۔	''قاموس المشاہیر''	اردو	نظام الدین حسین نظامی بدایونی	—
۱۰۔	''سیر الاولیاء''	فارسی/اردو	مولوی مبارک علوی کرمانیؒ	اعجاز الحق قدوسی
۱۱۔	''آبِ کوثر''	اردو	شیخ محمد اکرام	—
۱۲۔	''رودِ کوثر''	اردو	شیخ محمد اکرام	—
۱۳۔	''تذکرہ اولیائے پاک و ہند''	اردو	مرزا محمد اختر	—
۱۴۔	''مآثر الامراء'' (جلد اوّل)	فارسی/انگریزی	صمصام الدولہ شاہنواز خان	بیورج
	(جلد دوم و سوم)	فارسی/اردو	............ایضاً	محمد ایوب قادری
۱۵۔	''گلدستہ گلشنِ فقیری''	اردو	منشی محمد حافظ اللہ	—

۱	۲	۳	۴	۵
۱۶۔	''تاریخ فرشتہ'' (جلد اول و دوم)	فارسی/اردو	محمد قاسم ہندو فرشتہ	عبدالحیٔ خواجہ
۱۷۔	''منتخب التواریخ'' (جلد اول تا سوم)	فارسی/اردو	ملا عبدالقادر بدایونی	مولوی احتشام الدین
۱۸۔	"The Apparatus of Empire" [۱۵۷۴ء تا ۱۶۵۸ء]	انگلش	پروفیسر اطہر علی	—
۱۹۔	"The mughal Nobility Under Aurangzeb"	انگلش	پروفیسر اطہر علی	—
۲۰۔	''تحریک آزادیٔ ہند اور مسلمان''	اردو	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	—
۲۱۔	"India Wins Freedom"	انگلش	مولانا ابوالکلام آزاد	—
۲۲۔	"Guilty man of India's Partition"	انگلش	ڈاکٹر رام منوہر لوہیا	—
۲۳۔	"Understanding the Muslim Mind"	انگلش	راجموہن گاندھی	—
۲۴۔	''گوہر بحیرۂ عرب'' (کراچی)	اردو	احمد حسین صدیقی	—
۲۵۔	"Understanding Krachi"	انگلش	عارف حسین	
۲۶۔	''علم و عمل'' (جلد اول و دوم) [وقائع عبدالقادر خانی]	فارسی/اردو	مولوی عبدالقادر	مولوی معین الدین

۱	۲	۳	۴	۵
۲۷۔	''آئینِ اکبری'' (جلد اوّل و دوئم)	فارسی/اردو	علامہ ابوالفضل	مولوی محمد فدا علی طالب
۲۸۔	''ملتان کی ادبی زندگیاں''	اردو	ڈاکٹر روبینہ ترین	—
۲۹۔	''تسہیل التاریخ''	اردو	''روہیلکھنڈ لٹریری سوسائٹی''، بریلی	—
۳۰۔	''بھارت کا برہت اتیہاس'' (حصہ اوّل تا سوم)	ہندی	رمیش چندر مجمدار	—
۳۱۔	''بھارت کا اتیہاس''	ہندی	آشیروادی لال شریواستوا	—
۳۲۔	''دلّی سلطنت''	ہندی	......ایضاً......	
۳۳۔	''مغل سامراجیہ کا اتھان اور پتن''	ہندی	رام پرساد ترپاٹھی	—
۳۴۔	''بھارت میں مسلم شاسن''	ہندی	ایس۔ آر۔ شرما	—
۳۵۔	''مدھیہ کالین بھارت'' (حصہ دوم)	ہندی	ہریشچندر شرما	—
۳۶۔	''مغل کالین بھارت''	ہندی	ایل۔ پی۔ شرما	—
۳۷۔	''پراچین اور مدھیہ کالین بھارت''	ہندی	ایل۔ پرساد	—
۳۸۔	''اورنگ زیب'' (ایک نئی دِرشٹی)	ہندی	اوم پرکاش پرساد	—
۳۹۔	''مِفتاحُ التقویم''	اردو	حبیب الرحمٰن	—

احقر کی دیگر تصنیفات

جو شائع ہو چکیں

[۱] ''کہکشاں'' = ۱۹۸۱ء میں بلند شہر نمائش کے موقع پر منعقدہ مشاعرے کی رو داد نیز شریک شعراء صاحبان کے تعارف و کلام پر مبنی ہے۔

[۲] ''آبگینہ'' = ۱۹۸۲ء میں بلند شہر نمائش کے موقع پر منعقدہ مشاعرے کی رو داد نیز شریک شعراء صاحبان کے تعارف و کلام پر مبنی ہے۔ ان کے علاوہ ضلع کی مشہور و معروف اور قابلِ فخر ہستیوں کی سوانح کے ساتھ ساتھ شہنشاہِ الفاظ، شاعرِ انقلاب جناب جوشؔ ملیح آبادی؛ مسیحائے غزل، شاعرِ حُسن و نظر جناب فراقؔ گورکھپوری؛ غمخوارِ مساکین، شاعرِ مزدور جناب احسانؔ دانش اور پاکستانی قومی ترانے کے خالق، شاعرِ اسلام جناب ابوالاثر حفیظؔ جالندھری کے حالاتِ زندگی اور ان کے چیدہ چیدہ کلام بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ان سب کے علاوہ چند دیگر ایسے دلچسپ معلوماتی اور حیرت انگیز مضامین جیسے: ''جونسار بابر'' کے علاقے میں، ''رسمِ دروپدی'' (پانچ بھائیوں کی مشترک بیوی) اور ڈاک پتھر (ضلع دہرہ دون) کے قدرتی مناظر بھی شامل کئے گئے ہیں۔

[۳] ''پریتِ پُنج'' [ہندی رسم الخط] = ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۲ء میں بلند شہر نمائش کے موقعوں پر منعقدہ مشاعروں میں شامل ہوئے شعراء صاحبان کا ہندی میں تعارف، ان کے کلام پر تبصرے اور ان کے کلام (کلام کے الفاظ کو بنا بدلے محض کلام کا رسم الخط ہی دیوناگری میں کرتے ہوئے) کے علاوہ اردو شعر و شاعری کے صنفِ سخن کی تعریف معہ مناسب مثالوں پر مبنی ہے۔

[۴] ''سید عبدالرحمٰن بن فضل اللہ'' [المعروف بہ سید سلطان بہرائچیؒ] = سید سلطان بہرائچیؒ، ان کی اولاد، خلفاء، نیز دیگر متعلقہ بزرگوں کے بارے میں معہ شجرات تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مناسب رنگین فوٹوگراف اور نقشے جات بھی شامل کئے گئے ہیں۔

[۵] ''سلطان الشہداء'' [سید سالار مسعود غازیؒ] = سید سالار مسعود غازیؒ، ان کے لشکر کے شہداء نیز جن راجاؤں سے سید سالار مسعود غازیؒ کے لشکر کی معرکہ آرائیاں ہوئیں، کے بارے میں معہ شجرات تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ضروری رنگین نقشے جات اور فوٹوگراف بھی شامل کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ وہ مقامات جہاں شہداء عبدی نیند سوئے ہوئے ہیں، کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

[۶] ''چند قدم گھر سے......'' = پاکستان سے متعلق سفر نامہ جس میں انجینیرنگ نقطۂ نگاہ سے کراچی میں پانی، بجلی کی ترسیل، سیوریج کی نکاسی، ذرائع نقل وحمل وغیرہ کی سیر حاصل تفصیلات دی گئی ہیں۔ اب اس کتاب کو زیرِ نظر کتاب کی شکل میں Revise کیا گیا ہے۔

جو شائع ہونے والی ہیں

[۱] ''تذکرۂ گنج ہائے گراں مایہ'' = یہ چار جلدوں میں، کل ملا کر تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی۔ تقریباً دس سال کی مسلسل سائنٹیفکلی تحقیقات کے

بعد اس میں کم و بیش ڈھائی سو اولیاء اللہ، مشائخین نیز علمائے کرام کے بارے میں معہ زیادہ تر کے طریقتی و نسبی صحیح صحیح شجرات شامل کرتے ہوئے اُن کے حالاتِ زندگی پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تصوف، کفو، انساب اور برِ صغیر میں مسلم سلاطین کا اس میں اسلامی اندازِ فکر سے احاطہ کیا گیا ہے۔ مناسب تصاویر و نقشے جات بھی شامل کیے گئے ہیں۔ چاروں جلدیں کمپیوٹر ٹائپ کرائی جا چکی ہیں۔ تقریباً ڈھائی لاکھ روپیہ اشاعت پر صرفہ آنے کا تخمینہ لگایا گیا ہے جو سرِ دست مانع ہے۔ جلدوار تفصیلات اس طرح سے ہیں:۔

جلد اوّل: "تاریخ دومانِ عالی" = اس میں قدوۃ المشائخ حضرت شیخ حبیب اللہؒ کی شخصیت، ان کا سلسلۂ نسب اور طریقت؛ ان کی اولاد؛ سلسلۂ "چشتیہ" کے اہم صوفیاء کرام کی سوانح بمعہ ان کے نسبی شجرات؛ برِ صغیرِ ہند و پاک و بنگلہ دیش کے مسلمانوں کے بنیادی "انساب" ["عربی النسب"، "عجمی النسب" اور "ہندی النسب"] اور خانوادۂ "انصاریان" پر سیر حاصل معلومات شامل کی گئی ہیں۔

جلد دوم: "قریہ جو ایک ہے عالم میں انتخاب" = اس میں ایک ایسے موضع جس کی تعریف بانی "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ"، سر سیّد احمد خاںؒ بھی کر چکے ہیں اور جو علاقے میں "خطۂ یونان" سے تعبیر کیا جاتا ہے، کی تاریخ؛ علاقے میں پائی جانے والی خود رو جڑی بوٹیوں اور ان کے فوائد؛ اشجار، طیور اور کیڑے مکوڑوں کی تفصیلات نیز مذکورہ بستی میں آباد مختلف خاندانوں کے شجرات اور اُن کے اہم بزرگوں کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جلد سوم: "منبعِ الاسرار" = یہ پوری جلد تصوف پر مبنی ہے۔ اس میں اصطلاحاتِ تصوف، علمِ لدنی، شطحیات، مختلف سلاسل اور رجال الغیب جیسے اہم موضوعات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ اہم "صاحبِ شطحیات"، "مجذوب" اور "رجال اللہ" کی سوانح، ان کے "نسبی" و "طریقتی" شجرات شامل کئے گئے ہیں۔

جلد چہارم: "تذکرۂ جہانیاں" = اس برِ صغیر ہندو پاک و بنگلہ دیش میں گزرے مسلم سلاطین و بادشاہوں کی کارگزاریاں جو انھوں نے اسلام کے فروغ کی خاطر کیں، پر روشنی ڈالی گئی ہے نیز کون سا شاہی خاندان یا اس کا سلطان/ بادشاہ کس اولیاء اللہ کی دعا/ بددعا سے برسرِ اقتدار آیا/ اقتدار سے محروم کر دیا گیا، کی تفصیلات ایک نئے محققانہ انداز سے پیش کی گئی ہیں۔

[۲] **"درِ بے بہا"** = انبیاء کرام بمعہ شجرہ، غزوات، سرایا، اصحابِ غزوۂ بدر اور خلفائے راشدین سے متعلق ہے۔ مسودہ typing ہو رہا ہے۔

[۳] **"حبیب الانساب"** = قاضی و مفتی خاندان قصبہ بجنور، قاضی و مولوی خاندان قصبہ سیوہارہ، قاضی و مفتی خاندان قصبہ نگینہ، شیخ خاندان قصبہ نگینہ، قاضی و مولوی و دیگر منیخ خاندان قصبہ سہسپور، قاضی و مفتی خاندان قصبہ کرتپور، قریشی خاندان قصبہ منڈاور، قاضی خاندان قصبہ شیرکوٹ، صدیقی خاندان قصبہ بجنور (ضلع لکھنؤ) اور فاروقی خاندان قصبہ گوپامئو (ضلع ہردوئی) وغیرہ سے متعلق شجرات شامل کرنے کے ساتھ ساتھ متعلقہ قصبات کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مسودہ تیار ہے۔

[۴] **"گردِ سفر"** = خودنوشت ہے جس میں خاندان، عزیز و اقارب، اپنے پیشے، ملازمت اور تجربات کے حوالے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جہاں

جہاں دورانِ ملازمت تعینات رہا وہاں کے جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی نیز ٹیکنیکل پس منظر میں حقائق کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کرائے گئے اہم ٹیکنیکل کاموں کے نایاب نقشے اور فوٹوگراف بھی شامل کئے جارہے ہیں۔ ٹیکنیکل، سماجی اور تاریخی اعتبار سے انشاء اللہ اپنی نوعیت کی یہ منفرد کتاب ہوگی۔ مسودہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔

[۵] ''قائم چاند پوری'' [چند حقائق بے نقاب] = قائم کی شخصیت، ان کے حالاتِ زندگی، اردو شاعری میں ان کے مقام نیز ان کے نسبی شجرے پر بھرپور طریقے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چند حقائق تو اچھوتے اور چونکا دینے والے ہیں۔ مسودہ تکمیل کے مراحل میں ہے۔

تصحیح نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
ب	۵	+91-9808179281	+91-9528825627
۲۱	۶	دارلاسلام	دارالاسلام
۲۱	۷	منڈھاچڑھ کی	منڈھے چڑھ کی
۲۲	۲	بڑامال ہوتا ہے	بڑامال ہوتی ہے
۲۸	۲۰	کی	کہ
۴۲	۲۰	Develop	Development
۴۵	۵	(Agriculture Production Commissioner)	"Agriculture Production Commissioner"
۴۵	۱۹	غلام مصطفےٰ جنوئی	غلام مصطفےٰ جتوئی
۶۷	۴	کھنچا	کھینچا
۶۷	۵	کافی چھوئی حدتک	کافی حدتک چھوئی
۹۵	۲	لارڈلنگڈن	لارڈولنگڈن
۹۶	۱۶	ہندوستالی	ہندوستانی
۱۰۵	۸	بنسبت	بہ نسبت
۱۱۶	۱۰	معزول کرکے	معزول کردیااور
۱۱۷	۷،۸	مربہ میل	مربع میل
۱۲۲	۱۲	صالح	صالحہ
۱۲۲	۲۰	کبیراولیاء	کبیرالاولیاء
۱۲۶	۱	(غالباًروسی مفکر، ٹالسٹائے)	(غالباًبرناڈشا)
۱۲۷	۱۲	نے دیں گے	نہ دیں گے
۱۲۸	۵	ہیڈاکوارٹر	ہیڈکوارٹر
۱۳۰	۸	''اکھنیڈ بھارتی''	''اکھنیڈ بھارتی''
۱۳۰	۲۶	''اکھل بھارتیہ ودھارتی پریشد''	''اکھل بھارتیہ ودھیارتی پریشد''
۱۳۱	۱	سوامی اودھیش آنندگردی	سوامی اودھیش آنندگری
۱۳۲	۶	بی ایس سی گریجویٹ	بی ایس سی (گریجویٹ)
۱۳۳	۱۵	دشمن چندوکلاء	دشمن وکلاء
۱۳۵	۱۴	تلاش کی	تلاش کیا
۱۳۶	۴	Sy. S.P	Dy. S.P
۱۵۷	۲	کی شے پر	کی شہ پر
۱۵۹	۱۲	جواہرلال	جواہرلعل
۱۷۳	۱۵	شہاب محمدغوری	شہاب الدین محمدغوری

۱۷۵	۵	خضر خاں خاشغری	خضر خاں کاشغری
۱۷۶	۲۲	باب دادا	باپ دادا
۱۸۰	۹	جوزج	جوآج
۱۸۰	۱۴	درد قنج	درد قونج
۱۸۰	۲۲	دوم وزیر اعظم	وزیر اعظم دوم
۱۸۵	۱۸	تفصیلات ص .... پر	تفصیلات ص ۱۴۸، ۱۴۹ پر
۱۸۷	۲۰۱	چھ ہزاری دار تھا	چھ ہزاری منصب دار تھا
۱۹۱	۱۲	دائیرہ	دائرہ
۱۹۷	۱۹	عقدیت	عقیدت
۱۹۸	۶	تشہید	تشہد
۲۰۰	۳	عافت	آفت
۲۰۱	حاشیہ		ایک بہن بی بی جمال خاتون [م ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء)]
۲۱۰	۲۰	موسیٰ انجانیؒ	موسیٰ زنجانیؒ
۲۱۶	۱۶	فخر الدین حسن زنجانیؒ	فخر الدین حسین زنجانیؒ
۲۱۹	۱۲	دایرۂ اسلام	دائرۂ اسلام
۲۵۵	۱	صاھبزادے	صاحبزادے
۲۵۶	۲	ادارت	ارادت
۲۵۸	۱۷	تھلائے	فضلائے
۲۶۴	۱۱	....	پیسہ
۲۶۴	۲۰	"العروص"	"العروض"
۲۶۵	۸	اسطبل	اصطبل
۲۶۷	۱۸	باغیان پورہ،	باغبان پورہ
۲۶۸	۱۲	یہ ایک سطح زمین سے ۲ میٹر اونچے پلیٹ فارم پر	یہ سطح زمین سے ۲ میٹر اونچے ایک پلیٹ فارم پر
۲۶۸	۱۸	ٹلشل اپتھر	ٹلشلا پتھر
۲۸۷	۶	کیا ہمارے وزیر اعظم	ہمارے وزیر اعظم
۲۸۸	۱۲	اب رہا ہماری عافیت	اب رہی ہماری عافیت
۲۹۰	۱۷	پاکستالی	پاکستانی
۲۹۱	۲۱	ان سے	اس سے
۲۹۶	۱۱	Enginner	Engineer
۳۰۰	۸	نظام اولیاءؒ	نظام الدین اولیاءؒ
۳۰۲	۱۶	Expire ہو چکی ہے۔	Expire ہو چکی ہے۔"
۳۰۳	۱۹	جواہر لال	جواہر لعل
ڈسٹ کور	پشت	اسرار	اصرار
ج	[۶]	گندگی کی نکاسی کا نظام	گندے پانی کی نکاسی کا نظام

حرفِ من

برادرِ عزیز محمد سمیع الدین سلمہٗ کا اسرار ہے کہ میں زیرِ نظر کتاب کے متعلق کچھ لکھوں۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور اسی غلبۂ محبت کے سبب انھوں نے میری ذہنی صلاحیتوں کے متعلق وہ حسنِ ظن قائم کر رکھا ہے جو خوابوں کا محل تو ہو سکتا ہے حقیقت کا چہرہ ہرگز نہیں۔ اسے کیا کہا جائے کہ چھوٹوں کی شدومد کی فرمائشیں ''ارشادِ عالی'' کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ چند جملے اسی تعمیلِ ''ارشادِ عالی'' میں لکھے جا رہے ہیں۔

''سلطان الشہداء'' اور ''سید عبدالرحمٰن بن فضل اللہ'' کی غیر معمولی مقبولیت نے سمیع میاں کو حوصلہ دیا کہ وہ ''چند قدم گھر سے......'' کو بہتر پیمانے پر شائع کریں۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو جانفشانی کی ہے اور جس شوقِ طبیعت سے اس تالیف کے لئے مواد فراہم کیا ہے وہ یقیناً لائقِ تحسین ہے۔ مجھ جیسا سپاٹ آدمی جسے علم و ادب سے دور کا ہی واسطہ ہے اِس کا اہل نہیں کہ ان کی کاوشوں کا منصفانہ جائزہ لے سکے اور اس ذخیرہ پر کوئی تنقید کر سکے۔ حُسنِ ترتیب، ظاہری رعنائی کی چیز ہے۔ میں اس سے بے انتہا متاثر ہوا۔ اس تالیف کی ادبی و علمی قدر و قیمت پر صحیح اظہارِ خیال تو اہلِ بصیرت ہی کریں گے۔ ''چند قدم گھر سے......'' کے اندر فکر و نظر کا جو سرمایہ ہے وہ اپنے وزن و وقار کی بدولت پُر مسرت کیفیتوں سے مالا مال ہے۔

سمیع سلمہٗ کے ادبی شوق اور ذہنی صلاحیتوں سے میری امیدیں وابستہ ہیں۔ میں ان کے روز افزوں ادبی شغف اور جذبۂ خدمت میں اپنی تمناؤں کے حسین چہرے دیکھتا ہوں۔ ان کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ خدا کرے وہ حسین سے حسین تر کی جستجو میں حوصلہ اور استقامت کو رفیقِ راہ بنائے رہیں۔ (آمین)

شجاع الدین
حبیب باغ، علی گڑھ
۳۱ر مارچ ۲۰۰۹ء

[شجاع صاحب مصنف کے حقیقی برادرِ کلاں ہیں۔]

یعقوب نظامی کا آبائی وطن مقبوضہ کشمیر کا ایک چھوٹا سا گاؤں سلواہ ہے جو ضلع پونچھ کی تحصیل
مینڈر میں واقع ہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد ان کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آیا۔
انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں حاصل کی مڈل سکول تک گورنمنٹ سکول راہوالی
گوجرانوالہ کینٹ میں پڑھے۔ ثانوی تعلیم گورنمنٹ ہائی سکول میرپور آزاد کشمیر میں مکمل کی۔ پھر
ڈگری کالج میرپور پڑھتے رہے۔ ۱۹۸۲ء میں فلسفہ اور نفسیات کے مضامین کے ساتھ بی۔اے کی
ڈگری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کی۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں منگیتر بن کر انگلستان آئے تو پھر
یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس وقت مانچسٹر سٹی کونسل کے شعبہ ترجمہ میں ڈپٹی مینجر ہیں۔
جاوید حکیم قریشی
Rs.